پاگل

(ناول)

...کے قریب ...دا...گھر کا ...میں ...گر ...ساتھ ...

...بی سکینہ تنہا نہیں چاہتا ہے کہ اپنی یہ انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں

جملہ حقوق محفوظ

پہلا ایڈیشن جون ۱۹۵۸ء

دوسرا ایڈیشن نومبر ۱۹۶۰ء

تیسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۶

قیمت چھ روپے

مطبوعہ اشرف پریس لاہور

ناشر محمد حلیم

فون نمبر ۶۲۳۸۱

محبت ...... کی نہیں جاتی، ہوتی ہے، اور
جس کسی کے دل کو محبت اپنا نشیمن بنا لیتی ہے
تو پھر وہاں سے ڈیرا نہیں اٹھاتی۔ محبت کسی ضابطہ،
کسی اصول اور کسی نظام کی پابند نہیں ہوتی، وہ
خود ہی اپنا اصول ہے، آپ ہی اپنا ضابطہ اور
اور نظام بھی، ! محبت کی کیفیت بھی کتنی
عجیب ہوتی ہے

ایک دوست نما دشمن کے نام

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

JAF & CO.
Plot # 43/4 Q-2, Block-6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

(حسرت)

(۱)

زبیدہ

مجبوری انسان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے نہ اس کی آن باقی رہتی ہے نہ شان، زبیدہ ایک شریف باپ کی شریف لڑکی تھی لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کرے۔ چند دن کی بیماری میں اس کے ابا جان اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ماں پہلے ہی دق کی مریضہ تھی یہ صدمہ نہ سہہ سکی۔ دوسرے مہینے اس نے بھی آخری ہچکی لی اور ختم ہو گئی۔ نہ کوئی بڑی بہن تھی نہ بڑا بھائی۔ سہارا کون دیتا؟ نہ کوئی چچا تھا، نہ ماموں، پناہ کہاں لیتی؟ باپ نے نہ کوئی جائیداد چھوڑی تھی نہ دولت، اگر کوئی جائیداد تھی تو آٹھ سال کی بہن رقیہ، اگر کوئی دولت تھی تو چھ سال کا چھوٹا بھائی اسلم،

[illegible] پہلی مرتبہ زبیدہ نے سوچا اب کیا کیا جائے؟

عمر [illegible] کے قریب [illegible]

[illegible]

طرح جنازہ میں تو شرکت کر لی تھی لیکن اس کے بعد کچھ بھی نہ پوچھا کہ کیا کر رہی ہو؟ کسطرح زندگی بسر ہو رہی ہے؟ زبیدہ تو عمری کے باوجود تھی بڑی آن کی، اس نے بھی نہ کبھی سے اپنا حال زار بیان کیا نہ امداد کی طالب ہوئی۔ جب دل کستا تھا، فلاں عزیز کے ہاں جانا چاہیئے، اس سے ملنا چاہیئے، اس سے کہنا چاہیئے، تو وہ خود ہی جواب دیتی تھی، جس نے عزیز داری کا اتنا پاس نہ کیا ہو کہ کبھی بھول کر خبر ہی لے لیتا، اس کے پاس جانا، اور امداد طلب کرنا، ذلیل ہونا ہے، کیا فائدہ ہے جانے سے؟ میں نہیں جاتی، ہرگز نہیں جاؤں گی۔ اسی فکر و خیال کے درمیان رقیہ آجاتی اور کھانا مانگتی، اسلم آجاتا اور کسی چیز کی فرمائش کرتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ رقیہ اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بڑے پیار بھرے لہجے میں کہتی "آپا، تم روتی کیوں ہو؟ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی، ابھی بھوک نہیں لگی ہے مجھے" لیکن اسلم میاں ذرا زیادہ صاف گو تھے۔ وہ مروت اور محبت کے قائل نہیں تھے کسی چیز پہ مچل گئے تو جب تک ضد پوری نہ کرالی، کسی طرح قابو میں نہ آتے۔

ماں نے بڑے چاؤ سے شوہر سے چھپا چھپا کر، کچھ پونجی اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے جمع کی تھی اور اس رقم سے کچھ زیور بھی خرید لیا تھا کچھ کپڑے بنا لئے تھے۔ زبیدہ کی عمر ۱۷ سال کی ہو چکی تھی اور چاہتی تھی، جلد از جلد دلہن بن کر وہ اس گھر سے رخصت ہو جائے۔ پرانے خیال کی مشرقی عورت تھیں۔ جوان

کے جہیز میں بھلا کون کھاتا پیتا لڑکا، دولہا بننے پر تیار ہو سکتا تھا؟ دور اور نزدیک کے رشتہ داروں میں کئی لڑکے ان کی نظر میں تھے لیکن جن کی حالت ذرا اچھی تھی، وہ آنکھ بھی نہیں ملاتے تھے، جو مفلوک و مفلس تھے، ان سے بھلا کس طرح وہ اپنی چہیتی بیٹی بیاہ سکتی تھیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ زبیدہ کی عمر بڑھتے بڑھتے ۱۷ سال تک پہنچ گئی۔ مگر کسی قابل قبول گھرانے سے اس کا پیغام نہ آیا۔

خود زبیدہ کا جہاں تک تعلق تھا اس نے کبھی سنجیدگی سے اپنی شادی کے مسئلہ پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی دنیا اسکول تک محدود تھی، اس کی یہ تمنا ضرور تھی کہ، شادی کا مسئلہ اس وقت تک ٹلتا رہے جب تک وہ بی۔ اے نہ کرلے۔ کبھی کبھی نماز پڑھ کر وہ خدا سے دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ، جب تک میں گریجویٹ نہ ہو جاؤں، اماں کے پاس میرا کوئی پیغام نہ آئے۔

وہ گریجویٹ تو نہ ہو سکی، انٹرنس کا امتحان بھی ابھی نہ دے پائی تھی کہ باپ اور ماں دونوں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے رخصت ہو گئے اور اسے اکیلا چھوڑ گئے۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی اس نے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا لیکن ماں کے بعد یہ سلسلہ مجبوراً ختم کر دینا پڑا۔ اب اس کا سارا وقت گھر ہی میں صرف ہوتا تھا۔ رقیہ اور اسلم سایہ کی طرح اس کے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ کیا مجال کہ ایک لمحہ بھی تنہا چھوڑ دیں۔ وہ زیور [illegible] جو ماں نے اس کی شادی کا بھی [illegible] بنایا تھا اس وقت نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا اس کو عمر ۷ کے قریب [illegible]، دا [illegible]، گھر کا مہیں [illegible] تنہا ہی کتنا، دوسرے جو کچھ بھی [illegible] ساتھ اس [illegible]

مجھے جنجال میں ڈال گئے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر دونوں زندہ ہوتے اور میں مرجاتی۔ میرے مرنے سے کسی کا کچھ نہ بگڑتا۔ ہاں رقیہ اور اسلم کی زندگی سنور جاتی مگر آہ میں زندہ ہوں اور وہ چل بسے۔

یہ سوچتے سوچتے قدرت پر بھی جھلا اٹھتی۔ وہ دل ہی دل میں اعتراض کرتی، اگر یہ مقدر تھا کہ میرے ماں باپ مرجائیں اور چھوٹے بھائی بہن کی کفالت میں کروں، تو قدرت نے مجھے لڑکی کیوں بنایا؟ لڑکا کیوں نہ پیدا کیا؟ لڑکا ہوتی تو ہزار طرح سے اپنا اور اپنے بھائی بہن کا پیٹ پال سکتی تھی۔ مزدوری کرتی، بھیک مانگتی، سب کچھ کرلیتی، لیکن میں تو لڑکی ہوں اور غضب یہ کہ جوان بھی اور مزید بدقسمتی یہ کہ خوب صورت بھی، آخر کیا کروں کہاں جاؤں یا اللہ؟

پھر اس پر اضطرار اور الحاح کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی، وضو کرتی اور مصلے پر جا بیٹھتی اور بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر دعا کرتی، تو سب کی مصیبت میں کام آتا ہے، کیا مجھے تنہا چھوڑ دے گا؟ تو دکھیاروں کی مدد کرتا ہے، کیا میں تیری مدد سے محروم رہوں گی؟ تو مظلوموں کی فریاد سنتا ہے۔ کیا میری فریاد تجھ تک نہ پہنچ سکے گی؟ سجدے میں پڑے پڑے دیر تک اس طرح کی [illegible] بھینی کے [illegible] اب تک ان دعاؤں کا بھی کوئی نتیجہ نہیں [illegible] عمر کے فریب [illegible] گھر کا [illegible] ساتھ ساتھ اس کی روح [illegible] بی سکینہ تنہا نہیں چاہتی ہے کہ اپنی یہ انگلیاں کاٹ [illegible]

جس دن آخری چوڑی بکی، اس دن وہ بڑی دیر تک روتی رہی یہ نو روپے اس کی آخری پونجی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دس دن چلیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا مجھے بھیک مانگنا پڑے گی؟ کیا مجھے ملازمت کرنا پڑے گی؟ کیا مجھے دوسروں کے ہاں آیا کی حیثیت سے رہنا پڑے گا؟ کیا میں غیروں کے گھر برتن مانجھوں گی۔ اور کپڑے دھوؤں گی اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی کیا میں خوش رہ سکوں گی؟ کیا رقیہ اور اسلم کو خوش رکھ سکوں گی؟

زبیدہ کے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا، میری زندگی خراب گئی میں مٹ گئی، تباہ ہو گئی لیکن دنیا کی ریت یہی ہے کہ کوئی مٹتا ہے، کوئی بنتا ہے کوئی بگڑتا ہے کوئی سنورتا ہے۔ کسی کو موت عطا ہوتی ہے، کسی کو زندگی مرحمت کی جاتی ہے، مان لیا، میں مٹ گئی لیکن کیا میرے مٹنے سے رقیہ کی زندگی نہیں سنور سکتی؟ مان لیا میں مر گئی۔ لیکن کیا میری موت سے اسلم کی زندگی نہیں بن سکتی؟ اگر یہ بھی نہ ہو سکا تو پھر میرے مرنے اور مٹنے سے کیا حاصل ہوا۔ میں اپنی قربانی دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ رقیہ اور اسلم کی زندگی سنور جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں ہوں کیا؟ جو ایثار کر کے ان ننھے اور معصوم بچوں کو سنبھالوں گی؟ اب میری حیثیت ایک بے سہارا اور خستہ حال لڑکی کی ہے، میں خود فاقہ مست ہوں کسی اور کا پیٹ کیا بھر سکوں گی؟ میں خود مفلوک الحال ہوں، کسی اور کے کیا کام آسکوں گی؟

یہ سوچتے سوچتے وہ جھلا جاتی، ...

دعا مانگنے کے بعد ہمیشہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا، لیکن آج ابتک قائم تھا
کیونکہ اب صرف پانچ روپے باقی رہ گئے تھے اور اس چھوٹی سی پونجی کو لامعلوم
مدت تک اس وقت، جب تک قدرت چھپر پھاڑ کر کوئی خزانہ مرحمت
نہ کر دے، چلانا تھا، اتنے میں نہ جانے کہاں سے حضرت اسلم خراماں خراماں
تشریف لائے اور آتے ہی بہن کی گود میں بیٹھ گئے اور گود میں بیٹھتے ہی موٹر
کی فرمائش کر دی۔ اس موٹر کا ذکر خیر وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکے تھے
اس کی قیمت تین روپے تھی۔ اور زبیدہ ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھی کہ تین
روپے کی رقم صاحبزادہ کی ضد میں قربان کر دے اور جس وقت کے تصو
سے دل دھڑک رہا تھا اسے اپنی حماقت سے قریب تر لے آئے۔ پہلے
تو اس نے سمجھایا، دلاسا دیا، وعدے کئے، لیکن جب صاحبزادے کسی طرح
راہ راست پر نہ آئے تو ایک چانٹا جڑ دیا۔ یہ پہلا چانٹا تھا جو زندگی میں اسلم
کو نصیب ہوا تھا ۔ یہ پہلا تھپڑ تھا جو زبیدہ نے اسلم کے لگایا تھا اس خلا
توقع طرزِ عمل سے اس کے روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ زبیدہ خود بھی رو
لگی۔ پھر نہ جانے کیا سوچا، تیزی سے اٹھی، صندوقچہ کھولا۔ اور تین روپے
لاکر اسلم میاں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ روپے دیکھتے ہی سیل اشک رک گ
باہر گئے اور موٹر لے کر آ گئے۔ زبیدہ نے انہیں گود میں لے کر خوب پیار ک

(۲)

نیا مہمان

روتے روتے زبیدہ کی آنکھیں سوج گئیں۔ اسلم بے خبر سو رہا تھا وہ پٹائی کا حادثہ فراموش کر چکا تھا لیکن زبیدہ کی آنکھوں سے اب تک آنسو بہہ رہے تھے، وہ اس سوتے ہوئے بچے کو بار بار پیار کرتی تھی، اور ھھدنے لگتی تھی، آج اسے بے طرح اپنی ماں یاد آرہی تھی، باپ یاد آرہا تھا۔ یہ دونوں اسلم کو کتنا پیار کرتے تھے، کیسی محبت سے اس کی شرارتوں کا نظارہ کیا کرتے تھے؛ کس ذوق و شوق سے، پریشانی اور آشفتہ روزگاری کے باوجود اسکی نت نئی اور قیمتی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے؛ اس کا سارا وقت گود میں گزرتا تھا، باپ کی گود سے اترا، ماں کی آغوش میں جا بیٹھا۔ وہاں سے چا، بھیاجی کے دامن میں آرہا جا۔ کبھی کسی نے اسے پھول کی چھڑی سے عمر ۷ کے قریب ڈانٹا، دانا، جھڑکا نہیں گیا، کوئی بات رد نہیں کی گئی۔ رہ کے وارا بی سکینہ تنہا نہیں چاہتا ہے کہ اپنی یہ انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں

جو اس کے پھول سے گال پر طمانچہ بن کر پڑیں، ہائے کس حسرت اور تعجب سے اس نے میری طرف دیکھا تھا اور پھر مجھی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں، اس معصوم کی، زبیدہ پھر اٹھی اور اسلم کے پاس لیٹ کر اسے بے تحاشا پیار کرنے لگی۔

رقیہ نہایت خاموشی سے زبیدہ کی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی کہ آج آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا بڑی سنجیدگی سے بولی "اے بی، کچھ پاگل ہو گئی ہو آج تم؟ آخر اسلم کو پیار کیوں کئے جا رہی ہو؟"

زبیدہ کو رقیہ کے اس معصوم سے سوال پر ہنسی آگئی، اس نے کہا۔ "ہاں کر رہی ہوں پھر؟ تو کیوں جلی جا رہی ہے؟"

رقیہ نے منہ بنا کر ذرا بگڑتے ہوئے کہا "اب ہم سے کبھی بات نہ کرنا" یہ کہہ کر وہ لیٹ رہی۔ زبیدہ لپک کر اس کے پاس پہنچی، اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا "خفا ہو گئیں رقیہ بیگم ہم سے؟"

رقیہ نے اس کی طرف سے کروٹ کئے کئے جواب دیا "ہاں اب ہم کبھی تم سے بات نہیں کریں گے۔ بس اسلم کے لئے موٹر منگاؤ، اسی کو پیار کرو خوب جی بھر کے!"

زبیدہ نے پیار کرتے ہوئے کہا "اچھا اب خوش بھی ہو [illegible] تمہیں بھی تو پیار کر رہے ہیں ہم۔"

رقیہ نے کروٹ بدلی، شوخ [illegible]

پھر طنز بھرے لہجہ میں کہا "لیکن پیار کرنے سے کیا گڑیا بھی آجائے گی ہمارے پاس؟"

زبیدہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ اس نے رقیہ کو خوب خوب گدگدایا یہاں تک کہ وہ ہنسنے لگی۔ پھر زبیدہ بولی "اچھا بھائی، تمہاری گڑیا بھی خدا نے چاہا تو آجائے گی۔"

رقیہ نے کہا "بس تو پھر جب ہی بات کرنا۔"

ذرا سی دیر میں رقیہ کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے لیکن زبیدہ کی آنکھوں میں نیند کا پتہ نہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صبح اٹھتے ہی رقیہ کی گڑیا منگانی ہے۔ ڈیڑھ روپیہ اس کارِ خیر پر صرف ہو جائے گا، پھر کیا بچے گا۔ آٹھ آنے .... اور جب یہ آٹھ آنے بھی ختم ہو چکیں گے تب؟

وہ اسی سوچ میں لیٹی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ زبیدہ دروازے پر پہنچی، دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، اتنے نا وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ ذرا بلند آواز سے پوچھا "کون ہے؟"

جواب ملا "بیٹیا جلدی سے دروازہ کھول دے۔ سانس پھولا جا رہا ہے میرا، میں ہوں سکینہ!"

زبیدہ نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ بی سکینہ اندر تشریف لائیں، بوڑھی ہو چکی تھیں، لیکن نقش و نگار کہہ رہے تھے کہ کسی زمانے میں یہ کھنڈر بڑا شاندار۔ عمر ۷۰ کے قریب، دانت غائب، کمر جھکی ہوئی، بال سن سفید لیکن آواز رانکے دار۔ بی سکینہ تنہا نہیں آئی تھیں اپنے ساتھ بستر بھی لائی تھیں۔ ایک

پھٹی ہوئی دری، ایک پرانی رضائی، گودڑ کا ایک مجموعہ تکیہ کی صورت میں بٹوے کی ڈوری گلے میں بندھی ہوئی، اس میں چھالیہ تمباکو، کتھا، چونا، سب کچھ حسب ضرورت موجود تھا۔ ہاتھ میں ایک لوٹا، اگرچہ پرانا اور میلا تھا لیکن وہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

یہ بی سکینہ دراصل زبیدہ کی دودھ پلائی تھیں۔ زبیدہ جب پیدا ہوئی تھی تو حالات اچھے تھے، چونکہ اس کی اماں جان کمزور تھیں اس لئے باقاعدہ تنخواہ پر ملازم رکھی گئی اور اس نے ماں کی طرح محبت کا ثبوت دیا۔ بہت دن یہاں رہی، پھر اس کا لڑکا دلارے آکر لے گیا، کیونکہ اس نے شادی کی تھی اور نئی نویلی دلہن کی خدمت اور گھر کی رکھوالی کیلئے ایک خادمہ کی ضرورت تھی۔ چونکہ مزدوری میں اتنا بچتا نہیں تھا کہ ملازمہ رکھی جا سکے۔ لہذا نگاہ انتخاب سکینہ پر پڑی اور وہ آکر انہیں لے گیا اور وہ بھی بڑی خوشی سے چلی گئیں۔ بیچاری کی کتنی حسرت تھی کہ اپنے گھر میں رہیں، دوسرے سعادت مند لڑکوں کو جب ماں کی فرمانبرداری اور خدمت کرتے دیکھتی تھیں تو دل ہی دل میں لرز جاتی تھیں اور ہزاروں کوسنے دلارے کی نالائقی پر دے ڈالتی تھیں لیکن خدا نے جب اس کے دل میں نیکی ڈالی اور وہ ماں کو لینے آیا تو فخر و مسرت سے اس کا سر اونچا ہو گیا، زبیدہ نے بہت بہت روکا لیکن بیٹے کی محبت زبیدہ پر غالب آگئی۔ اس کے روکے بھی نہ رک سکیں، جاتے وقت روئیں ضرور لیکن چلی گئیں، بیچاری بڑی امید اور خوشی سے گئیں تھیں لیکن بہو نے تھوڑے ہی دنوں میں دماغ درست کر دیا۔ خود اچھا کھاتی، انہیں خراب کھلاتی، خود دن

بھر چارپائی پر پڑی انیڈتی رہتی، یہ مشین کی طرح سارا کام کرتیں، برتن دھوتیں آگ جلاتیں، جھاڑو دیتیں، کھانا پکاتیں، ساری ذمہ داریاں انہیں کے دوش ناتواں پر تھیں، پھر نفی بدمزاج اور بدزبان بھی بہت تھی، شوہر کے سامنے کم اور شوہر کے پیچھے زیادہ وہ وہ صلواتیں سناتی کہ بی سکینہ حق دق اسکا منہ تکا کرتیں، وہ چاہتی تھیں، بہو انہیں اماں کہہ کر پکارا کرے، لیکن یہ اس کی توہین تھی۔ وہ ہمیشہ "بڑھیا" کے نام سے انہیں یاد کرتی تھی۔ بے شک وہ بڑھیا تھیں، لیکن سوچتی تھیں کہ آخر ہر وقت اس حقیقت کو یاد دلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بھی تحقیر آمیز الفاظ میں، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سکینہ بہو اور بیٹے سے خفا ہو کر زبیدہ کے ہاں چلی آتیں اور کئی کئی دن رہتیں اور اعلان کر دیتیں کہ اب کبھی وہاں نہ جاؤں گی۔ زبیدہ اس اعلان پر بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتی۔ اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام کر دیتی، لیکن چند ہی روز میں نفی ولا ہے کی بیوی، اپنی خادمہ کی ضرورت محسوس کرتی، کھانا پکانا۔ جھاڑو دینا، برتن دھونا، ایسا کھڑاگ تھا جسے مستقل طور پر وہ کر ہی نہیں سکتی تھی لہٰذا مجبور ہو کر شوہر کو بھیجتی، وہ آتا اور باتیں بنا کر بیچاری کو لے جاتا، وہ بھی ماما سے ایسی مجبور تھیں کہ بہت انکار کے بعد آخر راضی ہو جاتیں اور چلی جاتیں، زبیدہ چھیڑتی، دیکھو لو! جا تو رہی ہو مگر پھر آؤ گی! وہ کچھ جواب نہ دیتیں، مسکراتی ہوئی رخصت ہو جاتیں۔

لیکن آج کا آنا دوسری طرح کا تھا، آج کے آنے سے خلاف معمول زبیدہ خوش نہیں ہوئی، پریشان ہو گئی کوئی اور وقت ہوتا تو بڑی خندہ پیشانی سے

ان کا استقبال کرتی، بڑے شوق سے مہمان رکھتی۔ خاطر داری کرتی، حلوے سے انہیں بڑا شوق تھا۔ کوفتوں کی بھی بڑی قدر دان تھیں۔ خوب حلوا پکاتی، کوفتے تیار کرتی اور اتنا کھلاتی کہ بدہضمی ہو جاتی۔ لیکن اب روکھی روٹی کھلانے سے بھی مجبور تھی، صرف دو روپے پاس تھے جن میں سے ڈیڑھ کی صبح کو گڑیا آجائے گی، آٹھ آنے میں کیا ننگی نہائے گی کیا نچوڑے گی؟

لیکن موقع بداخلاقی کا نہیں تھا، دل پر جو گذر رہی تھی، گذر رہی بھی زبان سے بڑی شیریں انداز میں بولی "بوا کہاں بھول پڑیں تم آج اتنے ناوقت؟"

سکینہ نے زبیدہ کا سہارا لے کر کمرہ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی، بس، بھر پایا، شفاعت رسول کی قسم اب مرتے مرتے مر جاؤں گی لیکن نہ دلارے کا منہ دیکھوں گی نہ ننھی کی صورت پر تھوکوں گی، دیکھو بیٹی میرے مرے پیچھے، اگر دونوں میں کوئی آئے تو آنے نہ دینا۔ اگر دلارے نے مجھے مٹی دی اور کفن دفن میں حصہ لیا تو قیامت میں تمہارا دامن پکڑ لوں گی۔ جوتے لگوا کر نکلوا دینا اسے یہاں سے، اور وہ موا خدائی خوار آنے بھی کیوں لگا!"

زبیدہ نے تسلی اور دلدہی کے لہجہ میں کہا، بوا، بڑی جلدی خفا ہو جاتی ہو، کوئی اکلوتے بیٹے سے اس طرح خفا ہوتا ہے، بری بات۔"

سکینہ رونے لگیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں، دوپٹہ سے ناک پونچھتے ہوئے کہا، جھاڑو پھرے ایسے اکلوتے بیٹے پر، کل کا مرتا آج مر جائے کمبخت، پڑیں موئے کی قبر میں!"

زبیدہ نے سکینہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بوا ایسا نہ کہو، خدا بے چارے

کو زندہ رکھے۔ تمہارا ایک ہی تو لڑکا ہے!

سکینہ نے جلال کے عالم میں کہا۔ ہاں ایک ہی لڑکا ہے، مگر اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی، اس کا کارنامہ دیکھنا چاہتی ہو؟ " دیکھو گی؟ دیکھ سکو گی؟"

زبیدہ نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا "کیوں کیا ہوا؟ کیا کیا اس نے؟"

سکینہ نے کرتا اٹھا کر اپنی پیٹھ دکھائی، مار کے نشانات صاف ظاہر تھے، یہ دیکھ کر زبیدہ لرز گئی "ہائے میرے اللہ کیا تمہارے دلارے نے تمہیں مارا؟"

وہ رونے لگیں اور روتے روتے بولیں۔ "ہاں بیٹی، میرے اکلوتے بیٹے نے مجھے مارا ہے، میری بہو نے مجھ بڑھیا کے جھونٹے پکڑ گھسیٹے۔ اور وہ میرا اکیلا بیٹا جو ہے نا جس کی تم ابھی طرف داری کر رہی تھیں اس نے مجھے خوب خوب پیٹا...... پوچھو کس خطا پر؟

زبیدہ بولی "خطا کا کیا سوال؟ ماں سے بھی کوئی خطا ہو سکتی ہے؟ ماں پر بھی ہاتھ اٹھایا جا سکتا ہے؟ ماں کے بھی جھونٹے پکڑ کر گھسیٹے جا سکتے ہیں؟ توبہ توبہ، آسمان نہیں ٹوٹ پڑتا، زمین بھی نہیں پھٹ جاتی؟"

سکینہ زبیدہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔ "بیٹی خدا تجھے ہمیشہ سکھی رکھے اس گھر میں۔ مجھ سے کیسی کیسی غلطیاں ہوئیں، کیسے کیسے نقصان ہوئے کیسی کیسی چیزیں بگڑیں، کیسے کیسے برتن ٹوٹے؟ مگر مجال ہے کبھی شیخ صاحب (زبیدہ کے باپ) نے منہ سے اف کی ہو، یا خدا بخشے تمہاری ماں نے کچھ کہا ہو؟ لیکن یہ میرے پیٹ سے پیدا ہونے والا دلارا ہے، اس نے

چائے کی ایک پیالی ٹوٹ جانے پر مجھے مارا۔" یہ کہتے کہتے وہ پھر پھوٹ پڑیں اور چہکوں پھکوں رونے لگیں۔

زبیدہ نے انہیں گلے سے لگا لیا اور دل دہی کرتے ہوئے کہا۔

" بوا، بہت اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں بھی اکیلی اس گھر میں بہت گھبراتی تھی۔ یہ رقیہ اور اسلم ذرا بھی مجھے چین نہیں لینے دیتے، اب تم ان شیطانوں سے بھگتنا خوب...... لیکن اگر کہیں پھر دلاسے آگیا تو؟

.... پھر تم پھسل جاؤ گی، اور دوپٹہ اوڑھ کر چل دو گی۔

مغلانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہیں بیٹی" اب یہ نہیں ہو سکتا" اب تو یہاں سے مجھے موت ہی لے جائے گی۔ دلاسے نہیں لے جا سکتا۔ ہاں تو خود نکال دے تو دوسری بات ہے۔"

زبیدہ بگڑ گئی۔ اس نے کہا۔ تم میرے بارے میں اتنی بری رائے رکھتی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں ماں کی طرح چاہتی ہوں۔ یہ کہتے کہتے زبیدہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن جلد ہی وہ اپنی کیفیت پر غالب آگئی۔ سکینہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دعا دینے لگی۔ اس کے بعد ایک گوشہ میں سکینہ نے اپنا بستر جمایا اور نماز پڑھ کر سوز و ساز کے ساتھ مناجات شروع کر دی۔

مری بار کیوں دیر اتنی کری

اور زبیدہ ان میٹھے بولوں کو سنتے سنتے ہمیشہ کی طرح سو گئی ۔ ۔ ۔ ۔

بے خبر اور مدہوش نیند!

---

(۳)

غریب کا دل

سکینہ بوا حسبِ معمول منہ اندھیرے اٹھیں اور گھر کا سارا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جھاڑو دی، برتن دھوئے، آگ سلگائی، چائے چولہے پر رکھی۔ رقیہ اور اسلم اٹھ چکے تھے، ان دونوں کا منہ اپنی نگرانی میں دھلوایا پھر جلدی جلدی تین چار پراٹھے تیار کئے۔ ایک رقیہ کو دیا۔ ایک اسلم کو ایک زبیدہ کے لئے رکھ دیا۔ ایک سے خود اپنی تواضع کی۔ زبیدہ رات کو بہت دیر سے سوئی تھی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی سکینہ بوا نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیا ہے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو وہ بھی ان لوگوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ سکینہ نے گرم گرم چائے کی پیالی اور گھی سے تر بتر پراٹھا، اس کی طرف بڑھا دیا، اور فرمایا، "بیٹی صبح دیر سے اٹھنا منحوس ہوتا ہے۔ تو تو نماز کی بڑی پابند تھی۔ پھر اب کیوں دن چڑھے اٹھنے لگی ہے۔"

زبیدہ نے پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ بس آج ہی دیر سے اٹھی ہوں، امّاں تو بڑے سویرے اٹھنے کی عادی ہوں۔ میں خود اس وقت سب ناشتہ واشتہ تیار کر لیا کرتی تھی، بات یہ ہے کہ رات نیند دیر میں آئی۔

سکینہ بوا نے فکرمند لہجے میں دریافت کیا "کیوں میری بچی، نیند دیر میں کیوں آئی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" زبیدہ نے جواب دیا "ہاں، اچھی ہوں کوئی بات نہیں، ذرا یونہی خیالات کچھ پریشان آتے رہے۔"

اسلم صاحب کے ایک ہاتھ میں ان کی نئی نویلی موٹر تھی اور دوسرے میں پراٹھے کا نوالہ، زبیدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا "یہ موٹر تمہیں پسند ہے؟" انہوں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اس تبسم میں نہ جانے کیا تھا کہ زبیدہ کے دل کا مرجھایا ہوا کنول کھل گیا۔ اس نے کہا، اپنے بھیا کو اور بھی بہت سی چیزیں لا کر دوں گی" رقیہ بیچ میں بول پڑی اور ہمیں؟ اور وہ گڑیا جس کا تم نے رات وعدہ کیا تھا۔ زبیدہ نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ ہاں، سودخوار صاحب یاد ہے، یہ لیجئے۔ ڈیڑھ روپیہ، جائیے آپ بھی اپنی گڑیا لے آئیے رقیہ ناشتہ ختم کر چکی تھی۔ جلدی جلدی اٹھی اور بھاگی بھاگی گڑیا لینے چلی گئی۔

سکینہ بوا، بڑے چاؤ سے زبیدہ اور اسلم و رقیہ کی یہ باتیں سن رہی تھیں جب رقیہ چلی گئی تو انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور زبیدہ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا "بہن ہو تو ایسی ہو۔ ماں بھی اس سے زیادہ

کیا کہے گی جو تو اپنے بھائی بہن کے ساتھ کر رہی ہے ۔ آج شیخ صاحب اور بی بی جی کی روح تیرا یہ سبھاؤ دیکھ کر کتنی خوش ہو رہی ہو گی " زبیدہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا ۔ خاموش رہی، پھر ذرا دیر بعد اس نے کہا ۔ بوا ہمارا ایک کام کرو گی ؟" سکینہ نے بڑی آمادگی کے ساتھ کہا " اے میں قربان بیٹی، تیرے لئے تو آسمان کے تارے توڑ لاؤں گی ۔ بتاؤ، کیا کام ہے

زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔

" آؤ میرے ساتھ بتاتی ہوں ابھی ۔"

سکینہ بوا گھٹنوں پر زور دے کر کانکھتی ہوئی اٹھیں ، زبیدہ انہیں اپنے کمرہ میں لے گئی ۔ بکس کھولا ، کچھ مار چے نکالے ، یہ سب وہ کپڑے تھے جو مرحومہ ماں نے اس کی شادی کے لئے خریدے تھے ۔ زبیدہ نے وہ کپڑے سکینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا " جاؤ انہیں بیچ آؤ جا کر !"

سکینہ بوا یہ سن کر حیران نظروں سے دیکھنے لگیں .... یہ کپڑے بیچ آؤں ؟"

زبیدہ :۔ ہاں بوا، جلدی کرو ۔

سکینہ :۔ تو جانتی ہے ، یہ کیسے کپڑے ہیں ؟ کس لئے خریدے گئے تھے ؟ میرے ہاتھوں تو ان کا سودا ہوا تھا !"

زبیدہ :۔ ہاں بوا، خوب جانتی ہوں ، لیکن یہ کام تمہیں کرنا ہو گا ۔

سکینہ :۔ واہ تیرے سہاگ کے کپڑے بیچ آؤں جا کر ؟ ایسی بدشگونی نہیں ہو سکتی مجھ سے ،

زبیدہ :۔ شگون لے کر بیٹھو گی تو فاقے کرنا پڑیں گے۔

سکینہ :۔ کرلوں گی فاقے۔

زبیدہ :۔ میں بھی کرلوں گی، لیکن رقیہ اور اسلم؟ کیا یہ بھی فاقے کریں گے؟ کیا مجھے یا تمہیں یہ گوارہ ہو سکتا ہے کہ یہ معصوم اور ناسمجھ بچے فاقہ کریں؟

سکینہ :۔ نہیں جب تک میں زندہ ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھیک مانگوں گی لیکن ان بچوں کو بھوکا نہیں رہنے دوں گی کسی طرح۔

زبیدہ :۔ خدا نہ کرے ہم بھیک کھائیں۔ لو اضد نہ کرو، کہنا مانو۔ بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ جانتی ہو میرے پاس اب کل کتنی پونجی رہ گئی ہے .... صرف آٹھ آنے۔

سکینہ :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اچھا بیٹی جو تو کہتی ہے ۔ وہی کروں گی۔

زبیدہ :۔ تو بس، نیک کام میں دیر نہیں کرتے اٹھو جاؤ۔

سکینہ :۔ بیٹی یہ اچھے خاصے قیمتی کپڑے ہیں، انہیں اونے پونے تو ہرگز نہیں بیچوں گی۔ ذرا مجھے موقع دے، دو چار جگہ جاؤں گی، بات چیت کروں گی۔ جہاں سے اچھے دام ملیں گے، وہاں سودا کرلوں گی۔ یہ مال مجھے اچھی طرح یاد ہے آٹھ سو کا ہے۔ کم از کم کہیں پانچ تو ملیں گے، جلدی میں کام بگڑ جائے گا۔ سو پچاس میں انہیں کیسے پھینک آؤں؟

زبیدہ :۔ بات تو ٹھیک کہتی ہو، لیکن پھر کام کیسے چلے گا؟ اٹھنی کب تک ساتھ دے گی۔

سکینہ :۔ کچھ زیور بھی تو تھا؟ پہلے اسے بیچو۔ سونے چاندی کے دام فوراً مل

جائیں گے۔

زبیدہ:۔ اب تک وہی تو چلتا رہا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔

سکینہ:۔ (روتے ہوئے) ہائے، میں یہ کیا سن رہی ہوں، میری بچی تو اس طرح زندگی کے دن تیر کر رہی ہے؟

زبیدہ:۔ (آہ سرد بھر کر) اور کیا کرتی بوا۔

سکینہ:۔ کسی عزیز نے سر پہ ہاتھ نہیں رکھا؟ کسی نے خبر نہیں لی، کسی نے مدد نہیں کی۔

زبیدہ:۔ نہیں۔

سکینہ:۔ مدد نہ کرتے قرضہ تو ادا کرتے، وہ بھی ادا نہیں کیا۔

زبیدہ:۔ قرضہ کیسا؟ میں تو نہیں جانتی کچھ!

سکینہ:۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں میں کون ہے جو شیخ صاحب یا بی بی جی کا دس پانچ روپے سے شرمندہ نہیں؟

زبیدہ:۔ ہوگا میں تو نہیں جانتی۔

سکینہ:۔ تم نہ جانو، میں تو جانتی ہوں، آج ہی جاؤں گی تقاضے کو۔

زبیدہ:۔ نہیں، ایسا نہ کرو۔ مفت میں بیٹھے بٹھائے ایک نیا جھگڑا کھڑا کرنے سے کیا فائدہ؟

سکینہ:۔ واہ یہ بھی اچھی رہی۔ اپنا روپیہ مانگیں تو جھگڑا اٹھ کھڑا ہوگا۔ بلا سے اٹھ کھڑا ہو، کچھ بھیک تو نہیں مانگتے۔ خیرات تو نہیں مانگتے جو روپیہ دیا تھا وہ مانگتے ہیں۔

زبیدہ :۔ وہ نہیں دیں گے۔ ان کی نیت دینے کی ہوتی تو خود دے
لیکن انہوں نے تو بات ہی نہ پوچھی۔
سکینہ :۔ دیکھنا کیسی خبر لیتی ہوں جا کر، حلق میں انگلی ڈال کر اگلوا لوں گی میں
بی سکینہ ہے۔
زبیدہ :۔ خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو، وہ لوگ تمہارے منتظر تو نہ
بیٹھے ہیں کہ تم گئیں اور انہوں نے روپیہ گن دیا۔ کوئی انکار کرے گا کو
وعدہ کرے گا۔ کوئی ٹال مٹول سے کام لے گا۔
سکینہ :۔ میں سب کو ٹھیک کر لوں گی دیکھ لینا۔
زبیدہ :۔ اچھا تو اطمینان سے ٹھیک کرتی رہنا اس وقت تو کام چلنے کی
طرح سب نہیں۔ تو ایک ہی آدھ کپڑا اور لے پونے بیچ آؤ جا کر۔
سکینہ :۔ بیٹی، دھیرج رکھ۔ سب بیچ کر آؤں گی، لیکن چھتری تلے د
تو لینے دے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
زبیدہ :۔ تو پھر آخر گھر کیسے چلے گا۔ بتا رہی ہوں صرف آٹھ آنے میں ہیں
پاس، اللہ اللہ خیر صلا۔
سکینہ نے بٹوا کھولا۔ اس میں سے ایک مڑا ہوا کاغذ نکالا اسے کھولا
اس میں دس دس کے چھ نوٹ تھے۔ یہ رقم زبیدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی
"لو بیٹی، فی الحال اس رقم سے کام چلاؤ۔ پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک
جائے گا۔"
زبیدہ کا ہاتھ ان روپوں کی طرف نہیں بڑھا، اس نے کہا۔

بوا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، عمر بھر میں مر مر کر جو پونجی تم نے جمع کی ہے
سے میں ہتھیا لوں، خدا نہ کرے، !

سکینہ کو رونا آگیا۔ اس نے کہا "بیٹی، تو نے میرا دودھ پیا ہے تجھے
ں نے گود میں کھلایا ہے، رات رات بھر تیرے لئے جاگی ہوں، کیا
ں اتنی غیر ہوں کہ تو میرے روپے بھی نہیں لے سکتی؟ میری بیٹی ہوتی
ر وہ چھین لیتی مجھ سے، اور میں خوشی خوشی چھنوا لیتی، کیا تو دوسرے الفاظ
ں یہ نہیں کہہ رہی کہ تو میری بیٹی نہیں ہے؟

زبیدہ نے محبت بھری نظروں سے سکینہ بوا کو دیکھا، ایسی بات نہیں
ے، میں تمہیں اتنا ہی چاہتی ہوں۔ جتنا کوئی بیٹی اپنی ماں کو چاہ سکتی ہے۔
ن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں۔

سکینہ نے بات بیچ سے کاٹ لی۔ بس رہنے دو بیٹی، مجھے معنی نہ
بھاؤ۔ سب مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، یہ تو سوچو، یہ روپے میں نے جمع کہاں
ے کئے ہیں؟ جوانی پیٹا ودلا رہے، کبھی اس نے پھوٹی کوڑی بھی تو نہیں
ں مجھے۔ یہ جو کچھ ہے اسی گھر سے ملا ہے، یا تمہارے باپ نے دیا ہے
ں نے .... یہ میرے روپے نہیں۔ تمہارے ہیں۔ تمہارے
ں باپ کے ہیں۔"

زبیدہ ہنسنے لگی، "بوا، کچھ ہی کہو۔ میں تو نہیں لینے کی۔"

سکینہ نے روپے اس کی گود میں ڈال دیئے اور کہا "میری بچی،
ر جب خدا حالات ٹھیک کر دے تو ساٹھ کے سو دے دینا میں لے

لوں گی۔ اور پھر یہ بھی تو سوچ اب میرا مرنا جینا سب تیرے ساتھ ہے کفن دفن بھی تو کرنا پڑے گا۔ یہ امانت جس دن مروں، اس دن صرف کر دیجیو۔ میرے اوپر........ بیٹی! اب اگر تو نے انکار کیا تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا!

زبیدہ انکار نہ کر سکی، اس نے روپے رکھ لئے۔

(۱۴)

مزے مزے کی باتیں

سکینہ بوا کے آنے سے زبیدہ کو بڑا سکون ہو گیا۔ یہ اکیلا گھر اسے کاٹے کھاتا تھا۔ سارے کام وہی کرتی تھی۔ کوئی ایسا نہ تھا جس سے دو گھڑی ہنس بول لیتی، جس کے سامنے دل کی بھڑاس نکال لیتی، جس کی سنتی اور اپنی کہتی۔ اب سکینہ نے یہ کمی پوری کر دی۔ زبیدہ سنے یا نہ سنے۔ وہ آپ بیتی اور جگ بیتی سنایا کرتی تھیں۔ رقیہ اور اسلم کے کھانے پینے، پڑھنے لکھنے، سونے جاگنے کے تمام امور کی وہ رضاکارانہ طور پر انچارج بن گئی تھیں۔ زبیدہ کو بھی انہوں نے تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا تھا۔ کھانا پکانا، جھاڑو دینا، یہ سب فرائض اب زبیدہ سے سکینہ کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔

زندگی کا قافلہ خاموشی، یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ رواں دواں تھا۔ سکینہ کی امانت زبیدہ نے خرچ کر ڈالی تھی، اس کی شادی کے کپڑے

بھی نہ جانے کہاں وہ اچھے داموں بیچ آئی تھی۔ ان روپوں سے اس نے اپنے سکینہ کے، اسلم اور رقیہ کے کئی کئی جوڑے بنا لئے تھے۔ دو مہینے کا کھانے کا سامان اکٹھا کر لیا تھا، جاڑوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سب کی جڑاول بھی بن گئی تھی۔ عید میں اب چند روز رہ گئے تھے۔ اس سلسلہ کی تمام ضرورتیں مہیا ہو گئی تھیں۔ اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی زبیدہ کے پاس تقریباً سو روپے کی رقم موجود تھی۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ البتہ کبھی کبھی یہ خیال دل میں ضرور کھٹک پیدا کر دیتا تھا کہ جب یہ روپے بھی ختم ہو جائیں گے تب کیا ہو گا؟ لیکن خدا کے مسبب الاسباب ہونے پر زبیدہ کا اعتقاد اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ پھر جلد ہی اس خام خیال کو دل سے نکال دیتی تھی۔ اور دل ہی دل میں مطمئن ہو جاتی تھی کہ جس خدا نے یہ ناؤ اب تک سلامت رکھی ہے وہ اسے ساحل مراد تک بھی خیر و خوبی کے ساتھ پہنچا دے گا۔

رات کا وقت تھا، بچے سو چکے تھے، زبیدہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور سکینہ باآواز بلند مناجات میں مصروف تھیں۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے وظیفہ شروع کیا۔ زبیدہ پر اور بچوں پر پھونکا، پھر گھر کا حصار کر کے دستک دی۔ اس طرح اپنے آپ کو اور گھر کو ہر خطرہ سے محفوظ کر کے بستر پر جا کر دراز ہو گئیں۔ بستر پر لیٹنے کے بعد انہوں نے زبیدہ کو جھاڑ بتائی "بیٹی اتنی رات آگئی اور تم اب تک کتاب پڑھے جا رہی ہو۔"

زبیدہ نے کتاب کے ورق پر نظر جمائے جمائے جواب دیا۔

"ہاں، بڑی دلچسپ کتاب ہے۔"

بڑے اشتیاق آمیز لہجہ میں بُوا نے دریافت کیا،

"خدا، رسول کا، اور حضرت غوث اعظم کا ذکر ہوگا اس میں؟"

زبیدہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا، اس نے سکینہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا

"نہیں، یہ تو ایک ناول ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

یہ کیا کہا ناول ہے؟...... یہ تو ناول پڑھ رہی ہے؟"

زبیدہ کے ہونٹوں پر تبسم اب بھی کھیل رہا تھا۔ کتاب کی دلچسپی میں غرق تھی۔ اس نے مطالعہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ہاں بُوا،...... بڑی عمدہ، بڑی دلچسپ۔"

وہ زبیدہ کی اس صاف گوئی سے کچھ خوش نہ ہوئیں، انہوں نے معترضانہ لہجہ میں ذرا تلخی کے ساتھ کہا۔

"عشق عاشقی کا قصہ ہوگا۔ اس میں، کیوں بیٹی۔"

زبیدہ، سکینہ کے اس پیہم سوالوں سے اکتا چکی تھی۔ پھر بھی اس نے اخلاق سے کام لیا اور جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بُوا، بڑی دلچسپ کہانی ہے، سچی محبت کی داستان ہے۔"

سکینہ کو اس داستان پر یقین نہ آیا کہنے لگیں۔

"سچی محبت،...... بھلا سچی محبت ہر کوئی کر سکتا ہے

زبیدہ:۔ لیکن اس کتاب میں تو جس لڑکی کا ذکر ہے اس نے تو کی تھی۔

. . . . اپنی جان تک دے دی ۔

سکینہ :۔ سچ ؟ . . . . مر گئی بے چاری ؟"

زبیدہ :۔ ہاں بوا، مجھے تو رونا آگیا پڑھتے پڑھتے !"

سکینہ :۔ بیٹی، تو نے کہانی پڑھی ہے رونا آگیا تجھے، میں نے تو تجھ سے صرف ذکر سنا ہے، مگر جیسے میرا کلیجہ کوئی مسلے دے رہا ہے!

زبیدہ :۔ محبت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی ۔

سکینہ :۔ ہاں بشرطیکہ محبت ہو،

زبیدہ :۔ یہ تو ٹھیک ہے . . . . . . کیوں ؟ تم نے بھی کی تھی کسی سے محبت ؟

سکینہ :۔ (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) محبت کون نہیں کرتا ؟

زبیدہ :۔ تو ضرور کی ہے، اچھا بتاؤ وہ کون تھا جسے تم چاہتی تھیں؟

سکینہ :۔ واہ ری لڑکی کچھ دیوانی ہوئی ہے ۔ میں کیوں چاہتی کسی کو؟ جسے غرض تھی، وہی چاہتا تھا، گھنٹوں ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا میرے سامنے، !

زبیدہ :۔ وہ دلارے کا باپ تو نہ ہوگا کوئی اور ہوگا ؟

سکینہ :۔ ہاں، اور کیا، یہ بات تو نہ جانے گی اور کون جانے گا ؟ . . . ذرا بتا تو سہی میرے یاروں کے نام ؟ میں بھی تو سنوں کون کون تھے ؟

زبیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) لو! تم تو خفا ہو گئیں ۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی ۔

سکینہ :۔ اے چل ہٹ، بڑی آئی بوا کہنے والی، خبردار جو آج سے مجھے بوا کہا ہوگا۔

زبیدہ :۔ تو پھر کیا کہوں ؟

سکینہ :۔ ہرجائی کہا کرو، نہ جانے کس کس سے یارانہ کر چکی ہوں،

زبیدہ :۔ واہ ہماری بوا تو بڑی اچھی ہیں ۔ اتنی پاک کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھنا فخر سمجھیں ۔

سکینہ :۔ کیوں ری لڑکی اب تو مجھ بوڑھی کا مذاق اڑائے گی ؟

زبیدہ :۔ بات کیا ہے جواب تم بات بات پر خفا ہو رہی ہو ؟......
ضرور رقیہ اور اسلم نے ستایا ہوگا، بڑے شریر ہو گئے ہیں یہ دونوں دیکھنا، صبح اٹھ کر کیسا ٹھیک بناتی ہوں انہیں، !"

سکینہ :۔ ہاں اور کیا، اپنا غصہ ان معصوموں پہ اتارو ...... ان بیچاروں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

زبیدہ :۔ خفا کیوں ہو ؟

سکینہ :۔ یہ اپنے دل سے پوچھو .... کس مزے میں کہہ دیا۔ وہ دلارے کا باپ نہیں ہوگا۔ کوئی اور ہوگا، تم کیا جانو، وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا ؟ ذرا مجھے اداس دیکھتا تھا تو بے قرار ہو جاتا تھا۔

زبیدہ :۔ اور ایک یہ دلارے ہے، ایک بات بھی تو اس نے اپنے باپ کی نہیں لی، کسی دن یہاں آیا تو ایسا جھاڑوں گی کہ زندگی بھر یاد کریگا شیطان کہیں کا ۔ ہماری بوا کو پریشان کر رکھا ہے ۔

بڑی دیر تک زبیدہ خوشامدانہ باتیں کرتی رہی تب کہیں جا کر وہ خوش ہوئیں، ورنہ بری طرح روٹھ چکی تھیں، بوا نے سونے کے لئے کروٹ بدلی زبیدہ نے پھر کتاب کھولی اور مکالمہ میں محو ہو گئی ۔

(۵)

نیا راستہ

وہ تھوڑا سا سکون جو سکینہ لوئی کے روپوں اور شادی کے کپڑے
بیچنے سے زبیدہ کو ملا تھا، وہ تین چار مہینہ کے بعد پھر اضطراب اور
پریشانی سے بدل گیا۔ آمدنی کا ذریعہ تھا نہیں اور خرچ برابر ہو رہا تھا...
.... اچھی خاصی پونجی ہوتی وہ بھی ختم ہو جاتی کہ
تنے تھوڑے سے روپے، اب صرف دس پندرہ روپے باقی رہ گئے تھے
ور جیسے جیسے یہ خرچ ہو رہے تھے زبیدہ کی جان پر بنتی جا رہی تھی بار
ر ذہن میں یہ سوال آ رہا تھا۔

جس دن یہ روپے بھی ختم ہو گئے، تب کیا ہو گا؟

"تب کیا ہو گا؟" یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا اور اس کا کوئی جواب زبیدہ
کے پاس نہیں تھا۔

زبیدہ اس فکر میں بیٹھی تھی کہ رقیہ ایک اخبار سے کھیلتی نظر آئی۔

زبیدہ نے اخبار اس سے چھین لیا اور بولی۔

"سے مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ اخبار مت غارت کیا کرو، مگر تمہیں تو ضد ہے میری بات سے!

رقیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکرانے لگی اور اپنی گڑیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بشغل بے کاری کے طور پر زبیدہ اخبار الٹنے پلٹنے لگی۔ ایک صفحہ پر جا کر اس کی نظر ٹھٹکی۔ وہ بڑی سنجیدگی اور توجہ سے پڑھنے لگی۔

یہ ایک اشتہار تھا۔

"بھارت فلمز" کے مالک سیٹھ صاحب کو ایسی لڑکیوں کی ضرورت تھی۔ جو خوبصورت ہوں۔ گانا جانتی ہوں۔ آواز دلکش ہو، نقش و نگار نظر فریب ہوں۔ تنخواہ معقول دی جائے گی، اداکاری کی تربیت دی جائیگی شروع میں معمولی کام دیا جائے گا، جیسے جیسے ہنر آتا جائے گا، تنخواہ اور درجہ میں ترقی ہوتی جائے گی۔"

یہ اشتہار پڑھ کر زبیدہ کے دل میں ایک نیا خیال آیا۔

"کیوں نہ میں فلم کمپنی میں ملازمت کر لوں؟"

پھر سوچنے لگی!۔

دنیا کیا کہے گی؟ عزیز کیا خیال کریں گے۔ برادری والے کس نظر سے دیکھیں گے؟

خود ہی اس کے دل نے جواب دیا۔ "دنیا نے اب تک کیا بنایا ہے جو آگے چل کر بگاڑے گی؟ عزیزوں نے اب تک کونسی خبر لی ہے جو آئندہ

سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں گے ؟ برادری نے اب تک کس نازک موقع پر ساتھ دیا ہے، جو آئندہ نہ دے گی ...... اگر سکینہ نے اپنی پونجی میرے حوالے نہ کر دی ہوتی، اگر وہ کپڑے جو اماں مرحومہ نے میری شادی کے لئے بڑے چاؤ سے خریدے تھے، میں نے نہ بیچ دیئے ہوتے تو اسلم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا ہوتا۔ رقیہ نے بھوک سے جان دے دی ہوتی، میں کسی گھر میں خادمہ کی حیثیت سے ملازمت کر رہی ہوتی۔ جب ہمارا کسی نے ساتھ نہیں دیا، ہمارے ساتھ کسی نے ہمدردی نہیں کی۔ ہمارا دکھ کسی نے نہیں بٹایا، ہماری مصیبت میں کوئی کام نہیں آیا تو ہم کسی کی کیوں پروا...... کریں ؟......

دنیا برا سمجھے گی، سمجھا کرے، عزیز بائیکاٹ کر دیں گے، کر دیں برادری والے منہ نہیں دیکھیں گے نہ دیکھیں، عزیزوں، برادری والوں اور دنیا والوں کے ڈر سے میں تو یہ برداشت نہیں سکتی کہ اپنے ننھے منھے بھائی بہن کو موت کے گھاٹ اتار دوں ...... میں ضرور فلم کمپنی میں ملازمت کروں گی !

لیکن کیا میں قبول کر لی جاؤنگی ؟ کیا مجھے ملازمت مل جائے گی؟ ایک سے ایک بڑھکر طرحدار، حسین، جمیل اور مہ جبیں لڑکیاں ملازمت کی امیدوار بن کر آئیں گی، بھلا مجھے کون پوچھے گا؟ میں ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکوں گی؟.... ویسے میری صورت کچھ ایسی بُری تو نہیں، آواز بھی اچھی خاصی ہے۔ گانا بھی تھوڑا بہت آتا ہے۔ اسکول کے جلسوں میں، اکثر مجھے گانے پر مجبور

کیا جاتا تھا، رہی اداکاری تو وہ سیکھنے سے آ ہی جائے گی، آخر دوسرے اداکار بھی تو پہلے پہل میری ہی طرح انجان اور ناواقف تھے، لیکن آج انکا طوطی بول رہا ہے۔ آج بازار میں ان کا سکہ چل رہا ہے، جس فلم میں وہ آجاتے ہیں، لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں، ممکن ہے، کسی دن میں بھی اسی مرتبے اور درجے پر پہنچ جاؤں، .... سیکھنے سے کیا نہیں آسکتا؟

لیکن سنتی ہوں، ..... فلمی دنیا کا ماحول بہت خراب ہوتا ہے، وہاں جو جاتا ہے بگڑ جاتا ہے، مرد آوارہ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی آبرو لٹا بیٹھتی ہیں۔ کیا مجھے بھی یہ کرنا ہوگا؟ کیا میں بھی اپنے مرحوم ماں باپ کے نام پر بٹہ لگانے پر مجبور ہو جاؤں گی؟ کیا مجھے بھی بے آبروئی اور بے عصمتی پر مجبور ہو جانا پڑے گا؟ اگر ایسا ہوا تو؟

کیا میں اس کے لئے تیار ہو سکوں گی۔ کیا مجھے اس کے لئے تیار رہو جانا چاہیئے؟"

لیکن میں کیا سوچ رہی ہوں؟ سب برے نہیں ہوتے۔ اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے لوگ ملتے ہیں۔ خود آدمی پر منحصر ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا؟ اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا بری؟ میں اگر یہ طے کر لوں کہ شریفانہ زندگی بسر کروں گی، شریف رہ کر اداکاری کا پیشہ اختیار کروں گی تو دنیا کی کوئی طاقت .... مجھے عفت سے محروم نہیں کر سکتی، اور اگر میں خود ہوس سے مجبور ہو کر یا حالات کے سامنے سپر افگندہ ہو کر یا ضروریات سے مجبور ہو کر گمراہی کی زندگی بسر کرنے لگوں تو مجھے شریفانہ

زندگی بسر کرنے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اختیار میں ہے کہ کیا بننا چاہتی ہوں، کس طرح کی زندگی اپنے لئے پسند کرتی ہوں؟ جو لڑکیاں اور عورتیں بد اور بدراہ ہوتی ہیں۔ انہیں ستر ہزار پردوں میں رکھا جائے تو بھی وہ اپنی آبرو گنوا کر رہیں گی، اسی طرح جو لڑکیاں اور عورتیں پاک دامن اور نیک چلن ہوتی ہیں، وہ کسی ماحول میں بھی رہیں انہیں کوئی خراب نہیں کر سکتا وہ کسی ترغیب سے متاثر نہیں ہو سکتیں، انہیں کسی تہدید سے مرعوب نہیں کیا جا سکتا، نہ انہیں خریدا جا سکتا ہے، نہ مجبور کیا جا سکتا ہے، مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے، مجھے یقین ہے، میں کبھی اور کسی قیمت پر غلط اور خراب راستہ نہیں اختیار کر سکتی،

پھر بسم اللہ کروں؟ چلی جاؤں؟

زبیدہ نے پھر اشتہار پڑھا، اس میں کل کی تاریخ انٹرویو کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس نے سوچا، گویا اگر مجھے جانا ہے تو کل گیارہ بجے اپنی درخواست لے کر "بھارت فلمز" کے دفتر میں پہنچ جانا چاہیئے....

... میں جاؤں گی، یہ میرا فیصلہ ہے!

لیکن یہ فیصلہ کر چکنے کے باوجود اس کا دل ڈول رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرتی تھی، بار بار وہ اپنے اقدام کے اثرات اور نتائج پر غور کرتی تھی۔ ہر مرتبہ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے فیصلے پر اور زیادہ مستحکم ہو جاتی تھی۔

وہ اس فکر میں بیٹھی تھی کہ سکینہ آ گئی۔ اس نے جو زبیدہ کو اداس

اور مضمحل دیکھا تو پوچھا۔

"بیٹی کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ بولی

"کچھ نہیں، یہ سوچ رہی ہوں، بس اب دس پندرہ روپے اور رہ گئے ہیں۔ یہ خرچ ہو گئے تو کیا ہو گا؟ پھر یہ گاڑی کیسے چلے گی؟ تمہاری امانت بھی ختم ہو گئی، اور کپڑے بیچ کر جو روپے تم لائی تھیں وہ بھی قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔

سکینہ اس کے پاس بیٹھ گئی، اور بڑے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں بیٹی، میں خود بھی کئی دن سے یہی سوچ رہی ہوں۔ تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ خود کوئی بندوبست نہیں کر سکتی۔۔۔۔ واقعی دو چار دن کے بعد بڑی مشکل پیش آئے گی، میرے کان میں چاندی کی دو بالیاں پڑی ہیں، سوچتی ہوں، انہیں بیچ آؤں جا کر، بلکہ کل سنار کو دکھایا بھی تھا لیکن کم بخت نے صرف چار روپے لگائے۔ بیٹی سوچو تو پندرہ روپے کا مال چار روپے میں کس طرح دیدوں؟

زبیدہ نے جواب دیا "کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا کہ بالیاں بیچ آؤ۔ تمہاری محبت اور ہمدردی کا میں دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں، لیکن ڈاکو نہیں ہوں کہ تمہیں لوٹ لوں، تمہارے وہی ساٹھ روپے میرے دل پر رکھے ہیں، سوچتی ہوں جس طرح بنے۔ پہلے انہیں ادا کر دوں۔"

سکینہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زبیدہ بیٹی، انہی باتوں سے روح جل کر کباب ہو جاتی ہے میری!
.... غضب خدا کا، اتنی غیرت ...... ؟ وہ ساٹھ روپے تمہارے دل
پر رکھے ہیں؟ میں بھی کتنی بے غیرت ہوں کہ ایسی باتیں سننے کے لئے زندہ
ہوں، موت بھی نہیں آتی کہ مر جاؤں، تو کسی طرح پاپ کٹے۔

زبیدہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا

"اچھا بوا! ایک بات تو بتاؤ، اگر میں کہیں نوکری کر لوں؟"

بوا کو ہنسی آ گئی اس انہونی بات پر، فرمایا،

"تو نوکری کرے گی؟"

"اور وہ پھر ہنسنے لگیں!"

زبیدہ نے کہا۔

"ہاں تو کیا ہوا؟"

سکینہ:۔ کون سی نوکری کرے گی ہماری بنو......؟"

زبیدہ:۔ اس سے کیا ہوتا ہے، کوئی سی بھی نوکری کر لوں گی۔ کام کروں گی
تنخواہ وصول کروں گی۔

سکینہ:۔ وہ تو میں سمجھی لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ نوکری ملے گی کہاں؟ کونسی
ایسی پڑھی لکھی ہو کہ نوکری ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جائے گی تمہارے
سامنے؟"

زبیدہ:۔ (اخبار پڑھتے ہوئے) دیکھ لو، اس میں نکلا ہے

سکینہ:۔ بیٹی، میں پڑھنا کیا جاؤں کیا نکلا ہے، تمہیں بتاؤ۔

زبیدہ :- چند لڑکیوں کے لئے اشتہار نکلا ہے۔ تنخواہ معقول ملے گی۔

سکینہ :- لیکن کام ؟

زبیدہ :- کام بہت معمولی ہے۔

سکینہ :- بچوں کے پڑھانے کا کام ہوگا ؟

زبیدہ :- پڑھانے کا، یا پڑھنے لکھنے کا۔ اس سے بحث نہیں۔ کام ہے اور اس کی پوری پوری اجرت ملے گی۔

سکینہ :- تو کر لو پھر۔

زبیدہ :- تم اجازت دیتی ہو ؟

سکینہ :- ہاں بیٹی! میرے نزدیک کچھ حرج نہیں۔ باقی تمہارے کنبہ والے بُرا مانیں یا بُرا بھلا کہیں تو ان کا منہ میں نہیں بند کر سکتی۔

زبیدہ :- ان کی باتیں نہ کرو، وہ ہمارے اب تک کون سے کام آئے ہیں جو خفا ہو کر کچھ نقصان پہنچائیں گے ؟

سکینہ :- یہ بھی ٹھیک ہے بیٹی...... لیکن ایک بات ضرور کہوں گی۔

زبیدہ :- کہو میں سن رہی ہوں ۔

سکینہ :- تم ٹھہری لڑکی ذات .....

زبیدہ :- (تیوری پر بل ڈال کر) .... ؟ پھر ؟

سکینہ :- لوگوں نے اگر انگلیاں اٹھائیں ؟

زبیدہ :- اٹھایا کریں ۔

سکینہ :- کنبہ والوں نے اگر ملنا جلنا چھوڑ دیا، پھر کیا ہوگا ؟

زبیدہ :- ہم خود ہی ان سے ملنا جلنا پہلے سے چھوڑے ہوئے ہیں جب سے اماں مری ہیں، کوئی کنبہ والا بھولے سے ادھر جھانکا بھی نہیں...... یہی ناکہ کنبہ والے ملنا چھوڑ دیں گے ؟

سکینہ :- لیکن بیٹی، رہنا سہنا تو انہیں ہیں ہے۔

زبیدہ :- اس سے کیا ہوتا ہے ؟

سکینہ :- تو سمجھتی ہی نہیں کس طرح ؟

زبیدہ :- آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو ؟

سکینہ :- میرا مطلب یہ ہے کہ تو ٹھہری لڑکی ذات، آخر شادی کنبہ اور برادری ہی میں ہوگی۔ انہیں خفا کر دیا تو پھر کون پوچھے گا ؟

زبیدہ :- (آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر) خدا،

سکینہ :- ہاں وہ بڑا کارساز ہے۔

تو بس اسی پر بھروسہ رکھو....... کنبے والوں سے ڈرنا چھوڑ دو۔ تم انہیں نہیں جانتیں، میں جانتی ہوں، اماں اسی حسرت میں مر گئیں کہ کوئی کنبہ والا ان کی لڑکی کا پیغام دے، اور وہ فوراً قبول کر لیں۔ لیکن سارے کنبہ میں کوئی ایسا بے وقوف نہیں ملا۔ جو ایک غریب لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہوتا جو بغیر جہیز کی دلہن اپنے ساتھ لے جاتا۔ جس کنبہ نے اماں کی زندگی میں ان کی لڑکی کو نہ پوچھا۔ اس سے تم اب تک مایوس نہیں ہوئیں ؟

اس بات کا سکینہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجبوراً چپ ہو جانا پڑا۔

(۶)
حاتم سیٹھ

"بھارت فلمز" کے مالک حاتم سیٹھ خود جتنے بڑے تھے قسمت اتنی ہی اچھی لے کر آئے تھے، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ ہو، ریس کے شوقین، شراب کے رسیا، دولت کے پجاری، مزاج کے چڑچڑے، لیکن نہایت زمانہ ساز، ضرورت ہو تو معمولی آدمی کے قدموں پر سر رکھ دیں، اور نہ ہو تو بڑے سے بڑے آدمی کو دھتکار دیں، ان کے دوست بدلتے رہتے تھے!! بدلتے رہتے تھے، دشمنوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی تھی، انہیں روپے پر ناز تھا، اور واقعہ بھی ہے کہ اس روپے سے وہ دوستوں کو بھی خرید لیتے تھے، اور دشمنوں کو بھی، کنجوس تھے، کوئی بھکاری ایڑیاں رگڑ رہا ہو، مگر کیا مجال جو حاتم سیٹھ کا دل پسیج جائے اور وہ اس کی جھولی میں ایک پیسہ بھی ڈال دیں، لیکن جس مرتبہ کے کنجوس تھے اسی مرتبہ کے لکھ لٹ بھی تھے، کسی حاکم، کسی افسر یا با اقتدار لیڈر کی طرف سے

کوئی مطالبہ ہو، تو سادہ چیک پر دستخط کر کے دے دیتے تھے، ملازموں کو تنخواہ ٹھیک وقت پر دیتے تھے، لیکن تنخواہ دیتے وقت ایک ایک منٹ کا حساب کرتے تھے۔ اور منٹوں کی غیر حاضری کے حساب سے جتنے گھنٹے بنتے تھے، ان کی تنخواہ کاٹ لیتے تھے۔ بڑے بامروت تھے۔ لیکن لین دین کے معاملہ میں ان سے بڑھ کر بے مروت کوئی نہ تھا، تبسم ہر وقت ہونٹوں پر کھیلتا رہتا تھا لیکن ان کے آرٹ کا کمال یہ تھا کہ یہی تبسم پھول بھی تھا اور کانٹا بھی، شبنم بھی اور شعلہ بھی، فصاد کا نشتر بھی اور جلاد کا خنجر بھی زبان کی مٹھاس کا یہ عالم کہ پیار کرتے جاتے تھے اور چھری چلاتے جاتے ہیں، مقتول ہلاک ہو جاتا ہے لیکن کیا مجال جو آخری سانس تک ان سے بدگمان ہو جائے۔

کبھی آج تک گھر کے کسی ملازم کو نہیں ڈانٹا، لیکن اگر دو پیسے کا بھی نقصان ہو گیا تو تنخواہ سے کاٹ لیا، انعام بھی خوب دیتے تھے اور جرمانہ بھی خوب کرتے تھے۔ باورچی نے کسی دعوت میں کھانا مزیدار پکایا سب کے سامنے دس روپے انعام کے دے دیئے۔ کسی دعوت کے موقعہ پر فرنی میں شکر ذرا زیادہ ہو گئی جرمانہ کر کے پندرہ روپے کی رسید، پیشگی لکھالی۔ حالت یہ تھی کہ ملازم انعام کا نام سن کر کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے۔ جانتے تھے انعام مع جرمانہ کے واپس کرنا پڑیگا۔

لوگ آپس میں سوال کرتے تھے۔ سیٹھ صاحب کی یہ دولت قارون کس کے کام آئے گی؟ ہاتھ کیا ہے پارس پتھر ہے جس چیز میں ہاتھ لگا دیں سونا ہو جائے

نہ جانے کتنی دیوالیہ کمپنیوں کو اپنے انتظام میں لے کر آسمان پر پہنچا دیا جو ایکٹر اور ایکٹریس مارکیٹ سے باہر ہو چکے تھے۔ سیٹھ کی کمپنی میں آ کر پھر سے زندہ ہو گئے ایسے چمکے کہ بڑے بڑے فنکاروں کو رشک آنے لگا۔

دوسری فلم کمپنیوں کے لوگ بڑے بڑے اداکاروں سے منہ مانگے داموں پر کنٹریکٹ کرتے تھے، اگر فلم میں کوئی محبوب اور مشہور اسٹار نہ ہو تو پبلک رخ بھی نہ کرے گی۔ سارا روپیہ مارا جائے گا لیکن سیٹھ صاحب کو اس پر ناز تھا کہ ہم چھوٹے اسٹاروں کو بڑا اسٹار بنا دیتے ہیں اور واقعی ان میں یہ کمال تھا کہ ایکسٹرا کے مجمع نا پرساں میں جس لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا وہ پہلی ہی فلم میں ہیروئن بن کر ایسی ابھری کہ دوسری ایکٹریسیں حیرت سے منہ تکنے لگیں، لوگ ہیرو اور ہیروئن سے پچاس پچاس ہزار اور لاکھ لاکھ روپے کا کنٹریکٹ کرتے تھے پھر بھی ان کے شتر غمزے اٹھاتے اٹھاتے عاجز آجاتے تھے، آج ہیرو کے سر میں درد ہے، سارا عملہ بے کار بیٹھا ہے۔ آج نصیب دشمناں ہیروئن کو زکام ہو گیا ہے، لہذا ساری تیاریاں بے کار، اگر سختی کریں وہ کنٹریکٹ پھاڑ کر منہ پر ماردیں۔ حاتم سیٹھ کے ہاتھ اس کا سوال ہی نہیں تھا، ہیرو اسے بنایا جسے پچاس کی نوکری ملنا بھی مشکل تھی دو سو روپے ماہوار پر رکھ لیا۔ ٹریننگ سے ایسا سدھایا کہ جب چاہا شاہجہان کا باوقار کردار دے دیا، جب چاہا پھٹے کپڑوں میں مجنوں بنا کر کھڑا کر دیا۔ ہیروئن کا منصب اسے بخشا جو ایکسٹرا گرل کی حیثیت سے نہ جانے کب سے جوتیاں چٹخا رہی تھی۔ کسی نے بے وقوف بنایا، کسی نے لوٹا...... کسی

سودا کیا، مگر پانچ روپے روز کا اوسط بھی نہ پڑا۔ سیٹھ صاحب نے پانسو ماہوار پر ہیروئن بنا کر تربیت دی اور ایسی صقیل کی کہ آئینہ بن گئی۔ دوسری کمپنیوں کے ہیرو اور ہیروئن، مالکوں کو انگلیوں پر نچاتے تھے۔ لیکن حاتم سیٹھ کے بنائے ہوئے ہیرو اور ہیروئن، ان کے پیچھے پیچھے اس طرح چلتے تھے جیسے آدمی کے ساتھ سایہ، دوسری کمپنیوں کے ہیرو اور ہیروئن مہینہ میں پندرہ دن یونہی جھوٹ موٹ بیمار پڑا کرتے تھے۔ حاتم سیٹھ کے بنائے ہوئے ہیرو اور ہیروئن کی یہ کیفیت تھی کہ ۱۰۳ ڈگری کا بخار ہو تو بھی سیٹ پر موجود۔

غرض حاتم سیٹھ نے اپنی محنت اور قوت بازو سے ایک نئی دنیا بسائی تھی، اور یہ دنیا کم از کم ان کے لئے تو جنت تھی۔ وہ کونسی نعمت تھی جو حاصل نہ تھی؛ وہ کونسی خوشی تھی، جس سے وہ محروم تھے؛ جو چاہتے تھے ہوتا تھا، جو چاہتے تھے کرتے تھے جدھر سے نکل جاتے لوگ رشک سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن آج شہر کے چند چوٹی کے دولت مندوں میں سے ایک ہے جس سے خوش ہو جائے، اس کی زندگی سنور جائے، جس سے بگڑ جائے وہ کہیں کا نہ رہے .... لیکن اس دبدبہ اور طنطنہ کے باوجود سیٹھ صاحب اگر کسی سے دبتے اور جھکتے تھے تو وہ زہرہ تھی!

---

(۷)
فلم کمپنی کا دروازہ

حاتم سیٹھ اپنے کمرہ میں حسب معمول خوب صورت، طرح دار، اور مہ جبیں ایکٹرسوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے بیٹھے تھے، کہ نہایت سادہ لباس میں ایک حسین وجمیل لڑکی دراتی ہوئی اندر آگئی، نہ ہونٹوں پہ سرخی، نہ ماتھے پہ بندی، نہ آنکھوں میں لگاوٹ، نہ باتوں میں شوخی، نہ عشوہ نہ ادا، سیٹھ صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا، اور پوچھا "کس سے ملنا چاہتی ہو؟"

وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولی۔ "حاتم سیٹھ سے ملنا تھا مجھے!"

حاتم سیٹھ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "میں ہوں حاتم۔ کیوں کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ گویا ہوئی "میرا نام زبیدہ ہے۔ میری عمر ۱۷، ۱۸ سال کے لگ بھگ ہے گانا جانتی ہوں، ناچ سیکھ لوں گی۔ صورت جیسی کچھ ہے، آپ کے سامنے ہے، کیا آپ مجھے اپنی کمپنی میں نوکر رکھ لیں گے؟"

زندگی میں پہلی مرتبہ حاتم سیٹھ یہ انوکھی اور عجیب سی باتیں سن کر چونک

پڑے، ان کے پاس ہر روز نہ جانے کتنے خوبصورت نوجوان اور طرحدار لڑکیاں، ملازمت کی درخواست لے کر آیا کرتی تھیں، اور وہ دو چار باتیں کر کے رخصت کر دیا کرتے تھے لیکن اس لڑکی کے تیور کچھ ایسے تھے کہ سٹ پٹا گئے، ان کی قوت فیصلہ عاجز ہو گئی - سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں - آخر فرمایا "کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ -"

وہ بیٹھ گئی - سیٹھ صاحب نے کہا - "یہ ایک نئی دنیا ہے - اس کے طور طریقے بھی نئے ہیں، یہاں کی ہر بات نئی ہے، کیا تم اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکو گی؟"

زبیدہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، کیوں نہیں تجربہ کر لیجئے اگر ہم آہنگ ہو سکوں تو رکھئے ورنہ چلتا کر دیجئے!"

یہ جواب بھی انوکھا تھا لیکن سیٹھ صاحب کو اب اس لڑکی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی - انہوں نے پوچھا "تم نے اس سے پہلے کسی فلم کمپنی میں کام کیا ہے؟"

وہ بولی "نہیں!"

سیٹھ صاحب نے اعتراض کیا "پھر کیسے چل سکو گی ہماری کمپنی میں؟"

زبیدہ نے جواب دیا، کوئی شخص بھی ماں کے پیٹ سے کام سیکھ کر پیدا نہیں ہوتا - یہ میری بہنیں جو آپ کے سامنے بیٹھی ہیں کبھی میری طرح انجان، الھڑ اور فن سے ناواقف ہوں گی - لیکن آج آسمان فلم پر ماہ بن کر چمک رہی ہیں - میری حیثیت آج کچھ نہیں، لیکن کیا معلوم مستقبل میرا انتظار کر

رہا ہو۔ اور میں سب سے بڑھ جاؤں ۔"

سیٹھ صاحب مسکرائے "تم میں خود اعتمادی بہت زیادہ ہے!

زبیدہ نے جواب دیا، "انسان میں اگر خود اعتمادی نہ ہو اسے زندہ رہنے کا حق کیا ہے؟"

زبیدہ کی ہر بات سیٹھ صاحب کے لئے عجیب تھی، وہ کہنے لگے لیکن خود اعتمادی کا طلسم جتنی جلدی یہاں ٹوٹتا ہے کہیں نہیں ٹوٹتا،

سیٹھ صاحب اب لاجواب ہو چکے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تمہیں کیا کام دیں؟

وہ بولی، "سوچا ہیں، یہ تو میں نہیں کہتی کہ مجھے ہیروئن بنا لیجئے کوئی معمولی سا کام دے کر دیکھئے، شاید نا اہل نہ ثابت ہوں۔ موقع دیجئے پھر دیکھئے اس سے فائدہ اٹھاتی ہوں یا نہیں؟

سیٹھ صاحب نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا "تمہیں موقع ضرور ملے گا لیکن تنخواہ؟"

وہ بے پروائی اور استغنا کی شان سے گویا ہوئی "تنخواہ کے بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہیں، آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔"

حاتم سیٹھ نے فرمایا "لیکن زبیدہ، ایک بات سوچ لو۔ ہمارے ہاں تنخواہ نہیں ملتی ۔"

زبیدہ نے کہا "تو مت دیجئے، مجھ میں اگر کوئی جوہر ہو گا تو کچھ

عرصہ بعد آپ خود تنخواہ بڑھانے پر مجبور ہو جائیں گے !"

سیٹھ صاحب کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا "نہیں بھائی، جب بھی نہیں ۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، بہت اچھا، تو اجازت دیجئے ۔ نادم ہوں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا ۔"

یہ کہہ کر زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ سیٹھ صاحب کے منہ سے بیساختہ نکل گیا، تم تو روٹھ گئیں، کہیں اس طرح ملازمت کی جاتی ہے ؟ بیٹھو بیٹھو، سنو تو !

وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی، کہنے لگی ۔" جی فرمائیے ۔ روٹھنے کا مجھے کیا حق ہے ؟

سیٹھ صاحب نے فرمایا، تمہاری گفتگو کا عجیب وغریب انداز ہمیں پسند آیا، ہم دو سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں دے سکتے اگر منظور ہو تو رہ جاؤ،

زبیدہ نے فیصلہ کن لہجہ سے کہا ۔ اگر پچاس کہتے تو بھی میں انکار نہ کرتی ۔

حاتم کو اپنی بے وقت سخاوت پر بڑی کوفت ہوئی ۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ دو سو روپے کی پیشکش کر کے بڑی حماقت کی ۔ واقعی پچاس کہنا چاہیئے تھے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا ۔ پوچھا پچاس میں گزارہ کس طرح ہوتا ؟"

وہ بولی "گذارہ تو پچیس روپے میں بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے آپ نے بڑی معمولی حیثیت سے زندگی شروع کی تھی۔ آج کروڑ پتی ہیں۔ اچھ اگر میں پچاس روپے ماہوار سے زندگی شروع کروں، تو کیا یہ توقع نہیں کر سکتی کہ کبھی دس ہزار مہینہ میں کمانے لگوں گی؟"

سیٹھ صاحب نے ہار مان لی "مس زبیدہ، آپ کی باتیں بڑی دلچسپ، بہتر ہے، تو اب آپ تشریف لے جائیے۔ کل اپنی والدہ یا والد کسی کو بھی لے کر آجائیے، کنٹریکٹ کر لیا جائے گا سال بھر کا۔"

زبیدہ نے کہا۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مجھے ملازم نہیں رکھ چاہتے؟"

سیٹھ صاحب چونک پڑے "یہ کیوں؟ یہ خیال کیوں آیا؟"

زبیدہ نے پہلو بدلتے ہوئے ذرا غمگین لہجہ میں کہا۔ مرے ہوؤں کو زندہ کس طرح کروں سیٹھ صاحب؟

سیٹھ صاحب جھینپ سے گئے، "کیا تمہارے والدین کا انتقا ہو گیا ہے۔؟"

زبیدہ نے کہا جی ہاں، وہ دونوں خدا کو پیارے ہو چکے۔ بھائی ہ وہ ننھا سا بہن ہے وہ چھوٹی سی۔"

سیٹھ صاحب نے کہا" یہ تو بڑی مشکل ہوئی کہ بالکل تنہا ہو؟"

زبیدہ نے کہا۔ "مشکل میرے لئے ہے مگر میں نہیں گھبراتی، آپ کیا گھبرائے جا رہے ہیں؟"

سیٹھ صاحب نے مزید گفتگو لاحاصل خیال کی، سیکرٹری کو بلایا اور سال بھر کا ایگریمنٹ دو سو روپے ماہوار پہ کر لیا۔ زبیدہ نے شکریہ ادا کیا اور کل آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فرمانے لگے "عجیب تیور کی لڑکی ہے۔ بھئی ہم نے تو ایسی لڑکی آج تک دیکھی نہیں"!

حاضر الوقت ایکٹرسوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکرائیں اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ البتہ الماس کے چہرے پر طنز کی شکن بہت نمایاں تھی!

---

(۸)
اُلجھن

زبیدہ کیا آئی، کمپنی میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس کی ہم پیشہ ایکٹرسوں
کا خیال تھا کہ یہ بھی ویسی ہی ہو گی جیسی وہ خود ہیں، لیکن یہ تو کچھ عجیب سی نکلی
سنجیدگی اور وقار کا پیکر بنی گھر سے آئی، میک اپ کیا اسیٹ پر پہنچ
کام انجام دیا۔ واپس آ کر میک اپ کے ساتھ سُرخی، پوڈر، ہر چیز کا نشان
مٹایا اور چپ چاپ گھر چلی گئی۔ نہ کسی سے میل نہ ملت، نہ قہقہوں سے
تعلق، نہ مجلس آرائیوں میں شریک، نہ ایکٹروں سے ہنسی دل لگی، نہ کمپنی کے
مرد کارکنوں سے ربط وضبط، نہ حاتم سیٹھ کے دربار میں پابندی کے ساتھ
حاضری، نہ سیٹھ صاحب کے برادر اصغر اور کمپنی کے جنرل مینجر قاسم سیٹھ
سے اظہار نیازمندی، پھر بھی جسے دیکھو وہ زبیدہ کا کلمہ پڑھ رہا تھا۔ کسی کی نظر
میں اس کا حسن وجمال اپنی مثال آپ تھا، کسی کا خیال تھا کہ اس کی آواز میں
وہ رس ہے کہ ایک دن ملک کی مشہور مغنیہ بن جائے گی، کوئی اس

کی رفتار میں رقص کا جلوہ دیکھتا، اور محسوس کرتا تھا کہ اگر اس نے رقص سیکھنے کی طرف توجہ کی تو بہت جلد چوٹی کی رقاصہ بن جائے گی۔ ابھی اسے کمپنی میں کام کرتے چند ہی دن ہوئے تھے اور مشکل سے سیٹ پر دو تین مرتبہ جانے اور چند مکالمے بولنے کا اتفاق ہوا تھا وہ بھی ایک داسی کی حیثیت سے، لیکن اہل نظر کا فتویٰ تھا کہ یہ لڑکی بہت جلد پردۂ سیمیں کی ملکہ بن جائے گی۔

لیکن خود زبیدہ اپنے بارے میں ان قیاس آرائیوں سے بالکل ناواقف تھی۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا، اس کے بارے میں کمپنی کے اہل نظر اور اہل دل کیا خیال رکھتے ہیں؟ اس کی ہم پیشہ بہنیں کس نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کے حال و مستقبل کے بارے میں کیسی کیسی رائے زنی کی جا رہی ہے۔

ایک روز اپنے میک اپ روم میں حسب معمول وہ پہنچی تو مس الماس رونق افروز نظر آئی۔ انہیں کمپنی میں آئے ہوئے دو تین سال ہو چکے تھے سات سو روپے ان کی تنخواہ تھی۔ گانا بہت اچھا گاتی تھیں۔ اداکاری کا جوہر بھی خاصا تھا، اخباروں میں ان کی تصویریں بھی چھپتی تھیں اور ان کی اداکاری کے بارے میں مضامین بھی چھپتے رہتے تھے۔ قاسم بھائی ان پر بہت مہربان تھے اور انہی کی نوازش تھی کہ اچھے سے اچھا "چانس" بھی ملتا رہا اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور وہ جیب خاص سے بھی ان کی خدمت کرتے تھے۔ لیکن زبیدہ ان تمام باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کے اور الماس کے تعلقات صرف صاحب سلامت

تک محدود تھے، اپنے کمرہ میں وہ الماس کو دیکھ کر ٹھٹکی، پھر مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔

الماس نے ایک دلآویز تبسم کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور کہا۔

جھجک کیوں گئیں؟ آؤ، میں بھی تمہاری طرح عورت ہی ہوں کوئی مردوا تو نہیں جو ڈر گئیں، !"

زبیدہ قریب کی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"میں شیر سے بھی نہیں ڈرتی، مردوا کیا چیز ہے؟

الماس :۔ بہت ناز ہے جناب کو اپنے حسن و جمال پر؟

زبیدہ :۔ (تیوری پر بل ڈال کر) یہ آپ کو کس نے کہا؟

الماس :۔ آپ کے غرور نے، اداؤں نے، تیکھی چتون نے۔

زبیدہ :۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ بھلا میں کس برتے پر غرور کروں گی؟

الماس :۔ جو برتا تمہارے پاس ہے، وہ اس کمپنی میں کسی اور کے پاس نظر نہیں آتا۔

زبیدہ :۔ یعنی ....؟

الماس :۔ یہ قاتل آنکھیں، یہ سحر طراز شخصیت، یہ روپ، یہ رنگ، یہ ادائیں، یہ سبھاؤ، یہ انداز، یہ رعنائی، یہ زیبائی، بھلا بتاؤ تو سہی تمہارے سوا کسی اور میں بھی ہے؟

زبیدہ :۔ اگر یہ ڈائلاگ یاد کرنے کی مشق ہے تو بہت کامیاب ہے

اگر یہ طنز اور تمسخر ہے، تو بالکل ناکام ہے،

الماس :- اللہ ری بے نیازی!

زبیدہ :- ایسا معلوم ہوتا ہے کسی سے لڑ کر آئی ہو اور غصہ مجھ ناتواں پر اتار رہی ہو۔

الماس :- ماشاءاللہ، کیوں نہ ہو، یہی باتیں تو لوگوں کے دل پر چرکا لگاتی ہیں۔

زبیدہ :- وہ کون لوگ ہیں، میں تو نہیں جانتی۔

الماس :- جلدی کیا ہے، جان لوگی، ابھی آتے ہوئے دن ہی کے ہوئے ہیں، مثل مشہور ہے، کہ آدمی سے پیر شدی؟

زبیدہ :- ان باتوں سے مجھے الجھن ہو رہی ہے۔

الماس :- شروع شروع میں میری بھی یہی کیفیت تھی۔

زبیدہ :- اور اب؟

الماس :- اب دلچسپی ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔ جی چاہتا ہے ہر وقت کوئی اسی طرح کی باتیں کیا کرے اور ہم سنا کریں۔

زبیدہ :- اس طرح کی باتیں کرنے والوں سے جب اتنی دلچسپی ہے تو وہاں سے یہاں کیوں چلی آئیں؟

الماس :- ذرا تمہیں ٹٹولنے،

زبیدہ :- اس سے فائدہ؟

الماس :- دیکھنا چاہتی ہوں کتنے پانی میں ہو؟

زبیدہ :- یہ دیکھ کہ کیا کرو گی ؟

الماس :- ممکن ہے کسی کی تاریک راتیں روشن ہو جائیں، ہو سکتا ہے تمہارے مقدر کا ستارہ چمک جائے۔

زبیدہ :- الماس بہن، یہ کس طرح کی باتیں کر رہی ہو ؟ سچ کہتی ہوں، یہ باتیں میرے لئے بالکل نئی ہیں ...... نئی بھی اور سراسر غیر دلچسپ بھی، بلکہ تکلیف دہ بھی۔

الماس :- میں نے بتایا تو تھا۔ شروع شروع میں میری بھی یہی کیفیت تھی۔

زبیدہ :- لیکن میری یہ کیفیت ہمیشہ رہے گی۔

الماس :- میرا بھی اپنے متعلق یہی خیال تھا۔

زبیدہ :- ایک خیال اگر غلط نکلا تو ہر خیال غلط نہیں ہو سکتا۔

الماس :- اچھا، ایک بات پوچھوں ؟ بتاؤ گی ؟ ...... لیکن سچ سچ ؟

زبیدہ :- بتانے والی ہوئی تو کیوں نہیں بتاؤں گی۔

الماس :- تم نے فلمی دنیا میں کیوں قدم رکھا ہے ؟

زبیدہ :- حالات سے مجبور ہو کر۔ ضرورت سے تنگ آکر۔ فاقہ کشی کے ہاتھوں دکھ جھیل کے، چھوٹے بھائی اور بہن کی ناقابلِ برداشت تکلیفوں کا احساس کر کے۔

الماس :- سچ کہتی ہو ؟

زبیدہ :- ہاں بالکل سچ،

الماس :۔ تمہیں یہاں کیا تنخواہ ملتی ہے ؟

زبیدہ :۔ دو سو ٹکے ہوتے ہیں

الماس :۔ اگر اتنی ہی رقم ہر مہینے گھر بیٹھے پہنچتی رہے تو کیا یہ لائن چھوڑ دو گی ۔

زبیدہ :۔ لیکن کیوں چھوڑ دوں ۔

الماس :۔ اس لئے کہ یہاں تمہاری خیر نظر نہیں آتی ،

زبیدہ :۔ یہ وجہ ہے کہ اتنی ہمدردی اور ایثار پر تیار ہو ۔

الماس :۔ ہاں صرف اس لئے .... میں دیکھ رہی ہوں ، بھیڑیے اور درندے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں میں ان سے تمہیں بچانا چاہتی ہوں ،

زبیدہ :۔ بہت بہت شکریہ اس احسان کا .... لیکن وہ بھیڑیے اور درندے مجھے تو کہیں نظر نہیں آتے ۔

الماس :۔ وہ تمہیں اس وقت نظر آئیں گے جب بالکل بے بس ہو جاؤ گی ۔ ابھی تو وہ جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں اور تاک میں ہیں کہ کب تم زد پر آتی ہو ؟

زبیدہ :۔ (سہم کر) سچ ؟

الماس :۔ ہاں میری بہن بالکل سچ ،

زبیدہ :۔ (پریشان ہو کر) یا اللہ میں کیا کروں ، کہاں جاؤں ؟

الماس :۔ اپنے گھر جاؤ ، وہاں آرام سے بیٹھو ، ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو

دو سو روپے تمہاری بہن الماس خود تمہیں دے آیا کرے گی جاکر،

زبیدہ :۔ لیکن میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی۔

الماس : احسان نہیں لینا چاہتی، لیکن زندگی غارت کر دینا چاہتی ہو ؟

بے وقوف چھوکری، یہاں سے تو اپنی عزت سلامت نہ لے جا سکے گی

زبیدہ :۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو، میں عزت پر اپنی جان تک قربان کر دونگی"

الماس :۔ ہاں کر دو گی، لیکن عزت جانے کے بعد ،

زبیدہ :۔ نہیں اس سے پہلے۔

الماس :۔ تم ناسمجھ ہو، نادان ہو، انجان ہو۔

زبیدہ :۔ لیکن اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔

الماس :۔ یہ غلط فہمی ہے۔ یہی غلط قسم کی خود اعتمادی لے ڈوبتی ہے،

زبیدہ :۔ دیکھ لینا...... جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہ کر کے دکھاؤں گی۔

الماس :۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے امتحان میں اپنے آپ کو کیوں ڈال رہی ہو ؟

زبیدہ :۔ کہہ تو دیا، حالات ہی ایسے ہیں، بھلا بتاؤ تو سہی۔ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا۔

الماس :۔ میں نے ؟"

زبیدہ :۔ ہاں بتاؤ۔

الماس :۔ اس لئے کہ میں بھی تمہاری طرح مجبور ہو گئی تھی۔ اس کے سوا میرے لئے کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا۔

زبیدہ :۔ کتنی یکسانیت ہے میرے اور تمہارے حالات ہیں،

الماس :۔ ہاں، بہت زیادہ!

زبیدہ :۔ تمہیں ان بھیڑیوں اور درندوں سے ڈر نہیں لگا؟

الماس :۔ خوب لگا، لیکن یہ جیت گئے، میں ہار گئی، انہوں نے لوٹ لیا۔ میں لٹ گئی۔

زبیدہ :۔ یا اللہ، یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ اف!

الماس :۔ ایک سچی اور دکھ بھری کہانی .... دیکھو مجھے چشم دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

زبیدہ :۔ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں آیا؟

الماس :۔ بھئی بڑی بے وقوف ہو، آیا، لیکن یہ ذریعہ معاش نہ چھوڑ سکی، تباہ ہوگئی، اب یہ حال ہے کہ کسی شریف لڑکی کو جب اس راہ پر آتے دیکھتی ہوں تو دل کڑھتا ہے کہ ہم تو جیسے ہیں ہیں۔ دوسروں کو اگر تباہ ہونے سے بچالیں تو ثواب ہی مل جائے گا تھوڑا سا۔

زبیدہ :۔ بڑی نیک دل اور کتنی اچھی ہو تم؟

الماس :۔ صرف نیک ہی نہیں۔ نیک نیت بھی ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر غور کرو۔

زبیدہ :۔ ہاں مجھے ذرا سوچنے کا موقعہ دو۔ تم نے اس وقت مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔

الماس :۔ نہیں الجھن میں مبتلا نہیں کیا، ایک بہت بڑے خطرے

سے آگاہ کر دیا ہے۔

زبیدہ خاموش ہو گئی، الماس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی!

(۹)

ہچکولے

الماس کے جانے کے بعد زبیدہ سوچنے لگی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے، ابھی کمپنی میں ملازم ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں کہ یہ باتیں شروع ہو گئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اگر نوکری چھوڑ دوں تو کروں کیا اور نہ چھوڑوں، تو کیا بھیڑیوں اور درندوں کا شکار بن جاؤں؟..... یہاں کتنی خود اعتمادی کے ساتھ میں آئی تھی۔ لیکن الماس کی باتوں نے میری ساری خود اعتمادی ختم کر دی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے......

یکایک کمرہ میں ایک نوجوان داخل ہوا،

یہ قاسم سیٹھ تھے...... بھارت فلمز کے جنرل مینجر۔

قاسم سیٹھ کو دیکھ کر زبیدہ کھڑی ہو گئی، قاسم سیٹھ مسکراتے ہوئے اسی کرسی پر بیٹھ گئے جس پر ابھی الماس بیٹھی تھی۔ پھر انہوں نے زبیدہ سے کہا۔

"تشریف رکھیے!"

"وہ بھی بیٹھ گئی،

قاسم سیٹھ :- یہاں اکیلی کیا کر رہی ہیں آپ؟

زبیدہ :- کچھ نہیں، یونہی بیٹھی تھی،

قاسم سیٹھ :- دوسری ایکٹرسوں کے ساتھ آپ کو ملتے جلتے بہت کم دیکھ

رہوں کیا بات ہے؟

زبیدہ :- کچھ عادت سی الگ تھلگ رہنے کی ہو گئی ہے۔

قاسم سیٹھ :- الگ تھلگ رہنے سے کیا فائدہ؟

زبیدہ :- جی ہاں! ہے تو نقصان کی بات، مگر مجبوری ہے۔

قاسم سیٹھ :- ابھی آپ سے اور مس الماس سے تو بہت گھل مل کر باتیں

ہو رہی تھیں؟........ شاید وہ مستثنیٰ ہیں آپ کے اصول سے، دل

گیا ہو گا ان سے؟

زبیدہ سٹ پٹا گئی، اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔

جی ہاں، معلوم تو معقول آدمی ہوتی ہیں۔"

قاسم سیٹھ :- کیا میں پوچھ سکتا ہوں، کیا باتیں ہو رہی تھیں آپ دونوں

میں؟

زبیدہ :- (پریشان ہو کر) کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔

قاسم سیٹھ :- پھر بھی؟

زبیدہ :- یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے ہم لوگ،

قاسم سیٹھ :۔ بس ادھر ادھر کی باتیں؟ ...... خوب، شاید مجھے یہ حق تو نہیں ہے کہ آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں، لیکن ایک بات بے کہے بھی جی نہیں مانتا .... ہے اجازت؟

زبیدہ :۔ شوق سے فرمائیے۔

قاسم سیٹھ :۔ یہ فلم کمپنی ہے، یہاں ہر شخص کا مفاد دوسرے سے ٹکراتا ہے لہٰذا وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے راستہ سے ہٹا دوں،

زبیدہ :۔ لیکن میں تو ایسا نہیں محسوس کرتی .... یعنی میں تو کسی کو اپنے راستہ سے ہٹانا نہیں چاہتی۔

قاسم سیٹھ :۔ ہر شخص کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ بے شک آپ یہ نہیں چاہتیں کہ کسی کو اپنے راستے سے ہٹائیں لیکن دوسرے تو یہ چاہ سکتے ہیں،

زبیدہ :۔ ہاں ہو سکتا ہے، لیکن کیوں؟ خواہ مخواہ؟

قاسم سیٹھ :۔ کیا الماس یہ نہیں چاہتی کہ یہ پیشہ آپ ترک کر دیں؟

زبیدہ :۔ ممکن ہے چاہتی ہوں۔"

قاسم سیٹھ :۔ ساری باتیں تو میں نہیں سن سکا۔ لیکن جتنی باتوں کی بھنک میرے کان میں پڑی، ان سے میں نے تو یہی اندازہ لگایا ہے،

زبیدہ :۔ ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو؟

قاسم سیٹھ :۔ جی وہ تو غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ قطعاً صحیح ہے۔ ہاں آپ نہ مانیں تو دوسری بات ہے۔

زبیدہ :۔ لیکن ایسا کیوں ہے ؟ میں نے تو مس الماس کا کچھ نہیں بگاڑا ۔

قاسم سیٹھ :۔ یہ نہ کہئے .... واقعہ تو یہ ہے کہ آپ نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا ۔

زبیدہ :۔ (حیرت سے) میں نے ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

قاسم سیٹھ :۔ جی اور کس نے ؟ .... وہ آپ ہی ہیں جس سے ان کا بازار اس کمپنی میں سرد ہو سکتا ہے، آپ کے علاوہ اور کون ہستی ہے جس سے وہ خائف ہیں ؟

زبیدہ :۔ لیکن کیوں خائف ہو سکتی ہیں وہ مجھ سے ؟

قاسم سیٹھ :۔ اس لئے کہ آپ انہیں مات دے سکتی ہیں۔ آپ کی ترقی ان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔ آپ شہرت کے آسمان پر آفتاب کی طرح چمکیں گی اور ان کی شہرت کا آفتاب غروب ہو جائیگا کیا یہ کوئی معمولی بات ہے ؟

زبیدہ :۔ (معصومیت کے ساتھ) وہ تو بھیڑیوں اور درندوں کا ذکر بھی کر رہی تھیں ۔

قاسم سیٹھ :۔ (قہقہہ لگا کر) ضرور کر رہی ہوں گی، اس سے اچھا حربہ ان کے پاس ایک بھولی اور نادان لڑکی کو مرعوب اور وحشت زدہ کرنے کا اور کیا ہو سکتا ہے ؟ لیکن کیا آپ ڈر گئیں ؟

زبیدہ :۔ ہاں ڈر تو گئی تھی لیکن آپ کی باتوں سے حوصلہ بندھ گیا ہے

اب تو نہیں ڈرتی ۔

قاسم سیٹھ :۔ آپ کے ان الفاظ میں عزم ہے، ہمت ہے حوصلہ ہے، امنگ ہے، خودی ہے، خوداعتمادی ہے، میں بہت خوش ہُوا۔

زبیدہ :۔ لیکن اپنی عزت کسے عزیز نہیں ہوتی ؟

قاسم سیٹھ :۔ ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے .... صاف بات یہ ہے کہ آپ خود اپنی مالک اور مختار ہیں ۔ اگر آپ کسی بھیڑیئے سے نہ ڈریں تو آپ کا کوئی نہیں بگاڑ سکتا ۔ بھیڑیا تو بھیڑیا، شیر بھی نہیں بگاڑ سکتا ۔

زبیدہ :۔ یہ تو ٹھیک ہے، مگر الماس کی باتوں نے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کروں ...... ایک مرتبہ اور غور کر لوں کہ اس انڈسٹری میں مجھے رہنا چاہیئے یا نہیں ؟

قاسم سیٹھ :۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دشمن کا حملہ کامیاب ہوا، اس نے آپ کو ہراساں کر دیا اور آپ راہ فرار اختیار کرنے لگیں ۔ میں آپ کو منع نہیں کرتا، خوب اچھی طرح غور کر لیجئے ۔"

زبیدہ :۔ جی ہاں، یہی چاہتی ہوں ۔

قاسم سیٹھ :۔ اگر اجازت ہو تو ایک بات اپنی طرف سے بھی کہہ دوں ،

زبیدہ :۔ ضرور فرمایئے

قاسم سیٹھ :۔ جب تک آپ اس کمپنی میں ہیں آپ کو کسی طرح کا گزند نہیں پہنچ سکتا ۔ آپ میری حمایت میں ہیں ۔

زبیدہ :۔ بہت شکر گذار ہوں، آپ کی اس حوصلہ افزائی کی !

تھوڑی دیر بعد قاسم سیٹھ چلے گئے اور زبیدہ اس نئی صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگی۔ الماس کی باتیں اسے یاد آرہی تھیں، اور وہ سوچ رہی تھی، واقعی کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں آنے کے بعد کہیں کی نہ رہوں۔ کہیں سکینہ بوا کی بات صحیح ثابت ہو کہ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں اور میں ندامت سے سر جھکا لوں۔ سچ تو کہہ رہی تھیں بوا۔ لڑکی ذات کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، طعن و تشنیع سب کچھ، لیکن یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ لوگ مجھے میرے کردار کی بنا پر حقیر اور ذلیل تصور کریں لیکن کیا واقعی میں مجبور کی جا سکتی ہوں، کیا واقعی کچھ بھیڑیے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامنے میں بے بس ہو جاؤں گی؟ ..... نہیں یہ غلط ہے، یہ خیال خام ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ جب تک سانس باقی ہے اس وقت تک میں اتنی ہی پاک اور پاک دامن رہوں گی جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ دنیا ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنے کی بھی شرط یہ ہے کہ آدمی میں حوصلہ ہو، خود اعتمادی ہو، ہر قسم کی کشمکش سے یہاں دوچار ہونا پڑتا ہے، جو کشمکش کے دور سے کامیاب نکل گیا اس کی زندگی کامیاب ہے، جو ہمت ہار گیا اس کی زندگی ناکام ہو گئی۔ بس تو یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں اپنے رستے پر چلتی رہوں گی، پھول ہوں یا کانٹے، کسی کی پروا نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی زندگی خود بنانی ہے۔ مجھے اپنا راستہ خود ہموار کرنا ہے۔ خدا نے مجھ پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں، میرا فرض ہے کہ ان ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دوں۔ قدرت کی طرف سے کچھ فرائض مجھ پر عائد کیے

گئے ہیں اور میں پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ یہ فرائض ادا کروں گی۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ پہلی ہی دھمکی سے ڈر کر گوشہ نشین ہو جاؤں؟ اور تسلیم کر لوں، واقعی میں کچھ بھی نہیں ہوں، ...... پھر مجھے یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ میرے لئے زندگی کا ہر دروازہ بند ہے۔ میں کہیں بھی آسانی سے کھپ نہیں سکتی۔ خاندان کا کوئی لڑکا شادی کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ خوب صورت ہونے کے باوجود غریب ہوں۔ کہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ نہ میرے پاس کوئی ڈگری ہے، نہ ڈپلوما، ماں باپ نے کوئی جائداد نہیں چھوڑی۔ پھر اگر میں خود ہی نہ کماؤں تو کیا کروں؟...... نہیں ان باتوں سے میں ہراساں نہیں ہو سکتی، میں وہی کروں گی جو کر رہی ہوں، کامیاب ہوئی تو خیر، ورنہ اس دنیا سے گذر جاؤں گی میری کامیابی بھی لوگوں کے لئے ایک نمونہ ہو گی اور ناکامی کی صورت میں اگر مر گئی تو وہ موت بھی ایک سبق ہو گی۔ میری جیسی بہنوں کے لئے، ٹھیک ہے، زندگی کا قافلہ اسی ڈگر پر چلتا رہے گا۔!

---

(۱۰)

زندگی کا نیا دور

نہ دن گزرتے دیر لگتی ہے، نہ دن پلٹتے، وہی زبیدہ جو "بھارت فلمز" میں ایک معمولی ایکسٹرا گرل کی حیثیت سے شامل ہوئی، آج ملک کی محبوب اور نامور ایکٹرس ہے جسے پہلے کوئی نہ جانتا تھا اب اس کی شہرت شہر چھوڑ دیہات تک پہنچ چکی تھی جس فلم میں وہ کام کرتی ہے اسے دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پان والوں کی دکان پہ، ہیر ڈریسنگ سیلون میں، راستوں میں، ہوٹل میں، جہاں دیکھئے، جدھر جائیے، زبیدہ کی قد آدم تصویر آویزاں ہے نئے نئے پوز میں، نئے نئے ڈھب سے، نئے نئے رنگ سے جس کمپنی میں اسکی حیثیت کچھ نہ تھی آج وہاں اس کا طوطی بول رہا ہے۔ پہلے حاتم سیٹھ اس سے مخاطب نہ ہوتے تھے، اب وہ اس کی خاطر داری بلکہ خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہ کمپنی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں، حاتم سیٹھ کے چھوٹے بھائی قاسم سیٹھ جو کمپنی کے جنرل منیجر ہیں، زبیدہ کی ناز برداری میں مصروف

رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ قاسم بھائی وہ بزرگ ہیں جنکا اپنی کمپنی کی عام ایکٹرسوں کے ساتھ وہی برتاؤ ہے جو ایک مالک کا لونڈی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جانتے ہیں یہ سونے کی چڑیا ہے، اگر کہیں اڑ گئی تو کمپنی کا دم نکل جائے گا۔ یہ دستور جی کمپنی کے کیمرہ مین ہیں، کون ایکٹر ہے جو ان کی خوشامد میں نہ لگا رہتا ہو؟ کون ایکٹرس ہے جو ان کے چشم دابرو کے اشارے پر نہ چلتی ہو۔ کمپنی کے مالک اور مینجر تک ان سے دبتے ہیں، ذرا کیمرہ ادھر سے ادھر کر دیں، لاکھوں روپیہ پر پانی پڑھ گیا، ساری پکچر ماری گئی، لیکن زبیدہ کے دربار میں دستور جی بھی سر نیاز خم کر کے پہنچتے ہیں، یہ شاداں صاحب ہیں۔ کمپنی کے میوزک ڈائریکٹر ملک کے مشہور موسیقار، ان کی دھنیں سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں، بچہ بچہ کی زبان پر ان کی بنائی ہوئی دھنیں نغمہ بن کر سما رہی ہیں، انہیں اجازت ہے کہ جس ایکٹرس کو چاہیں ناپسند کر دیں۔ پھر کوئی گیت اس سے نہیں گوایا جا سکتا۔ ان کے فیصلے کی کوئی اپیل نہیں ہے، یہ خود ہی حاکم ہیں، خود ہی جج، بڑی بڑی مشہور اور نامور ایکٹرسیں اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہیں، کہ جس فلم میں یہ میوزک دیں کسی طرح ان کو بھی چانس مل جائے لیکن زبیدہ سے یہ شاداں صاحب بھی مسحور ہیں۔ ممکن نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکیں۔

زبیدہ جب اس کمپنی میں داخل ہوئی تھی تو اس کی تنخواہ دو سو روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ اور حاتم سیٹھ اسے کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے، لیکن اب فری انکم ٹیکس سات ہزار ماہوار وصول کر رہی تھی۔ پہلے صبح سے شام

تک مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اب وہ اپنے گھر پہ آرام کرتی رہتی ہے، جب سیٹ پہ سب لوگ آجاتے ہیں تب فون کیا جاتا ہے، اور وہ ایک شاندار موٹر میں بیٹھ کر اس شان سے تشریف لاتی ہے جیسے کوئی ملکہ اپنی راجدھانی میں قدم رکھ رہی ہو۔

پہلے وہ ایک معمولی سے مکان میں رہتی تھی جس میں صرف دو کمرے تھے اور ایک کوٹھری، ذرا سا صحن۔

اب وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار بنگلہ میں رہتی ہے جس کا کرایہ بارہ سو روپیہ ماہوار کمپنی کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک درجن سے زیادہ روشن اور ہوادار کمرے ہیں، سنگ مرمر کا فرش ہے، نہانے کا تالاب ہے، فوارے ہیں، چمن ہے، بجلی کے پنکھے ہیں، ڈریسنگ روم الگ ہے، ڈائننگ روم الگ، ڈرائنگ روم جدا، بڈ روم سب سے الگ۔

پہلے گھر کا سارا کام اسی کو کرنا پڑتا تھا، پھر سکینہ آگئی تو اس نے سنبھال لیا، لیکن اب؟ .... درجنوں نوکر تھے، خادمائیں تھیں، چھوکرے تھے رقیہ کی خدمت کے لئے الگ، اسلم میاں کی ناز برداری کے لئے جدا سکینہ بوا اب ٹھاٹھ سے ایک کھٹولے پر بیٹھی دن بھر حقہ پیا کرتی تھیں۔ اور گھر کے نوکر چاکر ان کی خدمت کیا کرتے تھے، کس کی مجال تھی جو ان کے حکم سے سرتابی کرے، خود زبیدہ ان کا اتنا ہی مان رکھتی تھیں جتنا ایک سعادتمند لڑکی اپنی ماں کا رکھ سکتی ہے۔

پہلے محلے والے، کنبہ والے، خاندان والے زبیدہ کے گھر جاتے ہوئے بھی

تھے، ڈرتے تھے، کہیں دستِ سوال نہ دراز ہو جائے اور کچھ دینا نہ پڑ جائے سب کو معلوم تھا اس گھر میں خدا کی برکت ہے۔ لیکن اب نئے نئے رشتہ دار پیدا ہو رہے تھے، جنہیں نہ کبھی زبیدہ نے دیکھا تھا، نہ نام سنا تھا، جسے دیکھئے وہ زبیدہ سلمہا کو دیکھنے اس کی خیریت دریافت کرنے چلا آ رہا ہے۔ جو آ رہا ہے، وہ سراپا خدمت اور سراپا اطاعت بنا ہوا۔ جو بات زبیدہ کے منہ سے نکل گئی اس کی تائید کی جا رہی ہے، جو مرضی زبیدہ کی معلوم ہوئی اس کی تعمیل کی جا رہی ہے۔

خاندان اور کنبہ کی وہی عورتیں، جنہوں نے اس کے ننگِ خاندان ہونے کا فتویٰ دیدیا تھا، جو اس کے منہ دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ جن کی نظر میں وہ ایک رنڈی اور طوائف سے بدتر تھی، اب جب دیکھو...... رونق افروز ہو رہی ہیں۔ گلے مل رہی ہیں، محبت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی ہیں، دعائے درازیِ عمر و درجات دے رہی ہیں، اس کے سبھاؤ، شرافت اور بھلمنساہت کے گن گا رہی ہیں۔ اس کی انسانیت اور معقولیت کے قصیدے پڑھ رہی ہیں۔ چند دن اسے نہیں دیکھتیں تو بے تاب ہو جاتی ہیں اور دوڑی دوڑی آتی ہیں، کہ اپنی "بچی" کا دیدار کر لیں۔

خاندان کے وہ نوجوان جو اس کی صورت دیکھ کر کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے تھے، لیکن اس کی غربت کی وجہ سے شادی کے روادار نہ تھے، اب یہ بات اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے کہ وہ انہیں اپنا شوہر بنانے پر راضی ہو جائے بہنوں کو مجبور کرتے تھے کہ اس کے سامنے جا کر ان کی تعریف کریں، ماؤں پر

زور دیتے تھے کہ وہ "پیغام" دے کر جائیں - اور جس طرح بھی ہو یہ اعزاز حاصل
کر کے آئیں ، ان نوجوان ، تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے بھائیوں کی وہی بہنیں جو
زبیدہ سے رشتہ کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں ، اب جاتی تھیں ، اور گھنٹوں
اس کے دربار میں حاضر رہتی تھیں ، وہیں مائیں جو یہ بات سن کر کہ زبیدہ
کو بہو بنا لیں ناک بھوں چڑھا لیتی تھیں ، اب بڑی امیدوں اور آرزوؤں
کے ساتھ اس کے قصرِ فلک نما میں پہنچتیں - لیکن اس کی شان اور تحمل
کہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ حرفِ مطلب زبان پر لائیں ، حسرت سے اس
منہ تکا کرتی تھیں ، چپ چاپ بیٹھی رہتی تھیں اور دل کی بات زبان پر
کے لئے کسی اچھے موقع کی تلاش میں یونہی واپس آجاتی تھیں -

رقیہ کا کمرہ اب قیمتی گڑیوں سے بھرا ہوا تھا - اسلم کے کمرے میں گر
قیمت کھلونوں کے ڈھیر لگے تھے - سکینہ تو ابھی زیوروں سے لدی ہوئی
انہوں نے ساٹھ روپے دیکر اور نازک وقت میں حق رفاقت ادا کر کے
زبیدہ کو خرید لیا تھا ، دلارے اگر دولت مند اور سعادت مند ہوتا
اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا -

اس ترقی ، اس دولت ، اس عروج اور اس جاہ و حشم کے باوجود ز
کے طور طریق میں کوئی فرق نہیں آیا - وہ جتنی جتنی بڑھتی گئی اتنی ہی اتنی ا
میں خاکساری آتی گئی - جتنا جتنا روپیہ اس کے پاس آتا گیا - اتنا ہی ا
کے لئے اس کا ہاتھ کھلتا گیا ، جتنی جتنی وہ امیر ہوتی گئی ، اتنی ہی اتنی ا
کے دل میں غریبوں کی ، ناداروں کی ، محتاجوں کی محبت پیدا ہوتی گئی

محلہ کی نہ جانے کتنی لڑکیاں تھیں، جن کی اس نے اپنے پاس سے ہزاروں
روپے خرچ کر کے شادی کرائی تھی، نہ جانے کتنی لڑکیاں تھیں جن کی تعلیم کے
مصارف وہ ہنسی خوشی برداشت کرتی تھی، کئی اپاہج اور بیمار ایسے تھے جن
کے مصارف زبیدہ کی جیب سے ادا ہوتے تھے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں
میں جن کی مالی حالت زمانہ نے خراب کر دی تھی زبیدہ ان کی مدد کرتی تھی۔
نہیں مشکلات کے بھنور سے نکالتی تھی اور یہ سب کچھ اتنی خاموشی سے اور
ایسے پوشیدہ طور پر کرتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے پاتی تھی۔ حد یہ
ہے کہ سکینہ بوا تک جو اس کی راز دار اور جانثار تھیں، یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ
سے کیا دیتی ہے؟ اور کن کن لوگوں کو کس کسطرح مدد کرتی ہے؟

ملازموں اور خادماؤں کے ساتھ بھی زبیدہ کا برتاؤ ایسا مشفقانہ تھا کہ وہ
س پر جان چھڑکتے تھے، نہ کبھی کسی کو ڈانٹا، نہ کسی کو نقصان پر جرمانہ کیا، نہ چھٹی
ور غیر حاضری کی تنخواہ کاٹی، پھر انعام و اکرام الگ، عید بقر عید اور تہوار کے
لاوہ بھی وہ بہانے تلاش کرتی تھی کہ کس طرح کس ملازم یا خادمہ یا جان پہچان
سے کی مدد کرے۔ جب کسی کی مدد کرتی تھی تو ایسی خوش ہوتی تھی جیسے کسی
نے بڑے نازک موقع پر خود اس کی مدد کر دی ہو!

ایک پہیلی

آج کی زبیدہ کل کی زبیدہ سے کتنی مختلف کتنی بدلی ہوئی اور کتنی
ہے ؟ ...... یہی زبیدہ جو غیر مردوں سے بات کرتے لجاتی تھی، جو گھ
باہر نکلتے جھجکتی تھی۔ جو تنہائی میں کسی اجنبی شخص سے گفتگو کا تصور بھی نہ کر
تھی، جو نماز روزہ کی پابند تھی، قرآن پاک پابندی سے پڑھتی تھی اب ک
بے حجاب، کتنی بے باک اور کتنی آزاد ہو گئی تھی !! ....

پہلے وہ چراغ خانہ تھی، اب شمع محفل ہے، پہلے اس کی روشنی صرف
کی چار دیواری تک محدود تھی اور اب اس کی جگمگاہٹ سے سارا
بقعہ نور بنا ہوا تھا، پہلے گھر والے عزیز قریب بھی اسے منہ نہیں لگ
اب بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار، امیر و رئیس، وکیل اور بیرسٹ
قوم اور راہنمایانِ ملت اس کے کوچہ کا طواف کیا کرتے تھے پہلے اس
ویران تھا، سنسان تھا، موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا، اس

اس کے گھر میں رونق تھی، چہل پہل ہے، گہما گہمی ہے۔ پہلے اس کی دنیا رقیہ اور اسلم تک محدود تھی، اب اس کا گھر ایک محل سرا تھا جہاں آنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، یہ فلاں سیٹھ ہیں، یہ فلاں بیرسٹر صاحب ہیں، یہ فلاں جاگیر دار صاحب ہیں، یہ فلاں رئیس اعظم صاحب ہیں، آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، امید اور آرزو کے ساتھ شرف تخاطب حاصل کرتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں، اور ان میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو بار بار آنے کے باوجود نہ بیٹھنے کی جگہ پاتے ہیں، نہ بات کا موقعہ ...... آخر بصد حسرت و یاس رخصت ہو جاتے ہیں۔

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھے چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا، تیری محفل میں رہ گیا

اس طرح کے لوگ رخصت ہو جاتے تھے اور زبیدہ کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا، کون آیا اور چلا گیا؟

لیکن اس جاہ و جلال اور شہرت و اقتدار کے باوجود زبیدہ تھی ایک پہیلی، وہ سب سے ملتی تھی، تپاک اور گرم جوشی کا برتاؤ کرتی تھی۔ محبت کرنے والوں کی کمی نہ تھی، جسے دیکھئے دل بے قرار لئے موجود ہے۔ ان محبت کرنے والوں میں سے وہ کسی سے دل شکنی نہیں کرتی تھی۔ کسی کے ساتھ برا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ اس کے تبسم کی نعمت عام تھی، کوئی اس سے محروم نہیں رہتا تھا۔ اس کے اخلاق و تپاک سے سب کو حصہ ملتا تھا۔ وہ ہنستی تھی، مسکراتی تھی، باتیں کرتی تھی تحفے قبول کرتی تھی، شکریہ ادا کرتی

تھی اور اسی شکریہ ہیں ساری قیمت بے بہا اور گراں مایہ تحفہ کی اہلِ دل
کو وصول ہو جاتی تھی، لیکن .... اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات
ہے، تبسم اور شکریہ کے بعد تماشا ختم، پیسہ ہضم!

زبیدہ کے طلسم ہوشربا سے باہر نکلنے کے، لوگوں کو احساس ہوتا تھا
کہ کتنی آسانی سے وہ بے قوف بن گئے، ۲۵ ہزار روس رائس کار کی
قیمت صرف ایک سحر طراز تبسم، پندرہ ہزار کی پیچ لڑی کا خون بہا صرف
ایک جان لیوا ادا کے ساتھ شکریہ، سوا لاکھ کے قیمتی بنگلہ کا معاوضہ، صرف
سنسنی خیز مصافحہ، آخر یہ کیا مذاق ہے؟ قاسم سیٹھ، خاں بہادر، انشتیاق علی
خاں اور نواب طاہر علی بیگ، بیچارے کے ساتھ یہی ماجرا گزرا تھا۔ اور
یہ تینوں جو زبیدہ کے تبسم، شکریہ اور مصافحہ سے لطف اندوز ہو کر خوش
خوش واپس آئے تھے، پیچ و تاب کھانے لگے، دولت جو سب کچھ خرید
سکتی ہے، زبیدہ کو نہیں خرید سکتی۔ اس سے کم قیمت پر زبیدہ
سے زیادہ حسین اور خوب رو عورتیں خریدی گئیں اور بکیں
پھر آخر اس ہی ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ دولت پر ڈ
مارنے کے باوجود، یہ ان مول ہے؟ یہ کیوں نہیں خریدی جا
یہ کیوں نہیں بک سکتی؟ یہ کیوں قابو میں نہیں آتی؟ اور پھر یہ اپنے دل
تسلی دیتے، کب تک انمول رہے گی؟ آخر کو اسے بکنا ہے، اور ہمیں
خریدنا ہے، آج نہیں تو کل سہی، لیکن کل کب آئے گی۔ آئے
بھی یا نہیں؟

قاسم سیٹھ، خان بہادر اور نواب صاحب میں مقابلہ تھا۔ قاسم کو یہ گھمنڈ تھا کہ زبیدہ ان کی کمپنی میں ملازم ہے، خان بہادر صاحب اس خیال میں تھے کہ آدھا ان کا زر خرید ہے۔ اور نواب صاحب کو یہ زعم تھا کہ گورنر صاحب تک ان کی رسائی تھی اور بڑے بڑے حکام انہیں دیکھ کر سر جھکا لیتے تھے، جیسے سچ مچ وہ کہیں کے بادشاہ اور شہریار ہوں، لیکن ان تینوں میں زیادہ پُر امید قاسم سیٹھ تھے، ان کا دعوےٰ تھا کہ زبیدہ لاکھ گریز سے کام لے، لیکن ایک دن پکے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آگرے گی۔ اس کے مستقبل، اس کی شہرت اور اس کی ہر دلعزیزی کی کنجی انہیں کے ہاتھ میں تھی، وہی تھے جنہوں نے زبیدہ کو زبیدہ بنا دیا تھا۔ ورنہ اس کی حیثیت ایک گمنام اور بے مایہ چھوکری سے زیادہ کیا تھی؟ کون اتنی بڑی تنخواہ دے گا؟ کون یہ غمزے اٹھائے گا؟ کون ہزاروں روپے ماہوار خرچ کر کے اس کی پبلسٹی کرے گا۔ کیا یہ خان بہادر صاحب، کیا یہ نواب صاحب؟ ہونہہ، یہ صرف روپیہ دے سکتے ہیں، انام نہیں دے سکتے، شہرت خرید کر نہیں عطا کر سکتے، وہ میں ہوں جس نے فقیرانہ زندگی بسر کرنے والی، ایک معمولی سی لڑکی کو، ملک کی بہت بڑی اور سب سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز آرٹسٹ بنا دیا ہے...... میں، صرف میں، یعنی قاسم سیٹھ!

(۱۲)

سلیم

زبیدہ ابھی ابھی اسٹوڈیو سے واپس آئی تھی، آج بڑی دیر تک کام کرنا پڑا تھا۔ بہت تھکن محسوس کر رہی تھی۔ آتے ہی بنگلہ کے لان میں ایک آرام کرسی پہ دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر کے چپ چاپ پڑ رہی۔ تھوڑی دیر میں ملازم چائے کی ٹرے لے کر حاضر ہوا، پیالیوں کی کھنک سن کر اس نے آنکھ کھولی، اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جی تو نہیں چاہتا ہے، لیکن خیر لے آئے ہو تو پی لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چائے بنانے لگی، چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا ہی تھا کہ ملازم نے آکر اطلاع دی، "کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

زبیدہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے، اس کو ذرا تلخی کے ساتھ پوچھا،

"کون صاحب تشریف لائے ہیں؟ . . . . . ہر وقت کوئی نہ کوئی صاحب

ملازم نے عرض کیا، "سرکار میں نے تو انہیں یہاں آتے کبھی نہیں دیکھا، آج ہی آئے ہیں، اور کچھ عجیب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

زبیدہ مسکرائی۔ "عجیب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں؟ تو ضرور بلا لاؤ۔ معمولی آدمیوں سے ملتے ملتے تنگ آ گئی ہوں، آج ذرا کسی عجیب سے ملنا چاہیئے، دیکھو وہ کیسا ہوتا ہے؟"

ذرا دیر میں عجیب آدمی زبیدہ کے سامنے کھڑا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ واقعی وہ عجیب آدمی تھا، صورت شکل معمولی، نہ دبلا نہ موٹا، سر کے بال بڑھے ہوئے، شیو کئی دن سے نہیں بنا تھا۔ کپڑے بہت معمولی، اور وہ بھی بہت میلے، ہاتھ میں سگریٹ، منہ میں پان، زبیدہ کو ان چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ اس نے تیوری چڑھا کر اس عجیب شخص پر ایک نظر ڈالی، اور کہا۔

"فرمایئے، کیسے زحمت فرمائی۔"

اس شخص نے کہا۔ "آپ تو اس طرح اکھڑی اکھڑی باتیں کہہ رہی ہیں کہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکوں گا۔"

زبیدہ کی تیوریاں اب تک چڑھی ہوئی تھیں، اس نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

وہ بولا۔ "میں تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ آپ عورت ہیں۔"

زبیدہ مسکراتی ہوئی بول پڑی۔ "لیکن یہاں آکر آپ کا سامنا ایک مرد سے ہوا؟"

وہ کہنے لگا ۔ "آپ بے شک میرا مذاق اڑا سکتی ہیں ، شوق سے
بنا یئے ۔ فقرے چست کیجئے ، ہنسی اڑا یئے ، ذرا بھی برا نہیں مانوں گا ، لیکن
یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اپنی ناکام زندگی میں کبھی مجھے اتنی روحانی اذیت
نہیں ہوئی جتنی آج آپ کے پاس آکر ہوئی ہے ۔"

یہ باتیں اس نے کچھ ایسے درد اور سوز کے انداز میں کہیں کہ زبیدہ متا
ہوئی ، اس نے کہا ۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ، میں بھلا آپ کا مذاق کیوں اڑا
لگی ؟ آپ صورت سے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ بتایئے میں آپ کی کیا
کر سکتی ہوں ؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "جی نہیں ، میں کچھ نہیں کہوں گا ۔ مجھے
افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا ، اب مجھے اجازت . . . .
دیجئے ۔"

زبیدہ نے اصرار کے ساتھ پوچھا "لیکن کیوں ؟ اس قدر جلد آپ
خفا کیوں ہو گئے ؟ میں نے اپنی دانست میں کوئی بات نہیں کہی تھی جو آپ
کے لئے تکلیف دہ ہو ۔"

وہ بولا "عورت اور مرد میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ مرد سفاک اور
سنگ دل ہوتا ہے ، عورت شفیق اور رحم دل ہوتی ہے ، مرد دوسروں کی
مصیبت کی پروا نہیں کرتا ، عورت کسی کو مصیبت میں دیکھتی ہے تو بیتاب
ہو جاتی ہے . . . . میں آپ کو عورت سمجھ کر آیا تھا ۔"

زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "پھر میں کچھ کہوں گی ، تو آپ خفا

جائیں گے، تشریف رکھئے، بیٹھئے اور یقین کیجئے کہ آپ ایک عورت سے مخاطب ہیں اور یقیناً اس کا دل ہمدردی اور رحم کے جذبات سے خالی نہیں ہے۔ بیٹھ جائیے آپ کھڑے کیوں ہیں اب تک؛

وہ بیٹھ گیا۔

زبیدہ چائے بنانے لگی ،...... پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ،

" آپ نے اپنا اسم شریف تو بتایا ہی نہیں ؟"

اس نے جواب دیا :" مجھے سلیم کہتے ہیں "

زبیدہ :۔ چائے لیجئے ۔

سلیم :۔ شکریہ ،

زبیدہ :۔ یہ لیجئے ، کیک اور پیسٹری کی بھی تو کچھ توجہ کیجئے ۔"

سلیم :۔ (کریم رول اٹھاتے ہوئے) شکریہ !

زبیدہ :۔ ہاں تو فرمائیے ، آپ نے کیسے زحمت فرمائی ، میں اگر آپ کی خدمت کر سکوں گی تو ضرور کروں گی ۔

سلیم :۔ میں گیت لکھ سکتا ہوں ، کہانی لکھ سکتا ہوں ، مکالمے لکھ سکتا ہوں ۔"

زبیدہ :۔ تو کیوں نہیں لکھتے ؛

سلیم :۔ اس لئے کہ ان کی مانگ نہیں ہے ۔"

زبیدہ :۔ یہ تو نہ کہئے ، سلیم صاحب ، فلم انڈسٹری میں اچھے مکالمے

لکھنے والوں کا قحط ہے، اچھی کہانیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں، او
اچھے گیت لکھنے والے تو عنقا ہیں۔ جب آپ کو ان چیزوں سے
دلچسپی ہے تو آپ ہمارے ملک کی فلمیں دیکھتے تو ہوں گے؟

سلیم:۔ جی ہاں، کبھی کبھی، جب جیب اجازت دیتی ہے۔

زبیدہ:۔ تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ مکالمے کتنے پھسپھسے ہوتے ہیں۔ کہان
کتنی بے جان اور وہ بھی زیادہ تر چرائی ہوئی ہیں۔ "گیتوں کا رنگ
کیا ہے؟

سلیم:۔ جی ہاں یہی محسوس کر کے تو میں نے اس طرف توجہ کی ہے۔

زبیدہ:۔ اگر آپ کی کہانیوں میں، مکالموں میں، گیتوں میں دم ہوگا تو آ
کو لوگ سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ فلم انڈسٹری فخر کرے گی آپ
آپ کی وضع قطع سے آپ کی پریشان حالی ظاہر ہے۔ بہت جلد آپ
لکھ پتی بن جائیں گے، آخر آپ میدان میں کیوں نہیں آتے۔

سلیم:۔ میرا کوئی پشت پناہ نہیں۔ کوئی میرا رہبر نہیں، نہ کوئی ذریعہ رکھتا ہو
نہ رسوخ، جہاں جاتا ہوں حقارت آمیز برتاؤ ہوتا ہے، مذاق اڑایا جا
جاتا ہے، طنز کیا جاتا ہے، کوئی یہ نہیں کہتا، اپنی کہانی دکھاؤ، اپنی مکال
نگاری کا نمونہ دکھاؤ۔ اپنے گیت دکھاؤ۔

زبیدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "پھر کیا کہتے ہیں؟
سلیم نے اپنے چہرے پر بیزاری کی کیفیت طاری کرتے ہوئے
جواب دیا۔

کہتے ہیں ، معاف کیجئے - ہمارے ہاں فی الحال کوئی جگہ نہیں - اپنا پتہ
ٹ کرا جایئے - جب ضرورت ہوگی اطلاع دی جائے گی -

زبیدہ اس نقل مطابق اصل پر کھلکھلا کہ ہنس پڑی ، پھر بولی -
آپ نے اپنی ایک خصوصیت کا تو ذکر بھی نہیں کیا ، آپ اداکار
ں بہت اچھے بن سکتے ہیں - "

یم :- ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو - لیکن میں اداکار بننا نہیں
چاہتا -

بیدہ :- یہ کیوں جناب ؟

لیم :- جو کچھ ہوں ، اسی کی کون سی قدر ہو رہی ہے ، جو کچھ بن سکتا ہوں
اس کی تیاری کس امید پہ کروں ؟ "

زبیدہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا -
آپ تو بہت زیادہ مایوس اور دل برداشتہ ہو گئے ہیں - "

لیم :- مجھے حیرت ہے کہ میں نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کر لی ؟

بیدہ :- ایسی باتیں نہ کیجئے -

لیم :- آپ کو یہی کہنا چاہیئے

بیدہ :- یہ کیوں ؟

لیم :- اس لئے کہ آپ جب چاہیں اور جو چاہیں اور جتنا چاہیں کہہ سکتی
ہیں -

بیدہ :- (متاثر ہو کر) اور آپ ؟

سلیم :- کیا آپ یقین کریں گی کہ پورے ۸۴ گھنٹے کے بعد، میں
کریم رول کھایا ہے اور چائے پی ہے ۔

زبیدہ :- (اور زیادہ متاثر ہو کر) آپ اس شہر کے رہنے والے
کہیں باہر سے آئے ہیں ؟

سلیم :- میں باہر سے آیا ہوں، آج تیسرا دن ہے مجھے آئے ہوئے
ہر کمپنی کا دروازہ کھٹکھٹایا، ہر پروڈیوسر کے در دولت پر حا
دی ۔ ہر ڈائریکٹر کے سامنے اپنے خدمات پیش کئے، مگر ہر طرف
انکار، ہر جگہ سے معذرت، جب اسٹیشن پہ اترا ہوں تو دو تین ر
تھے میری جیب میں اور اب وہ مدت کے ختم ہو چکے ہیں ۔

زبیدہ :- (ایک تبسم کے ساتھ) بڑے فضول خرچ ہیں آپ ؟...
تو بتایئے، قیام کہاں ہے آپ کا ؟

سلیم :- ایک سرائے میں ٹھہرا ہوں ...... اور آج وہاں سے ن
ابھی مل چکا ہے ۔

زبیدہ :- نوٹس کیسا ؟

سلیم :- یا تو حساب بے باق کر دو شام تک، ورنہ سارا مال و اسبا
ضبط ۔

زبیدہ :- یہ تو بڑی خطرناک دھمکی دی ہے کمبخت سرائے والے
چھکڑوں مال و اسباب تو ہو گا آپ کے ساتھ ؟

سلیم :- میرے مال و اسباب کا بھی عجیب حال ہے، میرے لئے وہ

قیمتی ہے، اور سرائے والے کو شاید اس سے وہ آنے بھی نہ مل سکیں لیکن جذبۂ انتقام کی تسکین ضرور کرے گا۔

زبیدہ :۔ وہ کیسے؟ آخر کیا ہے آپ کے پاس؟

سلیم :۔ بستر تو میرے پاس ہے نہیں، صرف ایک چادر ہے۔

زبیدہ :۔ اسی چادر کو ضبط کرنے کی دھمکی دے رہا ہے وہ؟

سلیم :۔ ایک ٹرنک بھی تو ہے

زبیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) تو یوں کہیے اس میں ضرور مال ہوگا۔

سلیم :۔ میری ساری کائنات، میرا سارا سرمایہ، میری زندگی کی پونجی میری کہانیاں، میرے گیت ہیں، بس یہی اوراق پریشان ہیں میرے پاس جو سرائے والے کے لئے ردی کے پرزے ہیں، اور میرے لئے۔

زبیدہ :۔ حاصل حیات؟

سلیم :۔ جی بیشک۔

زبیدہ :۔ اور اس کا مطالبہ کیا ہے؟

سلیم :۔ سات روپے بارہ آنے۔

زبیدہ :۔ کیا آپ نے اس سے یہ رقم قرض لی تھی؟

سلیم :۔ جی نہیں چھ روپے کرایہ کے اور ایک روپیہ بارہ آنے کھانے کا بل

زبیدہ :۔ اور جو تین روپے آپ کے پاس تھے وہ کہاں گئے؟

سلیم :۔ وہ دونوں روپے ہی صرف ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کوئی کمپنی ایسی نہیں ہے جہاں کئی دفعہ نہ گیا ہوں ۔

زبیدہ :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں!..... یہ بات ہے... تو تین دن میں آپ نے صرف ایک روپیہ بارہ آنے کا کھانا کھا ڈالا۔ غضب کیا۔

سلیم :۔ آپ تو بھول جاتی ہیں، صرف ایک دن کھایا۔ دو دن سے تو فاقہ کر رہا ہوں ۔

زبیدہ :۔ (افسردگی کے ساتھ) وہ واقعی میں بھول گئی تھی، اچھا اب کیا پروگرام ہے آپ کا ؟

سلیم :۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے، میں نے سوچا یہ ہے کہ دن تو ادھر ادھر کی امرگشت میں گذر جائے گا۔ کبھی اس در پر، کبھی اس آستانے پر، رہی رات وہ ریلوے اسٹیشن کے تھرڈ کلاس مسافر خانے میں بسر کر لوں گا۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اپنا ٹرنک وہاں سے لے آؤں۔ آپ مجھ کو سات روپے بارہ آنے قرض دیجئے ۔

زبیدہ :۔ واپس کب کریں گے آپ ؟

سلیم :۔ جب بھی ممکن ہوا۔ ویسے میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد از جلد اس بوجھ سے سبکدوش ہو جاؤں .... لیکن آپ قرضہ حسنہ سمجھ کر دیجئے، یعنی واپس نہ کر سکوں تو معاف کر دیجئے ۔

زبیدہ :۔ سات روپے بارہ آنے دیکر آپ اپنا ٹرنک تو لے آئیں گے لیکن اسے رکھیں گے کہاں ؟ کیا مسافر خانے میں ؟

سلیم :- جی نہیں، ٹرنک دو روپے تین آنے میں بک جائے گا، دو روپے
بارہ آنے کا ایک تھیلا خرید لوں گا - کاغذات اس میں آجائیں گے
باقی رقم کام آئے گی

زبیدہ :- ترکیب تو اچھی ہے -

سلیم :- تو کیا آپ یہ رقم مجھے دے دیں گی -

زبیدہ :- ارادہ تو ایسا ہی ہے، لیکن معاف کیجئے - روپے کا معاملہ ہے
ذرا غور کر لینے دیجئے -

سلیم :- جی ہاں، بہت اہم معاملہ ہے، خوب اچھی طرح غور کر لیجئے -

زبیدہ :- آپ تو خفا ہو گئے - آخر اس قدر جلد آپ بگڑ کیوں جاتے
ہیں -

سلیم :- نہیں یہ بات تو نہیں،

زبیدہ :- تو پھر مجھے غور کرنے کی تھوڑی سی مہلت کیوں نہیں دیتے "

سلیم :- وہی تو میں نے عرض کیا تھا - غور کر لیجئے اچھی طرح، میں کل حاضر ہو
جاؤں گا کسی وقت، یا کسی اور دن سہی -

زبیدہ :- آپ غلط سمجھے، میں فیصلہ آج ہی کروں گی - ابھی تھوڑی
دیر میں اتنی بھی مہلت نہیں چاہیئے مجھے ؛

سلیم :- بہت بہتر، تو میں بیٹھا ہوں -

زبیدہ :- شکریہ، یہی میں چاہتی تھی - (تھوڑے وقفہ کے بعد) اگر آپ
اجازت دیں تو میں ذرا اندر ہو آؤں -

سلیم :- شوق سے۔

زبیدہ :- ابھی واپس آ جاؤں گی دس پندرہ منٹ میں، بس گئی اور آئی۔

سلیم :- ضرور ضرور، مجھے بھلا کیا عذر ہو سکتا ہے؟ میں اطمینان سے بیٹھا ہوں، آپ شوق سے تشریف لے جایئے اور جتنی دیر میں چاہیئے اطمینان سے آیئے۔

زبیدہ سلیم کو وہیں چھوڑ کر تیر کی طرح باورچی خانے پہنچی، خانساماں سے پوچھا کھانا تیار ہے؟

وہ بولا، "سرکار، بس آدھ گھنٹہ میں تیار ہو جائے گا"

وہ بولی، "نہیں میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی، جو کچھ تیار ہے وہ نکال دو۔ ایک مہمان آئے ہیں، انہیں ابھی اور اسی وقت کھلانا ہے، !...... جلدی کرو۔ میرے سامنے نکالو، دیکھوں کیا کیا تیار ہے؟"

خانساماں نے جلدی جلدی مہمان کے لئے کھانا نکالا، ابھی کئی چیزیں نیم پخت تھیں، لیکن شامی کباب تیار ہو چکے تھے۔ قورمہ پک چکا تھا، مٹر پلاؤ اتارا جا چکا تھا، دھوئی ہوئی ماش کی دال بھی تیار تھی مٹی کے پیالوں میں شیر برنج جم چکی تھی۔ زبیدہ نے ان سب چیزوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا، "بس یہ سب چیزیں جلدی سے ڈرائنگ روم میں بھیج دو، فوراً، !"

جھینپ سے گئے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن کچھ نہ کہہ سکے، زبیدہ نے اپنے اوپر سنجیدگی کی مصنوعی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے یہ کام اب مجھے کرنا پڑے گا۔"

قاسم سیٹھ نے پوچھا "یعنی اب تم شاعری کرو گی؟"

وہ بولی۔ "پھر کیا کروں؟ کتنے دن سے شوٹنگ رکی ہے، آپ کا نقصان بھی نہیں دیکھا جاتا مجھ سے!"

میوزک ڈائریکٹر صاحب نے سوال کیا "تو پھر شروع کر دیجئے اپنا کلام آخر ہم بھی تو دیکھیں آپ کتنے پانی میں ہیں؟"

زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا، گنگنانے لگی، پھر اس نے سازندوں کو اشارہ کیا اور اس کی مدھری آواز فضا میں گونجنے لگی، سارے کمرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا، قاسم سیٹھ تصویر حیرت بنے اسے تک رہے تھے۔ میوزک ڈائریکٹر صاحب دم بخود تھے۔ اور شاد صاحب کا تو یہ حال تھا کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ بول سنانے کے بعد زبیدہ نے شریر نظروں سے قاسم سیٹھ کو دیکھا، اور پوچھا "کہیئے کیسا ہے یہ گیت؟"

قاسم سیٹھ نے جواب دیا۔ "بہت اچھا، بہت عمدہ!"

زبیدہ نے میوزک ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔ "میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ گویا ہوئے "تعریف نہیں ہو سکتی، خدا کی قسم بالکل ایسے ہی بول میں چاہتا ہوں۔ وہ چیز مل گئی جسے میرا دل تلاش کر رہا تھا، یہ بول ہیں؟ بالکل ایسا

یہ ہدایت دے کر وہ باہر آئی، سلیم اداس اور مضمحل، کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، زبیدہ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا، وہ بولی، مجھے دیر تو زیادہ نہیں ہوئی ؟"

سلیم نے جواب دیا، " بالکل نہیں، آپ تو ہوا کی طرح گئیں اور ہوا کی طرح آ گئیں ۔"

زبیدہ نے تبسم کناں ایک نظر اس پر ڈالی، اور کہا۔" آپ تو شاعر اور ادیب ہیں ۔"

وہ بولا ۔" میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ؟"

وہ کہنے لگی۔ آپ نے میرے بارے میں کہا " تم ہوا کی طرح گئیں اور ہوا کی طرح آ گئیں ۔"

سلیم نے قدرے گھبراتے ہوئے لہجہ میں کہا ۔

" لیکن یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو آپ کو گراں گذرتی ؟"

زبیدہ نے کہا " گراں تو نہیں گذری، لیکن آپ کے شاعر اور ادیب ہونے کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ آپ اس مفہوم کو ذرا شاعرانہ اور ادیبانہ طور پر ادا کرتے ۔"

سلیم نے پوچھا " وہ کس طرح ؟"

زبیدہ نے بتایا " اس طرح کہ باد صبا کی طرح گئیں اور نسیم سحر کی طرح واپس آ گئیں ۔"

یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، سلیم بھی مسکرانے لگا، پھر زبیدہ

نے کہا، "دیکھئے، باتوں باتوں میں شام ہو گئی اور مجھے ذرا دیر میں پھر اسٹوڈیو
جانا ہے شوٹنگ میں۔"

سلیم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا، "بہت شرمندہ ہوں کہ ناوقت
آپ کے پاس آیا۔ آپ تشریف لے جائیے اور مجھے بھی اجازت دیجئے"

زبیدہ بولی، "بہت بہتر"........ لیکن ذرا اندر تک تو آئیے"

سلیم زبیدہ کے ساتھ چلنے لگا پہلے یہ لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچے
ڈرائنگ روم کیا تھا، اپنی آرائش و زیبائش میں نگار خانہ تھا۔ سلیم کی تو آنکھیں
کھل گئیں یہاں کی سجاوٹ دیکھ کر۔ یہاں سے گزرتے ہوئے یہ لوگ ڈائننگ
روم میں پہنچے، یہاں دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا، ایک کرسی پر زبیدہ
بیٹھ گئی۔ دوسری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے سلیم سے
کہا "تشریف رکھئے۔"

قدرے تامل کے بعد وہ بھی بیٹھ گیا، پھر زبیدہ نے کہا "ماحضر موجود
ہے، تناول فرمائیے۔" مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے اور
سلیم صاحب، تکلف کی ضرورت نہیں، جو تیار تھا وہ آ گیا، آپ کو
بھی جلدی ہے اور مجھے بھی، ہم دونوں کو اس کام سے جلد فارغ ہو جانا
چاہئے۔"

سلیم انکار نہ کر سکا اور کھانا شروع کر دیا، دو دن کا بھوکا تھا، لہٰذا
کوشش کے باوجود تکلف نہ کر سکا، خوب ڈٹ کر کھایا، زبیدہ بھی
برابر اس کا حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ کھانے کے بعد زبیدہ نے پرس

سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جائیے سرائے والے کا حساب بیباق کر آئیے"

پھر اس نے ڈرائیور کو آواز دی، وہ حاضر ہوا، تو اس سے کہا۔

"جاؤ، صاحب کو سرائے لے جاؤ۔ اور وہاں سے ان کا سامان مع ان کے لے کر جلد از جلد واپس آؤ۔ کیونکہ مجھے اسٹڈیو جانا ہے۔" پھر وہ سلیم سے مخاطب ہوئی۔ "سلیم صاحب، آپ ایک شریف مہمان کی حیثیت سے یہیں میرے غریب خانہ پر قیام کریں گے، جب تک آپ کو کام نہ مل جائے، میرے قرض حسنہ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کام ملنے کے بعد سارا حساب سود در سود سمیت شوق سے بیباق کر دیجئے گا.... .... جائیے تشریف لے جائیے۔"

یہ باتیں زبیدہ نے کچھ ایسے فیصلہ کن لہجہ میں کہیں کہ سلیم چون وچرا نہ کر سکا۔ اور ڈرائیور کے ساتھ چپ چاپ روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد، ڈرائنگ روم کا عقبی کمرہ زبیدہ نے جلدی جلدی صاف کرا دیا۔ اور اپنے سامنے وہاں چارپائی بچھوائی، بستر لگوایا اور ملازمہ کو تاکید کی کہ میں اسٹڈیو میں ہوں یا گھر پر، تم سلیم صاحب کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا، انہیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہونے پائے، چائے، کھانا، ناشتہ ہر چیز وقت پر ملے۔ اگر ذرا بھی تکلیف ہوئی تو تمہاری خیریت نہیں، ملازمہ نے بسر و چشم تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا۔ اس اثناء میں سلیم صاحب لدے پھندے سرائے والے کا حساب بیباق کر کے تشریف لے

آئے ۔

زبیدہ نے پُرتپاک انداز میں خیر مقدم کیا ۔ تشریف لے آئے

آپ ؟"

سلیم :۔ جی ہاں ، آگیا ۔

زبیدہ :۔ سرائے والے کا حساب بے باق کر دیا ۔

سلیم :۔ جی ہاں کر دیا ۔

زبیدہ :۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ؟

سلیم :۔ جی نہیں ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی اس نوازش کا شکریہ کن الفاظ میں کروں ؟

زبیدہ :۔ کیا شکریہ ادا کرنے کی ابھی اسی وقت ضرورت ہے ؟ .....

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر بہت ضروری نہ ہو ، تو اسے کل پر اٹھا رکھئے کیونکہ اس وقت ، آپ بھی بہت تھکے ہوئے ہیں اور میں بھی اسٹیڈیم جانے کے لئے پا بہ رکاب ہوں ، اب تو تبادلۂ خیال اور گفتگو کا موقع ملتا ہی رہے گا .... اجازت ہے ، میں جاؤں ؟

اس گفتگو سے سلیم سٹ پٹا گیا ، اس نے کہا ۔" جی ہاں ، شوق سے تشریف لے جایئے ۔"

زبیدہ نے کہا ۔" بہت بہت شکریہ !"

اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی ۔ اس کے جانے کے بعد سلیم اپنے آراستہ پیراستہ کمرہ میں پہنچ گیا ۔ یہاں کا سازو سامان اور آرائش دیکھ کر دہ...

دنگ رہ گیا، وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر یہاں صرف سات روپے بارہ آنے مانگنے آیا تھا۔ لیکن نہ صرف اسے سات روپے بارہ آنے مل گئے بلکہ ایک شاندار مہمان خانہ بھی میسر آ گیا۔ جس کی وہ ذرا بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

شکم سیر ہو کر کھانے کے بعد سگریٹ کے لئے طبیعت بے انتہا مچل رہی تھی، لیکن جیب خالی تھی، اور یہ مناسب نہ تھا کہ وہ زبید سے سگریٹ کی فرمائش کرتا، یہ محرومی آسائش کے جدید سامان پر غالب آ گئی، افسردگی کے عالم میں وہ بستر پر پہنچا، اور یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اعلےٰ درجے کے سگریٹ کا ایک ٹن بستر کے قریب ہی.... ایک تپائی پر رکھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔

---

(۱۳)

نئی آفت

بہت دنوں کے بعد آج سلیم اطمینان کی گہری نیند سویا تھا۔ وہ اس دن
میں بالکل اکیلا تھا۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن، نہ عزیز نہ رشتہ دار
نہ دوست نہ ساتھی، وہ کچھ عجیب قسم کا لاابالی سا آدمی تھا، کالج کے ہونہ
لڑکوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یونین کے ایک جھگڑے میں پرنسپل سے ٹھن
گئی۔ کالج چھوڑ دیا۔ باپ نے مرتے وقت کافی نقد روپیہ کے ساتھ سلیم کا ہا
اپنے بچپن کے ایک دوست اور ہم نشین اختر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا
اختر صاحب خود بھی معقول اور شریف آدمی تھے، اگر سلیم کے باپ نے کچھ روپیہ
نہ چھوڑا ہوتا تو بھی وہ اپنی گرہ سے اسے تعلیم دلاتے۔ اور اس کی راحت و آسا
کا خیال رکھتے، اور اب تو جو کچھ صرف ہو رہا تھا۔ وہ گویا اسی کا تھا۔ ممنونیت اور
احسان کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لیکن سلیم ان سے بھی روٹھ گیا۔ اور ایسا روٹھا کہ

ایک بیگ کاغذات کا پلندہ سنبھالا اور ایک نامعلوم منزل کی سمت چل کھڑا
ہوا۔ اب نہ اسے روپے کی پروا تھی، نہ راحت و آرام کی، بات یہ ہوئی کہ
اختر صاحب کی ایک لڑکی تھی ماہ پارا، صورت و شکل کی اچھی خاصی تھی، انٹرنس
تک کی تعلیم یافتہ، دولت مند باپ کی مغرور بیٹی،........ اختر صاحب سلیم کا
بہت مان رکھتے تھے۔ ان کی بیوی بھی اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں، خود ماہ پارہ بھی
اس کے ساتھ اخلاق و تپاک کا برتاؤ کرتی تھی۔ لیکن اس کے طرزِ عمل میں احساس
برتری جھلکتا ہوا سلیم نے محسوس کر لیا تھا، اس لئے وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا
تھا۔ پھر ہوا یہ کہ اختر صاحب نے طے کر لیا کہ ماہ پارہ کی شادی سلیم کے ساتھ
کر دیں گے اس سے اچھا لڑکا ان کی نظر میں کوئی نہ تھا۔ بیوی بھی بڑی خوشی سے
رضامند ہو گئیں، ماہ پارہ نے یہ خبر جا سنا، تیوری چڑھائی اور مسکرا کر خاموش ہو گئی
سلیم صاحب کے سمع مبارک تک یہ خبر پہنچی تو وہ لاپتہ ہو گئے، انہوں نے اپنے
دل سے کہا، ایسی بر خود غلط اور متکبر لڑکی کے ساتھ میں ایک دن
بھی گزارہ نہیں کر سکتا۔ یہ باپ کی دولت پہ ہمیشہ اترائے گی۔ اور مجھے
کمتر سمجھے گی۔ پھر اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے روپیہ کا خیال آیا۔
ا فیصلہ کر لیا، اختر صاحب نے اتنی شفقت سے مجھے اپنے پاس
ا ہے، یہ اس کا معاوضہ ہو گیا۔ میں اپنے دست و بازو کی مدد سے
ں زیادہ رقم کما لوں گا، کیوں محتاجوں کی طرح باپ کے چھوڑے ہوئے
پے پر تکیہ کر لوں۔

یہی سب سوچتا ہوا، سلیم یہاں پہنچا، واقعی وہ کہانی بڑی اچھی لکھتا تھا،

متعدد رسالوں میں تعریفی نوٹ کے ساتھ اس کی کہانیاں چھپ
تھیں ۔ مکالمے تو اتنے رواں ، برجستہ اور شگفتہ ہوتے تھے کہ تعریف
ہو سکتی ، گیت بھی لکھتا تھا اور خوب لکھتا تھا ۔ خیال تھا ، فلم انڈ
میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر تہلکہ مچا دے گا ۔ لیکن جب
یہاں پہنچا تو فضا ہی دوسری تھی ، کسی فلم والے نے سیدھے منہ بات
کی ۔ جہاں گیا صاف جواب ، ساری حوصلہ مندی رکھی رہ گئی ۔ کسی نے
نہ کیا کہ کہانی سن لیتا ، ایک ادھ مکالمہ ہی سن لیتا ۔ جو یہ سوچ کر آیا تھا کہ د
فلم میں انقلاب برپا کر دوں گا ، وہ سرائے والے کا مقروض ہو کر زیور
پر مجبور ہو گیا تھا ۔ .... ۔ اگر زبیدہ مدد نہ کرتی تو دا
خودکشی کر لینا پڑتی ، اگر یہ معلوم ہوتا تو شاید وہ ماہ پارہ سے شادی کرنے
اختر صاحب کا داماد بننے پر رضامند ہو جاتا ، لیکن اب موقع ہاتھ
نکل چکا تھا ، اب کس منہ سے وہ اختر صاحب کا ، ان کی بیوی کا اور ماہ
کا سامنا کر سکتا تھا ۔

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ مہمانداری کب تک ہوگی ۔ فلم میں تو کام ملنے
رہا ، پھر کیا ہوگا ؟ .... وہ یہی سوچ رہا تھا کہ زبیدہ آئی اسے دیکھ
سلیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ، اسے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا ۔ زب
نے ایک تبسم نظر اس پر ڈالی اور پوچھا ۔

" کہیئے مزاج کیسا ہے ؟ "

سلیم :۔ خدا کا شکر ہے ، بہت اچھا ہوں ۔

زبیدہ :- کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ؟

سلیم :- بالکل نہیں -

زبیدہ :- ناشتہ کر لیا آپ نے ؟

سلیم :- جی ہاں ، دیر ہوئی -

زبیدہ :- تو پھر آپ سے ایک کام ہے کر دیں گے ؟

سلیم :- بڑے فخر اور مسرت سے ارشاد فرمایئے

زبیدہ :- آج کل جس نئی فلم میں کام کر رہی ہوں - اس کا نام ہے ... "سہاگ ...."

سلیم :- لاحول ولاقوۃ ، نہایت مہمل نام ہے .... خیر پھر -

زبیدہ :- ہیرو ، ہیروئن کو پہلے اغوا کرتا ہے ، پھر ایک غیر شہر میں دھوکا دیکر تنہا چھوڑ کر خود چلا جاتا ہے -

سلیم :- تو مجھ سے آپ کیا کام لینا چاہتی ہیں ؟ کیا اسے تلاش کرلاؤں ؟

زبیدہ : (ہنستے ہوئے) نہیں ، ایسے خراب آدمی کو تلاش کرنا بھی کوئی اچھا کام نہیں ، اس موقعہ کے لئے ایک پھڑکتا ہوا گانا چاہیئے - جو آڈینس کا دل ہلا دے .... کیا آپ یہ کام کر سکیں گے ؟

سلیم :- امید تو ہے -

زبیدہ :- لیکن کب ؟ .... ہمیں بڑی جلدی ہے -

سلیم :- آپ اتنی فکر مند کیوں ہیں ؟ فکر تو کمپنی کے مالک کو ہونی چاہیئے - کیا کمپنی میں نغمہ نویس نہیں ہے ؟

زبیدہ :- ہے تو، اس نے گانا لکھا بھی اور کئی بار بدل بدل کر لکھا...
کوئی بھی پسند نہیں آیا، نہ مجھے، نہ میوزک ڈائریکٹر کو

سلیم :- اگر میوزک ڈائریکٹر بھی آپ کے ساتھ متفق ہے، تو وہ میرا گا...
پسند نہیں کریگا۔

زبیدہ :- ایسا نہیں ہوگا، اگر اچھا ہوا تو ضرور قبول کرلے گا اور آپ کو...
بھی دیا جائے گا۔ . . . . . ایک گانے کے سو روپے دیتے ہیں ہر...

سلیم :- وہ تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن مجھے حیرت ہے، آپ کیوں دلچ...
لے رہی ہیں۔ گانا اچھا ہو یا برا، آپ کو کیا؟

زبیدہ :- یہ بھی اچھی کہی، ہیروئن ہی ہی تو ہوں۔

سلیم :- اوہو تو آپ کو دھوکا دے کر بھاگے ہیں ہیرو صاحب۔ . . .
تعجب ہے، دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

زبیدہ :- (تیوری چڑھا کر، ذرا سخت لہجہ میں) سلیم صاحب ذرا ہوش...
رہیئے۔ . . . . مختصر الفاظ میں جواب دیجئے۔ کیا آپ یہ کا...
سکتے ہیں یا نہیں؟"

سلیم :- کر سکتا ہوں،

زبیدہ :- میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی، اپنے بارے میں آپ نے جو کچھ...
ہے، سچ کہا ہے یا گپ؟ اگر واقعی آپ شاعر ہیں، اور ہیں تو ثبو...
ثبوت دیجئے۔

سلیم :- بہتر ہے، تھوڑا سا موقعہ دیجئے، میں یہ کام ضرور کردوں گا۔

زبیدہ :۔ آپ باتیں زیادہ کرتے ہیں، اور جو شخص زیادہ باتیں کرتا ہے اسے اپنے الفاظ میں پچھتانا پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہتر یہ ہے کہ ایسا موقع نہ آنے دیجئے" ۔

یہ کہہ کر زبیدہ چلی گئی اور سلیم گم سم کھڑا رہ گیا، وہ دل میں بہت نادم اور شرمند تھا کہ اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکل گئے جو زبیدہ کو بُرے لگے۔ واقعی اسے حدِ آداب میں رہنا چاہیئے تھا ۔ چپ چاپ اپنے بستر پر دراز ہو گیا ، دوپہر کے کھانے کے وقت تک بیٹھا یونہی کروٹیں بدلتا رہا ۔ بار بار زبیدہ کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے ۔ پھر کھانا آیا جو بڑے مزے کا تھا ۔

لیکن موڈ بگڑ چکا تھا ، چند لقمے کھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بستر پر آکر دراز ہو گیا ۔ وہ بار بار دماغ کو یکسو کرنے اور طبیعت کو گیت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا ، لیکن زبیدہ کے تند و تلخ الفاظ اسے یاد آجاتے تھے اور وہ کھو سا جاتا تھا ۔

(۱۴)
عجیب آدمی

سلیم کا سارا دن اسی بے کلی میں گزر گیا۔ رات کو زبیدہ کا فون آگیا، وہ دیر سے آئے گی، اس کا انتظار نہ کیا جائے، گھر کے سب لوگ کھا پی کر سو رہے، سلیم صاحب بھی اپنے گوشۂ تنہائی میں بستر پر آکر دراز ہو گئے۔ نہ جانے کب تک جاگتے رہے، اور کب سوئے، سوئے بھی یا نہیں۔ ... صبح بہرحال وہ دیر تک سوتے رہے، زبیدہ نے ناشتہ اپنے کمرے ہی میں کیا تھا، ناشتہ کے بعد وہ اوپر آئی، تو آپ فرار ہے تھے، خادمہ سے اس نے کہا، یہ جب جاگیں تو میرے کمرے میں بھیج دینا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اور مختلف قدیم و جدید شاعروں کے دیوان الٹنے پلٹنے لگی، فلم کی شوٹنگ اس گیت کے مرحلے پر آکر رک گئی تھی، رات کو بھی کمپنی کے شاعر صاحب نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ مگر سچویشن کے مطابق

شعر بھی نہ کہہ سکے، اس لئے رات کو بڑی دیر سے زبیدہ کی واپسی ہوئی، صبح اٹھی تو پھر یہی خیال غالب آیا، آج کیا ہو گا؟ کیا شوٹنگ آج بھی ملتوی رہے گی؟ سلیم صاحب محوِ استراحت تھے، کچھ پتہ نہیں انہوں نے فکرِ سخن کی یا نہیں اور بڑی دیر تک دواوین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ اتنے میں دروازے پہ آہٹ محسوس ہوئی نظر اٹھا کر دیکھا تو سلیم صاحب کھڑے تھے۔ چہرے کی بشاشت کافور تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہری سوچ میں ہیں۔ زبیدہ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

آئیے سلیم صاحب، تشریف رکھئے!

سلیم ایک بے جان مجسمہ کی طرح خاموش بیٹھ گیا۔

زبیدہ :۔ کہئے کچھ ہوا؟

سلیم :۔ شاید آپ گیت کے بارے میں دریافت کر رہی ہیں؟

زبیدہ :۔ جی، میرا خیال تو یہی ہے۔

سلیم :۔ میں نے چند اشعار کہے تو ہیں۔

زبیدہ :۔ تو پھر سنائیے، نیکی اور پوچھ پوچھ۔

سلیم :۔ لیکن ایک شرط ہے میری۔

زبیدہ :۔ جی نہیں، میں کوئی شرط نہیں مان سکتی، بغیر کسی شرط کے اگر آپ سنا سکتے ہیں تو شوق سے سنائیے۔

سلیم :۔ شاید آپ اب تک خفا ہیں۔

زبیدہ :۔ نہیں، خفگی اور خوشی کا کوئی سوال ہی نہیں۔

سلیم :- میں چاہتا تھا، آپ میری کل کی غلطی فراموش کر دیتیں۔

زبیدہ :- یہی تھی آپ کی شرط ؟

سلیم :- جی ہاں۔

زبیدہ :- (خفیف سے تبسم کے ساتھ) بہت بہتر، میں نے آپ کا کہ
مان لیا۔

سلیم :- تو پھر میں مطمئن ہو جاؤں۔

زبیدہ :- اگر کہیے تو تحریر کر دوں .... دیکھیے آپ پھر خواہ
کی بات کرنے لگے

سلیم :- بس آپ کا اتنا کہہ دینا کافی ہے۔

زبیدہ :- تو آپ نے وہ گیت لکھ دیا ؟

سلیم :- جی ہاں، کیا سناؤں ؟ یا آپ خود پڑھ لیں گی ؟

زبیدہ :- اگر آپ گا کر سنا سکتے ہوں تو سن لوں گی ورنہ یہی بہتر ہے
خود پڑھ لوں۔

سلیم :- گانا تو مجھے نہیں آتا۔

زبیدہ :- تو لائیے میں ہی پڑھ لوں گی - لیکن آپ شاعر ہو کر نے
نہیں جانتے ؟

سلیم :- جی نہیں۔

زبیدہ :- ہماری کمپنی کے شاد صاحب لہرا لہرا کر ایسا گاتے ہیں کہ بس د
اور سنا کرے کوئی۔

سلیم :- وہ مجھ سے زیادہ قابل ہوں گے!

زبیدہ :- اچھا تو کہاں ہے وہ آپ کا گیت؟

سلیم :- (جیب سے کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) یہ رہا۔

زبیدہ نے وہ کاغذ لے لیا۔ ایک نظر میں اسے پڑھ گئی پھر اس کے چہرے پر خوشی کی چمک پیدا ہوئی، پھر وہ سلیم کے وجود سے بے تعلق ہو کر گنگنانے لگی۔ پھر اس نے ایک خاص لے اور دھن کے ساتھ گانا شروع کیا، آخری مصرع جب گا چکی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے وہ اشعار دوبارہ گائے جب گا چکی تو سلیم سے پوچھا۔

"کہیے کیا رائے ہے؟"

سلیم :- میں تو آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

زبیدہ :- اپنے گیت کے بارے میں؟

سلیم :- جی ہاں،

زبیدہ :- کیا آپ نے سنا نہیں وہی اشعار تو میں گا رہی تھی..... سچ سلیم صاحب، بڑے اچھے شعر کہے ہیں آپ نے، میرا خیال ہے، اس فلم میں آپ کا یہ گانا ہٹ جائے گا۔

سلیم :- خیال تو میرا بھی یہی تھا، لیکن آپ کے کہنے سے یقین ہو گیا۔

زبیدہ :- آپ شعر کس طرح کہتے ہیں۔

سلیم :- سوچ سوچ کر۔

زبیدہ :- صورت سے تو بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ اچھے شعر کہہ سکتے ہیں۔

آپ : میرے ہاں نہ ٹھہرے ہوتے تو میں سمجھتی کہ کہیں سے چرا لئے ہیں آ

سلیم :۔ یہ تو آپ اب بھی سمجھ سکتی ہیں، بھلا کوئی کسی کی زبان روک سکا ہے

زبیدہ :۔ نہیں سلیم صاحب یہ نہ کہیئے، آپ بڑے اچھے آدمی ہیں، اور
شاعر ہیں۔ آپ نے جی خوش کر دیا، طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ (سو کا نو
بڑھاتے ہوئے) لیجئے، یہ میری طرف سے نذرانہ ہے کمپنی کی طرف
آپ کو الگ معاوضہ ملے گا۔

سلیم :۔ شکریہ کمپنی کی طرف سے جو معاوضہ ملے گا۔ میں اسے شکریے کے
قبول کر لوں گا۔ لیکن آپ سے کچھ نہیں لے سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔

زبیدہ :۔ یہ کیوں؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

سلیم :۔ زیادہ اصرار نہ کیجئے، ورنہ مجھے صدمہ ہو گا۔

(زبیدہ نے نوٹ رکھ لیا اور اٹھتے ہوئے کہا۔

"واقعی بڑے عجیب آدمی ہیں آپ!"

(۱۵)

بہ سر و چشم

زبیدہ خوشی کا جھولا جھولتی کمپنی پہنچی اور سیدھی میوزک ڈائریکٹر کے کمرے میں گھس گئی۔ وہ قاسم سیٹھ بھی موجود تھے اور کمپنی کے تنخواہ دار شاد صاحب بھی جلوہ افروز تھے لیکن بہت افسردہ اور مضمحل معلوم ہوتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میوزک ڈائریکٹر اور قاسم سیٹھ دونوں نے مل کر خوب خوب خبر لی ہے بے چارے کی۔ زبیدہ نے شاد صاحب سے پوچھا "کہیئے کچھ اور کوشش کی آپ نے ؟"

انہوں نے منہ لٹکا کر جواب دیا "جی ہاں، کی تو، لیکن قاسم سیٹھ نے جملہ پورا کر دیا" بات کچھ بنی نہیں "میوزک ڈائریکٹر صاحب بھی جلے بھنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس مصرعہ پر گرہ لگائی "بھائی، بات یہ ہے کہ یا شاعری کر لو یا عاشقی، دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں! شاعر صاحب بیچارے

معلوم ہوتا ہے کسی نے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔ ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں کیا جاسکتا۔ سچ کہتا ہوں، یہ گیت ہماری فلم کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔"

زبیدہ نے ایک نگاہ غلط انداز شاہ صاحب پر ڈالی، کیوں صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟

بیچارے نے پہلو بدلتے ہوئے بہت غمگیں لہجہ میں کہا "یہ بے شک بڑا اچھا گیت ہے، تعریف نہیں ہوسکتی اس کی۔"

قاسم سیٹھ:۔ بھئی غضب کا گیت ہے۔

زبیدہ:۔ شکریہ .... لیکن خالی خولی الفاظ سے کام نہیں چلے گا، جیب کی طرف ہاتھ بڑھایئے۔"

قاسم سیٹھ:۔ کیا مطلب؟

زبیدہ:۔ مطلب یہ کہ اس گیت کے پانچ سو روپے دینا ہوں گے آپ کو،

قاسم سیٹھ:۔ پانچ سو سہی، لیکن یہ ہے کس کا؟

زبیدہ:۔ ایک گمنام شاعر کا۔

قاسم سیٹھ:۔ ہمیں گمنام اور نامور سے کوئی بحث نہیں، ہمارا کام بن گیا اور منہ مانگے دام دینے میں ہمیں کوئی تامل نہیں .... لیکن وہ شاعر ہیں کہاں؟

زبیدہ:۔ وہ میرے مہمان ہیں، میرے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، چلئے آپ کو درشن کرادوں ان کے!

قاسم سیٹھ :- ضرور چلیں گے، ایسا آدمی تو اپنے کام کا ہے۔

زبیدہ :- وہ کہانی بھی بڑی اچھی لکھ لیتے ہیں، اور مکالمے تو ایسے لکھ
ہیں کہ کیا کوئی ان کی برابری کر سکے گا۔

قاسم سیٹھ :- لیکن یہ حضرت اب تک چھپے ہوئے کہاں تھے؟

زبیدہ :- آرٹسٹ لوگ روپے پیسے کے لوبھی نہیں ہوتے، ناک پر مکھی
نہیں بیٹھنے دیتے، آن پر مرتے ہیں، کسی کی پروا نہیں کرتے، بڑی منت
سے یہ حضرت قابو میں آئے ہیں، شاید آئندہ بھی کچھ کام دے سکیں

قاسم سیٹھ :- ضرور ضرور، ان کی کہانی بھی سننا چاہیئے اور اگر اچھی ہوئی تو
ہماری اگلی فلم وہی ہوگی۔

زبیدہ :- دیکھا جائے گا.... میوزک ڈائریکٹر صاحب سے مخاطب
ہو کر، تو یہ گانا منظور ہے سیٹھ؟

قاسم سیٹھ :- ہاں بھئی بالکل منظور، الجھنی والے شاعر سے مخاطب ہو کر
دیکھ لیا آپ نے۔ کام کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔"

شاد صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شرم و ندامت سے گردن
جھکا لی اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

ایک گانا نہ لکھ سکنے پر یہ ہنگامہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل ساری فلم
کے گانے میں نے لکھے اور وہ بے انتہا پسند بھی کئے گئے، اس کا ذکر نہیں

زبیدہ نے میوزک ڈائرکٹر سے کہا۔ "تو پھر اس گیت کی دھن بنا ڈالیے تاکہ جلدی سے کام شروع ہو سکے!"

انہوں نے جواب دیا، "دھن تو تم خود بنا کر لائی ہو، یہی ٹھیک رہے گی۔ ریہرسل کر لو۔ کل سے باقاعدہ کام شروع ہو جائے گا۔"

زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی، "تو پھر قاسم سیٹھ، چلتے ہیں آپ ہمارے ساتھ، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بڑی آمادگی اور مستعدی کے ساتھ فرمایا بسر و چشم!"

---

(١٦)

ہدیۂ ناچیز

قاسم سیٹھ زبیدہ کے ساتھ اس کے گھر پہنچے، زبیدہ نے
سے کہا "جاؤ، سلیم صاحب کو بلا لاؤ۔"

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ سلیم صاحب نمودار ہوئے...... ایک
بے پروایانہ شان سے سیٹھ صاحب نے نیچے سے اوپر تک ایک نظر ڈال
اپنے چہرہ پر حیرت کی کیفیت طاری کرتے ہوئے فرمایا۔ "انہی نے وہ گیت
لکھا ہے؟"

زبیدہ مسکرائی، "تو کیا آپ سمجھتے ہیں، کسی سے لکھوا لائے
...... جی ہاں، یہی ہیں وہ!" پھر سلیم صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کھڑے
کیوں ہیں، تشریف رکھئے!" سلیم بیٹھ گیا، قاسم نے سگریٹ سلگاتے
ہوئے کہا۔

"آپ نے غضب کا گیت لکھا ہے!"

سلیم :- نوازش ہے آپ کی، ورنہ میں کس قابل ہوں؟

قاسم سیٹھ :- نہیں، آپ بہت قابل ہیں۔

سلیم :- قابل ہوتا تو آپ کے دروازے مجھ پر بند نہ ہوتے۔

قاسم سیٹھ :- واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، آپ جیسے آرٹسٹوں اور فن کاروں کو تو ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں، ہم آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

سلیم :- لیکن شاید آپ بھول گئے کہ میرے ساتھ کیا سلوک کر چکے ہیں۔

قاسم سیٹھ :- میں تو کبھی آپ سے ملا بھی نہیں۔

سلیم :- جی ہاں آپ کو یاد نہ ہو گا، لیکن مجھے یاد ہے۔ اور وہ یاد میری زندگی کی بڑی قیمتی پونجی ہے۔

زبیدہ :- واقعی ملے تھے آپ سیٹھ صاحب سے؟

سلیم :- جی ہاں، ملا تھا، اور انہوں نے حقارت کی ایک نظر ڈال کر فرمایا تھا "ایسے ایسے نہ جانے کتنے شاعر اور فسانہ نگار جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ ہم نے کوئی یتیم خانہ کھول رکھا ہے؟ جائیے، تشریف لے جائیے"

زبیدہ :- واقعی........ کیوں سیٹھ صاحب آپ ایسے ہیں؟

قاسم سیٹھ :- (جھینپتے ہوئے) مجھے تو بالکل یاد نہیں،

سلیم :- نہ یاد ہو گا، لیکن میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

زبیدہ :- (مسکراتے ہوئے) اتنا زیادہ انتقامی جذبہ اچھا نہیں ہوتا۔ اب معاف

کر دیجئے۔

سلیم :۔ آپ نے تو مجھ پر احسان کیا ہے، آپ کیوں مجھ سے معافی مانگتی ہیں!

زبیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) مجھے نہیں .... سیٹھ صاحب کو معاف کر دیجئے

سلیم :۔ لیکن انہوں نے تو معافی نہیں مانگی۔

قاسم سیٹھ :۔ (کانوں تک ہاتھ لے جا کر) اچھا بابا، ہم معافی مانگتے ہیں، اپنی بھول ہوئی ہم سے۔ معاف کر دو۔ اب کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔

زبیدہ :۔ (سفارشی لہجے میں) بس اب معاف کر دیجئے۔ دیکھئے اتنا بڑا آدمی معذرت کر رہا ہے آپ سے!

سلیم :۔ یوں کہئے کہ ایک بڑا دولت مند ایک بڑے فن کار سے معذرت کر رہا ہے!

زبیدہ (ہنستے ہوئے) اچھا یہی سہی .... آپ ہیں بڑے دلچسپ آدمی!

قاسم سیٹھ :۔ واقعی بڑے دلچسپ۔

سلیم :۔ اور نہایت بدبخت بھی،

زبیدہ :۔ نہیں ایسی باتیں نہ کہئے۔ آپ بڑے اچھے آدمی ہیں ..... سیٹھ صاحب، سلیم صاحب کو ان کے گیت کا معاوضہ دیجئے۔

قاسم سیٹھ :۔ وہ تو میں لے کر آیا ہوں (جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر) یہ حقیر نذرانہ قبول کیجئے۔

سلیم نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لئے۔ پھر قاسم سیٹھ نے کہا میں

نے سنا ہے، آپ کہانی بھی لکھتے ہیں؟ کیا واقعی؟

سلیم نے جواب دیا، جی ہاں لکھتا ہوں! میرا شغل ہی یہ ہے۔"

زبیدہ نے کہا۔ تو پھر سنائیے کوئی کہانی، ہمیں ایک اچھی کہانی کی ضرورت بھی ہے۔"

قاسم سیٹھ:۔ ہاں سلیم صاحب، بڑی ضرورت ہے ہم کو، ہم فوراً ہی دوسری فلم شروع کرنا چاہتے ہیں۔

سلیم اپنے کمرے میں کاغذات کا پلندہ لینے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سیٹھ صاحب نے زبیدہ سے کہا۔" دماغ کی چولیں کچھ ڈھیلی معلوم ہوتی ہیں۔"

زبیدہ ہنسنے لگی، اس نے کہا۔" ہاں، انہیں کا نہیں، ہر آرٹسٹ کا یہی حال ہوتا ہے۔

قاسم سیٹھ نے مشورۃً پوچھا، آدمی کام کا معلوم ہوتا ہے؟"

زبیدہ نے جواب دیا "میرا بھی یہی خیال ہے!"

قاسم سیٹھ:۔ تمہیں کیسے مل گیا یہ؟

زبیدہ:۔ بس اتفاق سمجھئے، پہلے تو میں نے بھی آپ کی طرح اسے دھتکار ہی دیا تھا۔ لیکن پھر رحم آ گیا، ٹھہرا لیا اپنے ہاں، فلم کی جس سچویشن پر ہم رک گئے تھے، اس کے گانے کی فرمائش کی اور دیکھ لیجئے، کیسا گیت لکھ ڈالا ظالم نے۔

اتنے میں سلیم بہت سے کاغذات لئے ہوئے واپس آ گیا، اس نے پوچھا

کیا کوئی ایسی رومانی کہانی آپ پسند کریں گے جو ہمارے واقعات سے تعلق رکھتی ہو، یعنی جو واقعات اکثر ہمارے گھروں میں پیش آتے رہتے ہوں ؟"

قاسم سیٹھ نے بڑی مستعدی سے جواب دیا، ہاں بالکل ایسی انگریزی کی چرائی ہوئی کہانیوں سے تنگ آچکا ہوں۔"

سلیم صاحب نے ایک کہانی سنائی، قاسم سیٹھ اور زبیدہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے، وہ ایک داستان گو کی طرح روانی اور جوش کے ساتھ اپنی کہانی سنا رہا تھا، دونوں ہمہ تن اشتیاق بنے سن رہے تھے۔ جب وہ آخری صفحہ سنا چکا تو سیٹھ صاحب نے اپنے زانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کمال ہے بھئی، یہ کہانی تو قیامت کی ہے۔"

زبیدہ مسکراتی ہوئی بولی "میرے انتخاب کی داد دیجئے، گودڑی میں لال نکال کر میں نے پیش کر دیا ہے۔ آپ کی خدمت میں۔"

قاسم سیٹھ :۔ ہاں بھئی بے شک یہی بات ہے، واہ سلیم صاحب واہ

زبیدہ :۔ خالی خولی تعریف سے کیا ہوتا ہے، یہ تو بتائیے، کہانی لینا ہے یا نہیں ؟

قاسم سیٹھ :۔ ضرور لینا ہے بھئی .... سلیم صاحب میری ایک تجویز ہے۔

سلیم :۔ فرمایئے۔

قاسم سیٹھ :۔ ہم آپ سے سال بھر کا اگریمنٹ کر لیتے ہیں، کیوں جناب

منظور ہے آپ کو ؟

سلیم :۔ سوچ کر جواب دوں گا ۔

زبیدہ :۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ؟

سلیم :۔ میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں ۔

قاسم :۔ زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا، ہم آپ کو پانچ سو روپے ماہوار دیں گے اور کام بھی کچھ زیادہ آپ کو نہیں کرنا پڑے گا ۔

سلیم (زبیدہ کی طرف دیکھ کر) جیسا آپ کہیئے ۔

زبیدہ :۔ ٹھیک ہے، مان لیجئے،

سیٹھ صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا، تو کل انہیں اپنے ساتھ لیتی آنا اسی وقت ایگریمنٹ ہو جائیگا۔ کیوں سلیم صاحب، ٹھیک ہے نا ؟

سلیم :۔ میں نے تو یہ معاملہ میں زبیدہ پر چھوڑ دیا ہے ۔

زبیدہ :۔ اگر یہ بات ہے تو سیٹھ صاحب سلیم صاحب کو پانچ سو نہیں چھ سو ماہوار دیں گے ۔

قاسم سیٹھ :۔ اچھا بھئی، یہی سہی .... مجھے تو خوشی ہے کہ جو کچھ بجا کہیئے !"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک گونجتا ہوا قہقہہ لگایا اور چلے گئے ۔ ان کے جانے کے بعد زبیدہ نے سلیم سے کہا " کہیئے تو آپ خوش ہوئے؟ اب تو آپ کی دلی مراد پوری ہوئی ؟"

سلیم :۔ وہ تو اسی وقت پوری ہو گئی تھی ۔ جب میں نے آپ کے آستانے

پر قدم رکھا تھا۔ آپ اگر مجھے سہارا نہ دیتیں، میرے ساتھ شرافت اور انسانیت کا برتاؤ نہ کرتیں، میری بے بسی اور بے چارگی پر رحم نہ کھاتیں، میری غربت اور پریشان حالی کا مداوا نہ کریں تو آج میں کہاں ہوتا؟

یہ کہتے کہتے سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے دل دہی اور تسلی کے لہجے میں کہا، سلیم صاحب اپنے اوپر قابو رکھیئے، آپ بہت بڑے فنکار ہیں۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ میں آپ کی کسی حد تک خدمت نہ کر سکی اور میری کوشش یہ ہو گی کہ ہمیشہ آپ کی خدمت کر سکوں!"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ زبیدہ دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ سلیم وہاں سے اٹھا، اپنے کمرے میں آگیا، اچکن پہنی، اور باہر نکل گیا۔ وہ شہر کے سب سے بڑے اور بارونق بازار میں پہنچا۔ اور مختلف دوکانوں کے چکر کاٹنے لگا کبھی یہاں کبھی وہاں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خاص چیز کی جستجو ہو اور وہ مل نہ رہی ہو۔ آخر وہ "سلک ایمپوریم" میں پہنچا اور وہاں کا جائزہ لینے لگا، سامنے ایک ساڑھی شوکیس میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی، قیمت پوچھی تو پورے پانچ سو۔ نوابانہ شان کے ساتھ سلیم نے پانچ نوٹ نکالے اور دوکاندار کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ فوراً وہ پیک ہو کر آگئی۔ سلیم اتنی جلدی میں تھا کہ کیش میمو کی طرف توجہ نہ کی، اور بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔ جیب میں اتنے پیسے نہ تھے کہ تانگہ یا رکشا کر سکتا۔ جس طرح پیدل آیا تھا اسی طرح پا پیادہ واپس گیا۔ پسینے سے شرابور، چہرہ سرخ، سانس پھولا ہوا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔

زبیدہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سلیم کو جو اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ "سلیم صاحب، آپ کی یہ حالت کیا ہو رہی ہے؟"

اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں ذرا دور سے آ رہا ہوں!"

"لیکن کہاں گئے تھے اس وقت؟"

"ایک بہت ضروری کام سے!"

"وہ کسی اور وقت نہیں ہو سکتا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"یہ آپ کے ہاتھ میں بنڈل کیسا ہے؟ کیا کچھ خرید کر لائے ہیں؟"

سلیم سٹ پٹا گیا، اس نے کہا "جی ہاں اسی لئے تو گیا تھا۔"

زبیدہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ "اوہو تو آپ شاپنگ کرنے تشریف لے گئے تھے۔ ہمیں بھی تو دکھائیے، کیا چیز لائے ہیں آپ؟"

سلیم نے قدرے تامل کے بعد وہ بنڈل اس کے ہاتھ میں رکھ دیا، زبیدہ نے کھولا، تو ایک نہایت دیدہ زیب، زرنگار اور زرتار ساڑھی تھی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ایں آپ ساڑھی خرید لائے؟"

سلیم نے بہت آہستہ سے کہا۔ "جی ہاں۔"

یہ کہہ کر زبیدہ نے ساڑھی سلیم کی طرف بڑھا دی۔ وہ اس طرح پیچھے ہٹا، جیسے کوئی سانپ سے ڈر کر ٹھٹھک جاتا ہے۔

"کیا آپ کو پسند نہیں آئی؟ کیا آپ اسے واپس کر دیں گی؟"

یہ الفاظ کچھ ایسے درد، معصومیت اور بے ساختگی کے ساتھ سلیم نے کہے کہ زبیدہ کا ہاتھ وہیں ٹھٹھک گیا" تو کیا یہ آپ میرے لئے لائے ہیں ؟"

بڑی ہمت سے تابِ تکلم پیدا کر کے اس نے کہا۔

"جی ہاں!"

زبیدہ نے اسے غور سے دیکھا، پھر وہ ساڑھی اپنے پاس رکھ لی، اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی!۔

(۱۷)

نئی زندگی

قاسم سیٹھ نے سلیم سے باقاعدہ ایگریمنٹ کر لیا، وہ کمپنی میں کام کرنے لگا، جو کہانی اس نے سنائی تھی، قاسم سیٹھ نے کمپنی کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے پھر سے سنوائی، اور سب نے بالاتفاق اسے بہترین قرار دیا۔ چنانچہ کاغذی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور سلیم مکالمے لکھنے میں منہمک ہو گیا۔ میوزک ڈائرکٹر صاحب کا اصرار تھا، گیت بھی وہی لکھے۔ یہ ذمہ داری بھی اس نے قبول کر لی۔ وہ ایک گیت پہلے سے لکھ چکا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب اور سیٹھ صاحب سن کر پھڑک گئے اور ان کی صدابندی شروع ہو گئی۔

سلیم پابندی سے کمپنی آتا تھا اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا جو کام اس کے متعلق نہیں تھے وہ بھی اگر اس کے ذمہ کر دیئے جاتے تو دیانت

اور مستعدی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتا تھا، کمپنی کے سب لوگ سے محبت اور اخلاق و تپاک سے ملتا تھا۔ کمپنی کے پیشہ ور شاعر جن کا تخلص برق تھا، اس سے بہت جلتے تھے، کیونکہ اب تک وہی وہ تھے، لیکن سلیم کے آنے کے بعد کچھ نہیں رہ گئے تھے۔ وہ پرائیویٹ صحبتوں میں سلیم کی قابلیت شاعری اور فن کاری کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے سامنے بیٹھ کر اس کی برائیاں کرتے تھے۔ سیٹھ صاحب اور ڈائرکٹر صاحب کے سامنے گو خاموش رہتے تھے لیکن اگر موقع مل جاتا تو اعتراض کرنے اور بال کی کھال نکالنے کی کسر بھی نہیں اٹھا رکھے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ بیچارے کی سنی نہ جاتی ہو۔ جب سلیم سے ملتے تھے تو اس طرح جیسے تھانہ دار کسی مجرم سے ہاتھ ملا رہا ہے۔ سلیم ان کے رویہ کو دیکھتا تھا، اور دل ہی دل میں مسکرا کر رہ جاتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ احساس کمتری اس غریب کو نہ جانے کہاں لے جا کر ڈبوئے گا۔ اسے برق پر غصہ کی بجائے رحم آتا تھا۔

ایک دن سلیم کی اسٹوری پر ڈسکشن ہو رہا تھا۔ زبیدہ بھی موجود تھی۔ قاسم سیٹھ بھی، فلم ڈائرکٹر صاحب بھی، میوزک ڈائرکٹر بھی، اور برق صاحب تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے سلیم موجود نہیں تھا۔ اسے آج ہی ایک گیت مکمل کرنا تھا اور وہ ایک گوشہ میں بیٹھا فکر سخن کر رہا تھا، کہانی کے مختلف حصے اور مکالمے زیر بحث تھے۔ سب لوگ موقع موقع سے داد دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی لفظ پر نشان لگوایا جاتا کہ سلیم صاحب آئیں گے تو اسے بدلوا دیا جائے گا کیونکہ اس کے تلفظ میں جاہل اداکاروں کو دشواری پیش آئیگی

ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ مجلس قائم رہی، قاسم سیٹھ نے برق سے کہا، آخر آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں۔ کچھ بولئے، رائے بتایئے۔

برق صاحب نے ایک طنز آمیز تبسم کے ساتھ فرمایا "نہیں صاحب! سلیم صاحب کے معاملہ میں یہ خاکسار کیا دخل دے سکتا ہے؟"

قاسم سیٹھ:- واہ یہ کیا بات ہوئی؟ سلیم صاحب کیا آسمان سے اتر کر آئے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح ایک آرٹسٹ ہیں،

زبیدہ:- (دخل در معقولات کرتے ہوئے) یہ دوسری بات ہے کہ آپ سے اچھے ہیں۔

قاسم سیٹھ:- (ایک قہقہہ لگا کر) اس سے کیا ہوتا ہے بھئی بات یہ ہے کہ نئی فلم کمپنی کی ہے، نہ میری ہے نہ مس زبیدہ کی، نہ سلیم صاحب کی، وہ اگر کامیاب ہو گئی تو نام سب کا ہو گا، نفع کمپنی کو ہو گا، فائدہ بھی سب اٹھائیں گے اگر ناکام ہوئی تو پھر کمپنی کو نقصان ہو گا۔ آپ لوگ بدنام ہوں گے۔ اور مالی اعتبار سے بھی خسارے میں رہیں گے۔

نادر:- لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ اگر افراد خاندان کی طرح مل جل کر بیٹھیں اور اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیں تاکہ اگر کوئی خامی ہو تو دور کر دی جائے

قاسم:- بالکل ٹھیک.......... یہی میرا مطلب ہے۔ یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔

نادر:- (برق سے) آپ تو خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ غالب اتنا اونچا شاعر تھا لیکن اس کا ہر شعر تو اچھا نہیں تھا؟ آپ

نے ہمیں کئی اسٹوریاں دی ہیں، بہت سے گانے لکھے ہیں۔ ایک دفع
بات نہ بنی تو دوسرا آدمی بازی لے گیا تو اس میں بددل ہونے کی کیا بات
ہے ؟ ممکن ہے کوئی ایسا وقت آئے کہ آپ بازی لے جائیں اور وہ منہ
دیکھتا رہ جائے

زبیدہ :۔ (مسکراتے ہوئے) اور کہا .... بستم کے تو بھی
خدا وہ دن تو کرے ! "

خاور :۔ مس زبیدہ، آپ تو ایسا فقرہ چست کر دیتی ہیں کہ برق صاحب
خاموش رہنے کا بہانہ مل جاتا ہے ۔

زبیدہ :۔ جی نہیں، وہ شوق سے کڑکیں، چمکیں مجھے کیا اعتراض ہو
بلکہ سچ پوچھئے تو میں چھیڑ اس لئے رہی ہوں کہ یہ کچھ منہ سے بولیں
سر سے کھیلیں، انہوں نے تو خواہ مخواہ سلیم صاحب کو ہوا بنا لیا
حالانکہ میری رائے یہ ہے کہ وہ ایک اچھے فن کار ضرور ہیں، لیکن
وہ تجربہ کہاں سے لائیں گے جو برق صاحب کو ہے

خاور :۔ اور کیا، سلیم صاحب کو آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں
اور برق صاحب پندرہ سال سے اس لائن میں کام کر رہے ہیں

زبیدہ :۔ جی ہاں وہی تو میں کہتی ہوں کہ جائے استاد خالی است، برق
خدا کے لئے ایسا چپ نہ بیٹھئے، اور اپنی چمک دمک دکھائیے

قاسم سیٹھ :۔ کہانی کے سٹ پر جانے کے بعد اگر آپ نے کچھ نکتہ چینی
تو خیریت نہیں ہوگی آپ کی !

برق :- تو آخر آپ حضرات چاہتے کیا ہیں مجھ سے ؟

خاور :- یہ کہ اس کہانی کے بارے میں اپنی رائے دیجئے۔

برق :- لیکن وہ ضرور بری لگے گی آپ کو۔

خاور :- نہیں لگے گی کہئے تو

برق :- عجیب مصیبت یہ ہے کہ رائے آپ لوگ مانگ رہے ہیں سلیم صاحب کی اسٹوری پر، اور مجھے اظہارِ خیال کرنا پڑے گا ، ملک کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس یکتا صاحب کی ایک کہانی پر، یہ تو بڑی ستم ظریفی ہوگی۔

خاور :- (آنکھیں نکال کر) کیا کہا ؟

قاسم سیٹھ :- کیا مطلب ؟

برق :- بدقسمتی سے ہم لوگ اس وقت اپنی مادری زبان میں گفتگو کر رہے ہیں، اگر وہ بھی سمجھ سے باہر ہے، تو پھر انگریزی میں اظہارِ خیال کرنا اور زیادہ لاحاصل ہوگا۔

خاور :- آپ کا مطلب یہ ہے کہ سلیم صاحب کی کہانی یکتا صاحب کی کہانی سے ماخوذ ہے ؟

برق :- یہ میرا خیال نہیں، دعویٰ ہے .... اور جب یکتا صاحب آپ پر دعویٰ کریں گے تو ثبوت مل جائے گا .... افسوس، مجھے چوری کا فن نہیں آتا، ورنہ شاید آپ مجھ سے ہزار روپے ماہوار کا ایگریمنٹ کر چکے ہوتے۔

قاسم سیٹھ: بھئی یہ تم جانو، ہم کیا جانیں معاملہ کیا ہے، کہانی سنی، اپنی
آئی، کیا پلاٹ ہے غضب ہے)

خاور: پلاٹ؟ اجی زلزلہ ہے زلزلہ .... لیکن یہ بات کچھ سمجھ
نہیں آتی، سلیم ایسا آدمی معلوم ہوتا نہیں، کیوں مس زبیدہ؟

زبیدہ:- میں کیا جانوں، کچھ کسی کے ماتھے پر لکھا رہتا ہے۔ کون کیسا
ممکن ہے چوری کی ہو، سلیم صاحب نے۔ لیکن برق صاحب بتا
اس کہانی کا عنوان کیا ہے؟

برق:- وہ تو مجھے یاد نہیں،

زبیدہ:- آپ کے پاس وہ کتاب تو ضرور ہوگی؟

برق: شاید ہو، کچھ نہیں کہہ سکتا، تھی تو،

خاور: کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو؟ یا اپنا دعوے ثابت کرو ورنہ
واپس لو، ایک شریف آدمی پر اس کی پیٹھ پیچھے اس طرح کی تہمت
تراشی زیب نہیں دیتی۔

برق:- صاحب مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ بھر عرصہ ہوا، میں نے
وہ کہانی دیکھی تھی۔ سلیم صاحب نے اپنی کہانی میں جس کا چربہ
اتارا ہے، اب میں اصل کہانی کہاں سے ڈھونڈھتا پھروں؟ کچھ مجھے معلوم
تھا کہ ایک روز اس سرقہ کی تفتیش مجھے کرنی پڑے گی؟

خاور:- بے بنیاد دعوے تو پھر ہر شخص کے بارے میں کیا جا سکتا ہے

قاسم سیٹھ:- اپنا تو دل کھٹا ہوگیا ان باتوں سے اور اس کہانی سے بھی

ہم تو لاکھوں روپیہ لگا کر فلم بنائیں اور کوئی دعوے ٹھونک دے
کہ اسٹوری تو میری نقل لا ڈ پیسے۔ پھر کیا ہوگا؟
زبیدہ :- وہ پیسے میں دوں گی۔
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سلیم آ گیا، اسے دیکھ کر خاموشی سی چھا گئی
محفل پر، خاور نے بات کا پہلو بدلنے کے لئے اس سے پوچھا "
کہیئے سلیم صاحب گانا ہوا؟
سلیم نے جواب دیا، ہوا تو تھا، لیکن پھاڑ کر پھینک دیا میں نے
خاور :- (چونک کر) یہ کیوں جناب؟
سلیم :- کچھ جچا نہیں .... جب خود مجھے پسند نہیں آیا تو رکھ
کر کیا کرتا، بالکل مہمل تھا۔
خاور :- یہ آپ اپنے گیت کے لئے کہہ رہے ہیں۔"
سلیم :- جی اور کیا، اس بے باکی سے اظہار رائے اپنے ہی بارے میں کیا
جا سکتا ہے۔
خاور :- اس طرح تو بہت وقت صرف ہوتا ہوگا آپ کا؟
سلیم :- جی ہاں، میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ طبیعت روانی پر ہوتی ہے
تو گیت ہو یا کہانی، منٹوں میں گھنٹوں کا کام کر لوں گا اور کسی وجہ
سے طبیعت ٹل ہو تو پھر مہینے گذر جائیں، قلم کسی نئی تخلیق
پر آمادہ نہیں ہوتا۔
خاور :- بہت خوب، بڑی اچھی عادت ہے۔ اسی چھان پھٹک کا نتیجہ

ہے کہ آپ خوب لکھتے ہیں !

سلیم :- جو بھی سمجھ لیجئے ، لیکن کیا کروں ، طبیعت کچھ اسی طرح کی ہے
اب اسی کہانی کو لے لیجئے جس کی کاغذی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔

قاسم سیٹھ :- وہی نئی کہانی آپ کی جسے ہم فلمانے والے ہیں ؟

سلیم :- جی ہاں ، وہی ...... اسے میں نے دس بار لکھا ہے ،

قاسم سیٹھ :- دس بار لکھا ہے ؟

سلیم :- جی ہاں .... صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ، مگر پسند نہ کر
پھاڑ ڈالے ، میں اس کا قائل ہوں کہ چیز ہو تو اچھی ہو ورنہ پھر خا
ہی بہتر ہے ۔

زبیدہ :- اس کہانی کے لکھنے کے دوران میں کون کون سی کتابیں آ
کے پیش نظر رہی تھیں ۔

سلیم :- یہ کوئی تحقیقی مقالہ تو تھا نہیں ، کتابوں کے پیش نظر رہنے کا
سوال ؟

زبیدہ :- خیر ہوگا ، اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو یکتا صاحب
افسانے پسند ہیں ؟

سلیم :- یہ سوال آپ کیوں کر رہی ہیں ؟

زبیدہ :- آپ کو اس سے کیا ؟ سوال کا جواب دیجئے ۔

سلیم :- یکتا صاحب افسانے تو لکھتے ہیں ۔ داستانیں لکھتے ہیں اور
سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ۔

زبیدہ :۔ کیا یہ کہانی بالکل آپ کی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس میں یکتا صاحب کا تصور تو کہیں نہیں جھلک رہا ہے؟

سلیم :۔ لاحول ولا قوۃ، آپ مجھے اتنا گھٹیا آدمی سمجھتی ہیں؟

خاور :۔ مس زبیدہ تو یوں ہی چھیڑ رہی ہیں، آپ کو، لیکن کاروباری اعتبار سے یہ ضروری ہے کہ آپ ہمیں ایک تحریر دیں کہ یہ کہانی آپ کی طبعزاد ہے

سلیم :۔ مجھے ایسی تحریر دینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟

خاور :۔ برا نہ مانئے گا، ایسی تحریر ہم ہر رائٹر سے لیتے ہیں۔ آج ہی ایک صاحب نے ایک کہانی پیش کی ہے جسے ابھی ہم سنیں گے ان سے بھی اسی طرح کی تحریر لی جائے گی، اگر ہماری مجلس نے اسے پاس کر دیا۔

سلیم :۔ ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں!

۱۸

رعنا

یوں تو زبیدہ کی سہیلیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا
لیکن رعنا سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے، حالانکہ بظاہر نہ ہونا
چاہیئے تھے۔ کیونکہ رعنا صحیح معنوں میں اس کی حریف تھی۔ حسن وجمال
دنیا میں اگر زبیدہ کا ڈنکا بج رہا تھا، تو رعنا کے پرستار بھی حد شمار
خارج تھے، رقص و موسیقی میں اگر زبیدہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھی تو ر
کا جواب ڈھونڈھنا بھی بہت مشکل تھا، عوام کا ہجوم ٹڈی دل کی طر
جس طرح زبیدہ کی فلموں میں گرتا تھا، اسی طرح رعنا کی بھی جب کوئی
کسی بڑے سینما میں دکھائی جاتی تھی تو خلقت ٹوٹ پڑتی تھی۔ ہفتوں پہلے
نشستیں محفوظ ہو جاتی تھیں، دونوں کا تعلق دو مختلف کمپنیوں سے تھا۔ زبی
اگر بھارت فلمز کی روح رواں تھی تو رعنا کے دم سے انڈین ٹاکی

کا نام روشن تھا ۔ غرض بظاہر ان دونوں میں رقابت اور چشمک ہونی چاہئے تھی، لیکن تھی محبت، ویسی ہی محبّت جیسی دو سگی بہنوں میں ہو سکتی ہے

آج صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ۔ بارش اور پھر بمبئی کی بارش یہ معلوم ہوتا تھا، یہ گھر کر آنے والے بادل اب کبھی واپس نہ جائیں گے ۔ یوں ہی برستے اور یونہی جل تھل کرتے رہیں گے ۔ اندھیرا ایسا تھا کہ دن نے گویا رات کا لباس پہن لیا تھا ۔ مصیبت ان لوگوں کے لئے تھی جنہیں اس بارش میں پا پیادہ تلاش رزق گھومنا پڑ رہا تھا ۔ یا ٹرام اور بس کے انتظار میں بھیگنا پڑ رہا تھا، ورنہ موٹر کشتیوں اور بنگلوں کے رہنے والوں کے لئے تو یہ موسم جانِ بہار بنا ہوا تھا، زبیدہ بھی موسم کی اس رعنائی سے بہت متاثر ہوئی، وہ اپنے خوبصورت ڈرائینگ روم کی کھڑکی میں آ کر بیٹھ گئی، کھڑکی کا رخ سمندر کی طرف تھا ۔ سمندر کی بڑی بڑی خوفناک لہریں اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ۔ مدوجزر کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے سمندر اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ بڑھ کے سارے خوشنما بنگلوں، کوٹھیوں اور عمارتوں کو نگل لینے کے لئے بڑھا چلا آ رہا ہے، کبھی ایسا لگتا جیسے اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر واپس جا رہا ہے .... زبیدہ یہ منظر دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی ۔ بول سمجھ میں نہیں آ رہے تھے ۔ لیکن موسیقی کا لطف تو اسی میں ہے کہ بول سمجھ میں نہ آئیں اور نغمہ کا جادو اپنا کام کر جائے، کوئل کی کوک اور...

بلبل کی نغمہ سرائی پہ لوگ جان دیتے ہیں، لیکن کیا ان کے بول بھی سمجھ لیتے ہیں؟

زبیدہ ٹکٹکی باندھے سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی اور گنگنا رہی تھی۔ اتنے میں دبے پاؤں رعنا آئی، اور اس نے پیچھے سے اس کی آنکھیں میچ لیں، زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رعنا!

رعنا نے ہاتھ ہٹائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتی ہوئی بولی۔

"کیا ہو رہا تھا؟"

زبیدہ:۔ قدرت خدا کا نظارا۔

رعنا:۔ اوہو، قدرت بھی کہیں قدرت کا نظارہ کرتی ہے؟.... قدرت کی قدرت تم خود بھی تو ہو۔

زبیدہ ہنسنے لگی،

"ہاں بھئی، جی بھر کے بنا لو!"

رعنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو کچھ جھوٹ کہہ رہی ہوں؟

زبیدہ:۔ نہیں بڑی سچی۔

رعنا:۔ اور کیا، تمہاری طرح جھوٹی ہوں اوّل درجہ کی۔

زبیدہ:۔ میں نے کونسا جھوٹ بولا ہے جناب سے؟

رعنا :- تم نے کل یہ طے نہیں کیا تھا کہ آج ماتھران چلو گی ؟

زبیدہ :- کبھی چلتی تو ضرور، لیکن بیچ میں فلم کی شوٹنگ ٹپک پڑی اسے کیسے چھوڑ دوں، تم ہی سوچو ؟

رعنا :- ہم نے کیسے چھوڑ دی ؟ ہماری فلم کی شوٹنگ بھی تو جاری ہے مگر ڈائرکٹر صاحب سے کہہ دیا، جناب یہ اپنا فلمی تام جھام تہ کر کے رکھئے ۔ ہم ماتھران جا رہے ہیں، بیچارے منہ دیکھ کر رہ گئے اور میں گھر آ کر سامان بندھوانے لگی ، مگر تمہارا کہیں پتہ نہیں ، آدمی کو بات کا پکا ہونا چاہئے ، سنا ہے تم نے .... قول مرداں جان دارد !

زبیدہ :- سنا ہوا تو ہے ، لیکن یہ بات تو مردوں کے لئے ہے ، عورتوں کے لئے تھوڑی ہی ہے ؟

رعنا :- کیوں ، عورتوں کے لئے کیوں نہیں ہے ؟

زبیدہ :- عورتوں پر کہیں یہ پابندی لگ جائے تو بیچاروں کی زندگی اجیرن ہو جائے ۔

رعنا :- یہ کیوں بھلا ؟

زبیدہ :- انہیں تو زندگی بھر جھوٹ بولنا پڑتا ہے ۔

رعنا :- یہ مجبوری ہماری سمجھ میں نہیں آئی ، بھئی پہلی مرتبہ تم نے یہ بات کہی ہے ۔

زبیدہ :- اگر یہ جھوٹ ہے تو میری بات سچ ٹھہری کہ عورتیں جھوٹی ہوتی ہیں اور اگر سچ ہے تو تم جھوٹی ہو ۔

رعنا :۔ آج موڈ کچھ بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ شائد لڑائی ہو گئی ہے کسی سے ؟

زبیدہ :۔ لڑوں گی کس سے ؟ ہاں تمہیں دیکھ لیتی ہوں تو لڑنے ہی کا نہیں ، مارنے پیٹنے تک کو جی چاہنے لگتا ہے ۔

رعنا :۔ شکریہ اس نوازش کا .... تو پھر مجھے اجازت دیجئے ، کہیں اس جی چاہنے پر آپ نے عمل شروع کر دیا تو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے شامت آجائے گی میری !

زبیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) ...... لیکن آج تو تمہیں پیار کرنے کو جی چاہ رہا ہے ۔

رعنا :۔ آخر آج مجھ پر نوازش اور احسان کا سلسلہ کیوں جاری ہے ؟

زبیدہ :۔ پھر اور کسے تلاش کروں ؟

رعنا :۔ پیار کرنا ہے تو رقیہ اور اسلم کو کرو ، مارنا پیٹنا ہے تو قاسم سیٹھ خان بہادر صاحب ، نواب صاحب ، اور دوسرے بہت سے نیاز مند موجود ہیں ۔ ڈانٹا کیا تلوار اٹھا لو تو وہ سر کٹا دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھیں گے ۔

زبیدہ :۔ شاید تم مجھے بھی اپنی طرح سمجھ رہی ہو ، ایسے نیاز مند اور جانثار قدرت نے تمہیں عنایت کئے ہیں ، میں تو خود دوسروں کی نیازمندی پر مجبور ہوں ، بھلا میرا کوئی نیاز مند کیوں ہونے لگا ۔

رعنا :۔ (ہنستے ہوئے) اور پھر کہو گی ہم جھوٹ نہیں بولتے ؟ ..... کیوں ری جھوٹی

زبیدہ :۔ تمہیں تو ہر بات جھوٹ ہی نظر آتی ہے ۔

رعنا :۔ تو پھر قاسم سیٹھ میرے نیازمند ہیں ؟

زبیدہ :۔ میں کیا جانوں، ہوں گے ؟

رعنا :۔ اور یہ خان بہادر اور اشتیاق علی خاں بھی شاید میرے ہی نام کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں ۔

زبیدہ :۔ ممکن ہے ،

رعنا :۔ اور نواب طاہر علی بیگ صاحب بھی شاید میرے ہی پرستار ہیں ۔

زبیدہ :۔ اگر ذرا بھی ذوق سلیم رکھتے ہیں، تو انہیں یہی کرنا چاہیئے

رعنا :۔ زبیدہ ایسی باتیں نہ کرو، میں آج تم سے پوچھ کر رہوں گی۔ تمہارے دل کا مالک کون ہے ؟

زبیدہ :۔ دل کا مالک ؟ پگلی، کہیں کی، دل کس چیز کو کہتے ہیں پہلے یہ تو بتا ۔

رعنا :۔ ارے تمہیں یہ بھی نہیں معلوم

زبیدہ :۔ بتاؤ نا، پوچھ تو رہی ہوں ۔

رعنا :۔ مجھے کیا پڑی ہے بتانے کی، پوچھ لینا (دیوار پر لگی ہوئی قاسم سیٹھ وغیرہ کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے کرتے ہوئے) انہی میں سے کسی سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا ۔

زبیدہ :۔ آج تم کچھ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو ؟

رعنا :۔ موسم بھی تو ایسا ہی ہے۔

زبیدہ :۔ تو ایک آدھ بوتل پی لو۔

رعنا :۔ ہم تو بغیر پئے نشہ میں رہتے ہیں، پیو تم۔

زبیدہ :۔ جی معاف کیجئے، مجھے نشہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

رعنا :۔ احمق، بزدل،

زبیدہ :۔ نشہ سے دلچسپی نہ رکھنا حماقت ہے، بزدلی ہے؟

رعنا :۔ اور کیا .... زندگی میں اگر نشہ نہ ہو تو پھر وہ زندگی کاہے کو ہوئی، موت ہوئی۔

زبیدہ :۔ ہوگا بھئی، تم جانو تمہارا کام .... یہ باتیں ہم تو جانتے نہیں۔

رعنا :۔ ہاں، اور کیا ...... تم بھولی بیٹیاں یہ کیا جانو!

زبیدہ :۔ ایک دل آویز تبسم کے ساتھ) اور کیا؟

رعنا :۔ لاکھ پہلو بچانے کی کوشش کرو .... میں پوچھ کر رہوں اپنی بات

زبیدہ :۔ کیا پوچھنا چاہتی ہو آخر؟

رعنا :۔ کس سے محبت کرتی ہو تم؟

زبیدہ :۔ سچ سچ بتا دوں؟

رعنا :۔ ہاں، تجھے میری قسم، سچ بتا کسے چاہتی ہے تو؟

زبیدہ :۔ (سنجیدگی کے ساتھ) سچی بات تو یہ ہے کہ کسی کو بھی نہیں

چاہتی ۔

زبیدہ کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی، اور وہ رعنا کو چھوڑ کر فون کی طرف متوجہ ہوئی ۔

---

(۱۹)

دبے پاؤں

زبیدہ ٹیلیفون پر گفتگو کر رہی تھی، اس گفتگو سے رعنا کو قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی، گفتگو کا سلسلہ جب کسی طرح ختم نہ ہوا تو رعنا اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور ٹہلنے لگی، پھر نہ جانے کس طرح ٹہلتے ٹہلتے، وہ ایک دوسرے کمرے میں جو ڈرائنگ روم والے کمرے سے بالکل ملا ہوا تھا چلی گئی ....

یہ سلیم کا کمرہ تھا، سلیم بھی اس وقت موج میں تھا اور ترنم کے ساتھ غالب کے چند اشعار پڑھ رہا تھا۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

سلیم وجد و لحن کے ساتھ، جس میں درد و سوز کی آمیزش بھی تھی، یہ اشعار گا رہا تھا اور اس کی نگاہ زبیدہ کی تصویر پر جمی ہوئی تھی۔ یہ زبیدہ کی بالکل تازہ تصویر تھی اور اسی لباس میں تھی جس میں وہ اس وقت رعنا کو نظر آ رہی تھی۔

رعنا کو دیکھ کر سلیم گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اس نے رعنا کو کئی مرتبہ زبیدہ کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ فلمی رسالوں میں اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ خود زبیدہ کے کمرہ میں اس کا قدِ آدم فوٹو دیکھا تھا۔ لیکن رعنا نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا تھا تو توجہ نہیں کی تھی۔ سلیم جانتا تھا کہ رعنا کیا ہے؟ اس کی پوزیشن کیا ہے، اس کی شخصیت کیا ہے؟ لیکن رعنا اس سے بالکل ناواقف تھی کہ سلیم کیا ہے اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں؟ اپنے کمرے میں اس طرح بے محابا آتے دیکھ کر اگر وہ حواس باختہ ہو گیا۔ تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی، ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔

رعنا نے سلیم کے سراپا پہ ایک نظر ڈالی۔ پھر سنجیدگی سے پوچھا
"یہ شاید آپ ہی ابھی نغمہ طرازی میں مصروف تھے؟"

اس لب و لہجہ اور اس استفسار نے اس کے آئے گئے حواس غائب کر دیئے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کہا

جی نہیں، مجھے بھلا نغمہ طرازی سے کیا کام ہو سکتا ہے ؟

رعنا :- یا اللہ کن لوگوں میں آکر پھنس گئی ہوں، جسے دیکھئے بے تکلفی سے دھڑلے کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہے ...... جناب کیا ابھی گا نہیں رہے تھے ؟

سلیم :- جی ہاں، گا تو رہا تھا۔

رعنا :- انکار کیوں کیا تھا پھر آپ نے ؟

سلیم :- آپ نے تو نغمہ طرازی کے بارے میں پوچھا تھا۔

رعنا :- اوہ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے، نغمہ طرازی بھلا آپ کیا جانیں؛ آپ تو صرف گا رہے تھے، کیوں ؟

سلیم :- جی ہاں، اور کیا ؟

رعنا :- کیا فرق ہوتا ہے گانے میں اور نغمہ طرازی میں ؟ سوا اس کے کہ ایک سیدھا سادا سا لفظ ہے، دوسرے پہ تہذیب اور تکلّف کے پردے چڑھے ہوئے ہیں، جیسے ہم کسی سے کہیں کھانا کھا لیجئے یہ سیدھا سادا لفظ ہوا، اور اگر کہیں، ما حضر تناول فرمایئے، تو تہذیب و تکلف کا اسراف ہوا۔ کچھ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں ؟

سلیم :- جی، بالکل نہیں،

رعنا :- کیا گا رہے تھے آپ ؟

سلیم :- چند اشعار تھے۔

رعنا :- ظاہر ہے اشعار ہی گائے جاتے ہیں، نثر کی عبارتیں نہیں گائی

جاتیں، مگر میرا مطلب یہ ہے کہ کیا گا رہے تھے آپ ؟

سلیم :- غالب کے چند شعر تھے۔

رعنا :- غالب ؟ .... یہ کون بزرگ تھے ؟

سلیم :- آپ غالب کو نہیں جانتیں ؟

رعنا :- جانتی ہوتی تو پوچھتی کیوں آپ سے ؟ .... کیا یہ کوئی شاعر ہیں ؟

سلیم :- جی ہاں، بہت بڑے !

رعنا :- معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو اشعار آپ گا رہے تھے .... واقعی اچھے تھے۔

سلیم :- اس کا ہر شعر اچھا ہوتا ہے،

رعنا :- اچھا، یہ بات ہے !

سلیم :- جی ہاں صاحب، وہ تو استاد ہے اپنے فن کا۔

رعنا :- خوب، رہتے کہاں ہیں ؟

سلیم :- رہتے کہاں ہیں ؟

رعنا :- جی ہاں بتایئے۔ میں ان کو ملنا چاہتی ہوں۔ شائد کوئی اچھا سا گیت لکھ سکیں ہمیں ضرورت ہے۔

سلیم :- لیکن اب ملنے ملانے کے چکر سے چھوٹ چکے ہیں، نہ وہ کسی سے مل سکتے ہیں، نہ کوئی ان سے مل سکتا ہے !

رعنا :- یہ کیوں آخر ؟ معلوم ہوتا ہے بڑے مغرور ہیں،

سلیم :- نہیں، اب وہ ایسی جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں کی تمنا کیا کرتے تھے

رعنا (جل کر) کہاں کی آخر؟ کسی فلم کمپنی کی؟

سلیم :- جی نہیں۔۔۔۔ جہاں کا سودا سمایا ہوا تھا، کہتے ہیں:-

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشین کوئی نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

وہ اب ایسی ہی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں نہ کوئی ہم نشین ہے نہ پاسباں
وہ اس طرح بیمار پڑے کہ کوئی تیمار دار میسّر نہ آیا اور جب مر گئے تو کسی
نے ان پر آنسو نہ بہائے!

رعنا :- ہائے اللہ کیا وہ مر گئے، چہ چہ، بڑا افسوس ہے، حق مغفرت
کرے عجب آزاد مرد تھا۔

سلیم :- جی ہاں، ان کے انتقال کو تو مدتیں گذریں، زمانہ ہو گیا، اور یہ
مصرعہ جو آپ نے ان پر چسپاں کیا ہے یہ بھی انہیں مرحوم مغفور
کا ہے۔

رعنا :- معلوم ہوتا ہے آپ بھی شاعر ہیں۔۔۔۔۔ کیوں ہیں نا؟

سلیم :- یہ کیسے جانا آپ نے؟

رعنا :- داد دیجئے ہماری سراغ رسانی کی، کیسا پکڑا ہے آپ کو؟

سلیم :- تو کیا شاعر ہونا کچھ جرم ہے؟

رعنا:۔ بے شک جرم ہے ۔

سلیم :۔ اور اگر میں اس جرم سے توبہ کر لوں تو؟ .... پھر معاف کر دیں گی آپ؟

رعنا:۔ توبہ کرنے سے جرم ہلکا ہو جاتا ہے، لیکن قائم بہر حال رہتا ہے ..... بہر حال اپنے اشعار سنائیے ۔

سلیم :۔ (رٹ پٹا کر) اپنے اشعار سناؤں

رعنا :۔ ہاں کیا آپ شاعر نہیں ہیں، کیا ابھی آپ نے اپنے شاعر ہونے کا اقرار نہیں کیا؟

سلیم :۔ اس سے کیا ہوتا ہے ؟

رعنا :۔ اس سے تو سب کچھ ہوتا ہے، جرم ۔

سلیم :۔ وہ تو مانتا ہوں ۔

رعنا :۔ تو پھر اشعار سنائیے

سلیم :۔ اس وقت تو مجھے کوئی شعر بھی یاد نہیں آرہا ہے ۔

رعنا :۔ یہ کس تقریب میں ؟

سلیم :۔ مجھے اپنے اشعار بہت کم یاد ہیں، اور اس وقت تو ایسا محسوس کر رہا ہوں ایک بھی یاد نہیں ہے ۔

رعنا :۔ وہی تو پوچھ رہی ہوں، یہ اپنے ساتھ مذاق کرنے کا فن آپ نے کس سے سیکھا ہے ؟

سلیم ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ زبیدہ ہنستی مسکراتی ہوئی

شاخ گل کی طرح لچکتی، اور بادِ صبا کی طرح لہراتی اندر داخل ہوئی آتے ہی اس نے رعنا کی پیٹھ پر ایک دو ہتڑ مارا اور کہا۔

"تم یہاں ہو؟ میں نے سارا گھر ڈھونڈھ ڈالا۔"

(اپنی پیٹھ سہلاتی ہوئی رہ گیا ہوئی)

تم کیا سمجھ رہی تھیں؟ میں بھاگ گئی۔

زبیدہ:۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی، تم چلی گئیں۔

رعنا:۔ ارادہ تو یہی تھا، اس لئے کہ فون پر تم نے داستان ہوشربا شروع کر رکھی تھی جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آرہی تھی۔ مگر جب اس کمرے کے دروازے پر پہنچی تو رک جانا پڑا۔

زبیدہ:۔ یہاں کیا خاص بات تھی جو رک جانے پر مجبور ہو گئیں تم؟

رعنا:۔ (سلیم کے سینہ کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے) آپ!

زبیدہ:۔ کیا انہوں نے بلایا تھا تمہیں؟

سلیم:۔ جی نہیں، میں کیوں بلاتا؟

رعنا:۔ آپ اس قدر بے دخل کیوں ہیں؟ اگر آپ بلاتے تو کیا میں نہ آتی!

سلیم:۔ (سٹ پٹا کر) لیکن میں نے بلایا کب تھا؟

رعنا:۔ آپ نے نہیں تو آپ کی نغمہ سرائی نے، توبہ میں بھولی، نغمہ سرائی تو آپ جانتے ہی نہیں کسے کہتے ہیں؟ ہاں تو پھر آپ کے گانے نے مجھے بلایا تھا — ...... کیا اس سے بھی انکار کر دیں گے آپ؟

سلیم :۔ لیکن ......

رعنا :۔ لیکن ویکن کو چھوڑیئے ، بات مختصر ہو تو اچھا ہے ۔

بیدہ :۔ اری کچھ پاگل ہو گئی ہے ۔ ان بیچارے کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے ۔

رعنا :۔ یہ بے چارے ہیں ؟

بیدہ :۔ کچھ بھی ہیں تمہیں کیا ؟

رعنا :۔ اس وقت تک اس کمرہ سے میں قدم باہر نہیں نکال سکتی جب تک یہ صاحب اپنا کلام نہ سنائیں گے ۔

بیدہ :۔ (ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے) پگلی یہ شاعر نہیں ہیں ۔

رعنا :۔ یہ بھی خوب رہی .... من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید ۔ یہ حضرت خود تو اپنے شاعر ہونے کا اقرار کر رہے ہیں ، لیکن آپ صاف انکار فرما رہی ہیں !

بیدہ :۔ انہوں نے اپنے شاعر ہونے کا اقرار کیا تھا تم سے ؟

رعنا :۔ ہاں پوچھ لو ، سامنے تو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہوئے ادب سے !

بیدہ :۔ کیوں سلیم صاحب ؟

سلیم :۔ انہوں نے پوچھا میں نے کہہ دیا ۔

بیدہ :۔ کیا کہہ دیا ؟

سلیم :۔ یہی شاعری کے بارے میں ۔

زبیدہ :۔ (مسکراتے ہوئے) تو پھر اپنا کلام سناتے کیوں نہیں۔ اتنا
قدر داں سامنے کھڑا ہے۔ اور آپ یوں بکھنوی تکلف سے کام لے
ہیں! سنایئے! سنایئے۔

سلیم :۔ لیکن یاد جو نہیں آرہا ہے اس وقت کچھ!

زبیدہ :۔ کیوں ؟...... کیا بھول گئے ؟

سلیم :۔ جی ہاں، بالکل بھولا ہوا معلوم ہوتا ہوں۔

زبیدہ :۔ آخر کیوں ؟

رعنا :۔ تمہیں دیکھ کر۔

زبیدہ :۔ ہر وقت نہ ٹرٹرایا کرو،...... خاموش...... ہاں سلیم
تو کوئی شعر بھی یاد نہیں ہے آپ کو اس وقت ؟

سلیم :۔ جی نہیں ...... جتنا جتنا سوچتا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے بالکل بھو
چکا ہوں، مجھے خود حیرت ہے۔

زبیدہ :۔ واقعی تعجب کی بات ہے۔

رعنا :۔ تعجب کی نہیں، افسوس کی!...... بہر حال کچھ بھی ہو۔ اشعار
آپ کو سنانا پڑیں گے، ہاں سلیم صاحب!...... نام بھی آپ
شاعرانہ ہے اور خاصا اچھا ہے!...... سنایئے، ایک
آدھ شعر سہی، لیکن ہو چٹ پٹا۔

سلیم :۔ اس وقت تو معافی چاہتا ہوں۔

رعنا :۔ معاف کرنے کی عادی ہوں گی بی زبیدہ، میں نے تو یہ لفظ

ھی اپنے کانوں سے سنا ہے نہ کبھی ڈکشنری میں پڑھا ہے ۔

بیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) رعنا آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟

عنا :۔ پوچھی ہوئی بات بار بار کیوں پوچھتی ہو ؟ .... کیا تمہارے
اس طرح کے سوال و جواب میں میں نے نہیں کہا تھا : نشہ !

بیدہ :۔ اوہ، تو آپ نشہ میں ہیں ؟

عنا :۔ ہاں، یار دو مجھے معاف کر دیں نشہ میں ہوں' !

بیدہ :۔ خدا کے بندے آدمی بنو، بات کرنے کا ڈھنگ اور سلیقہ سیکھو
چلو میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں ۔

عنا :۔ لیکن سلیم صاحب کو بھی لیتی چلو اپنے ساتھ ۔

بیدہ :۔ یہ وہاں کیا کریں گے ؟

عنا :۔ کچھ نہیں بیٹھیں گے، ...... آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں، کیسے
سٹ پٹا گئے ہیں اچانک تمہیں آتا دیکھ کر۔

سلیم :۔ میں تو آپ کو بھی اچانک آتا دیکھ کر سٹ پٹا گیا تھا ۔

بیدہ :۔ (ہنستے ہوئے) سن لیا جواب ؟ .... ارے بھائی وہ ٹھہرے
شاعر، مکالمہ نویس، افسانہ نگار، تم ٹھہری کل کی چھوکری .... تمہارا ان
کا مقابلہ کیا ؟

عنا :۔ اوہو تو یہ ایسے سلیم صاحب ہیں :

بیدہ :۔ اور نہیں تو کیسے ہیں ؟

عنا :۔ تمہاری فلم کے گانے بھی یہی لکھ رہے ہوں گے ؟

زبیدہ :۔ ہاں ،

رعنا :۔ اچھا چلئے سلیم صاحب ، کوئی پھڑکتا ہوا گیت ہی سنا دیجئے

سلیم :۔ جی ، اس وقت تو وہ بھی ،

رعنا :۔ یاد نہیں آ رہا ہے ، کیوں ؟

زبیدہ :۔ ان کے کئی گیت مجھے یاد ہیں ، آؤ چلو جتنے کہو گی سنا
گی لیکن تم چٹان کی طرح اپنی جگہ پہ کھڑی رہو گی ، کھسکو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کسی طرح ؟

رعنا :۔ جو کھسک جائے وہ چٹان نہیں کچھ اور ہے !

پھر وہ ہنسنے لگی ، زبیدہ اسے گھسیٹتی ہوئی اپنے ڈرائنگ روم میں لے

---

(۲۰)

نوک جھونک

رعنا اور زبیدہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ہنستی اور مسکراتی آکر، ایک صوفے پر پاس پاس بیٹھ گئیں۔ رعنا نے شوخ نظروں سے زبیدہ کو دیکھا اور کہا۔

"تو یہ کہیئے ...."

زبیدہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کہا۔

"کیا کہوں ؟"

رعنا :۔ چور گھر میں موجود ہے اور ہم اسے شہر میں ڈھونڈھ رہے ہیں

زبیدہ :۔ کہنا کیا چاہتی ہو آخر ؟

رعنا :۔ وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔

زبیدہ :۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں تمہاری بکواس،

رعنا :- تو پھر سمجھاؤں ؟

زبیدہ :- ضرور ، نیکی اور پوچھ پوچھ !

رعنا :- یہ سلیم صاحب کون ہیں ؟

زبیدہ :- بڑی دلچسپی ہوگئی ہے تمہیں سلیم صاحب سے ؟

رعنا :- ہیں بھی تو دلچسپ آدمی ،

زبیدہ :- ہوں گے ،

رعنا :- ہوں گے ..... اتمہیں نہیں معلوم ، ...... کیوں جی ہم سے اڑو گی ، واقعی آج تم نشہ میں ہو ۔

زبیدہ :- واقعی آج تم نشہ میں ہو ،

رعنا :- اچھا تو یہ سلیم صاحب کون ہیں ؟ بتاؤ ۔

زبیدہ :- ایک انسان ، ایک شاعر ۔

رعنا :- اور ایک عاشق صادق نہیں ؟

زبیدہ :- چاہو تو بنا لو ، بن جائیں گے ،

رعنا : نہیں زبیدہ ، شیر دوسروں کے شکار پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈالتا تمہارا شکار تمہیں مبارک !

زبیدہ :- رعنا ، اپنی زبان بند کرو ، ورنہ میں پیٹنا شروع کر دوں گی ... تمہیں ،

رعنا :- یہ تو کوئی نئی بات نہ ہوگی .... لیکن واقعی ہے حیرت کی بات !

زبیدہ :۔ نہ تمہاری حیرت کا اعتبار نہ افسوس کا ۔ جب چاہو حیرت کرنے لگو، جب چاہو افسوس کرنے لگو۔ تم جیسے لوگ بڑے برخود غلط ہوتے ہیں ۔

رعنا :۔ ہوتے ہوں گے ..... لیکن مجھے حیرت اس پر ہے .....

زبیدہ :۔ میں یہ داستان نہیں سننا چاہتی، مجھے تمہاری حیرت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔

رعنا :۔ تم جیسی شہرہ آفاق مغنیہ جس کے سارے ملک میں دھوم ہے ۔ جس کے پرستاروں میں والیانِ ریاست بھی نظر آتے ہیں ۔ کروڑپتی ساہوکار اور سیٹھ بھی، حکومت کے عہدہ دار بھی اور فلم انڈسٹری سرمایہ دار بھی، خوبصورت سے خوب صورت نوجوان بھی ..... اور مشہور سے مشہور شاعر، ادیب افسانہ نگار اور ناول نویس بھی اس نے محبت کی تو کس سے اور ٹٹ پونجئے ۔ شاعر سے اور سچ کہوں مجھے تو اس میں شبہ ہے کہ وہ شاعر بھی ہے یا نہیں ؟

زبیدہ :۔ بس یا کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو؟

رعنا :۔ اس کے بعد کہا بھی کیا جا سکتا ہے ؟

زبیدہ :۔ اچھا اب میرا دکھڑا چھوڑو ۔ یہ بتاؤ تمہارے سیٹھ شیرازی کا کیا حال ہے ؟

رعنا :۔ سنا ہے کہ مر رہے ہیں ۔

زبیدہ :۔ تمہیں پر یا کسی اور پر ؟

رعنا :۔ فی الحال تو مجھی پر

زبیدہ :۔ تو شادی کیوں نہیں کر لیتیں ان سے ؟ مزے کرو گی، مزے میں رہو گی

رعنا :۔ شادی کے بارے میں تو آج تک میں نے سوچا ہی نہیں

زبیدہ :۔ تو کیا ساری زندگی یوں ہی گزار دو گی ؟

رعنا :۔ ہو سکتا ہے !

زبیدہ :۔ اور وہ سیٹھ کشوری لال ؟

رعنا :۔ سنا ہے ابھی تک زندہ ہیں ۔

زبیدہ :۔ تو کیا انہیں مر جانا چاہیئے تھا ؟

رعنا :۔ مجھ سے تو یہی کہہ کر گئے تھے کہ خود کشی کر لوں گا !

زبیدہ :۔ پھر ملاقات نہیں ہوئی ۔

رعنا :۔ بھلا کوئی ملک الموت سے ملاقات کرتا ہے ؟

زبیدہ :۔ تو تم ملک الموت ہو ان کے لئے ؟

رعنا :۔ یہی سمجھ لو

زبیدہ : اور وہ

رعنا :۔ وہ کون ؟

زبیدہ :۔ ادھر کیا نام ہے ان کا .... وہی کالے کالے سے موٹے موٹے سے ؟

رعنا :۔ (مسکرا کر) اور خوب یاد رکھا، نواب تجمل حسین ۔

زبیدہ :- ہاں ہاں وہی !
رعنا :- بہت یاد کرتے ہیں تمہیں ،
زبیدہ :- کیا تم سے دل سیر ہو گیا ،
رعنا :- مدت ہوئی ، زمانہ گذر گیا ، اس واقعہ کو تو ، بلکہ اب تو مجھے وہ حبیب عادت بھول بھی چکے ہوں گے ۔
زبیدہ :- ہاں ان نوابوں اور رئیسوں کا کیا اعتبار ،
رعنا :- یہ تو نہ کہو بہن .... کم از کم تم تو نہ کہو ، بیچارے نواب طاہر علی بیگ سے بڑھ کر وفادار ، جان نثار اور عاشق صادق اس دور میں اور کون ہو سکتا ہے ؟
زبیدہ :- بزرگوں کا یہ قول واقعی سچ ہے .... کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ۔
رعنا :- یہ قول کیوں یاد آگیا اس وقت جناب کو ؟
زبیدہ :- کل ہی نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ، کلمہ پڑھ رہے تھے تمہارے نام کا ۔
رعنا :- یہ نواب لوگ کلمہ پڑھنا جانتے ہیں کیا ؟
زبیدہ :- سچ رعنا ، بات بات پہ تمہارا ذکر ، تمہاری تعریف ، میرے خیال میں وہ ایک ہی دو دن کے اندر در دولت پر حاضری دینے آیا چاہتے ہیں ۔
رعنا :- کیا تمہارے در دولت سے دھتکار دیئے گئے ۔

زبیدہ :۔ کیا ایسا ہی سمجھ لو،

رعنا :۔ ٹھیک بھی ہے بھئی، کہاں خان بہادر اشتیاق علی خاں جیسا نکیلا سجیلا پہلوان، کہاں غریب نواب صاحب جیسا دھان پان، تمہاری نگاہ انتخاب کی داد دیتی ہوں۔

زبیدہ :۔ لیکن افسوس اس داد میں حقیقت نہیں ہے۔

رعنا :۔ یعنی یہ صرف میرا خیال ہی خیال ہے،

زبیدہ :۔ ہاں مجھے تو نفرت ہے خان بہادر صاحب سے۔

رعنا :۔ لیکن ملتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ہو۔ خاطر تواضع بھی خوب کرتی ہو، ایک دفعہ میں بیٹھی تھی تمہارے پاس کہ وہ آگئے، اور تم بچھ بچھ گئیں انہیں دیکھ کر۔

زبیدہ :۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے ؟

رعنا :۔ کیوں نہیں ہوتا ؟

زبیدہ :۔ یہ تو آرٹ ہے،

رعنا :۔ یعنی دکھاوے اور بناوٹ کا آرٹ .... یہ فن تمہارے نزدیک ؟

زبیدہ :۔ میرے کیا ساری دنیا کے نزدیک۔ تم جو پردہ فلم پہ ہیرو سے اظہار عشق کرتی ہو کیا وہ سچا ہوتا ہے ؟ میں نے جو پکچر میں اپنے عاشق کے غم میں زہر کھا لیا تھا، وہ سچ تھا ؟ .... پیسے ملتے ہیں اسی آرٹ کے، ہم بھی کمال دکھا دیتے ہیں اپنے ہنر کا ...، اس آرٹ

کا تعلق حقیقت اور واقعہ سے نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے ۔

رعنا :۔ آج تو کچھ عجیب سی باتیں کر رہی ہو تم ؟

زبیدہ :۔ تمہیں نے تو چھیڑی ہیں!

رعنا :۔ تو پھر قاسم سیٹھ کے بارے میں تمہارا خیال ہے ؟

زبیدہ :۔ وہی جو تمہارا ہے

رعنا :۔ میں تو انہیں اوّل درجے کا کائیاں اور خود غرض سمجھتی ہوں۔ صورت سے نفرت کرنے لگی ہوں ۔

زبیدہ :۔ بس بالکل یہی حال میرا ہے

رعنا :۔ لیکن تمہارا تو وہ "باس" ہے ، آقا ہے ، اور سنا ہے کہ چاہتا بھی بہت ہے تمہیں !

زبیدہ :۔ غلط سنا ہے ۔

رعنا :۔ تمہیں کہہ رہی تھیں ،

زبیدہ :۔ میں نے اس کا قول نقل کیا تھا ۔ اپنی رائے تھوڑی ہی بیان کی تھی ؟

رعنا :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قاسم بھی فیل ؟

زبیدہ :۔ بالکل ، انہیں تو ایک نمبر بھی نہیں دیا جا سکتا ،

رعنا :۔ لیکن تمہارے بقول وہ تمہارے بھی تو ہیں ،

زبیدہ :۔ جب تک تھے ، ان کی عزت کرتی رہی ، جب محسن کے بجائے غنڈے اور بدمعاش کے روپ میں آئے ، نفرت ہو گئی ہے ان سے ،

رعنا :- بہت اچھا کیا، بڑی خوشی ہوئی مجھے یہ سنکر! . . . . لیکن سلیم صاحب سے بھی نفرت کرتی ہو تم ؟

زبیدہ :- لاحول ولاقوۃ ، بھلا سلیم صاحب جیسے آدمی سے نفرت کی جا سکتی ہے -

رعنا :- (چٹکی بجا کر) آخر اتنے ہیر پھیر کے بعد تم نے مانا کہ محبت ہے ان سے -

زبیدہ :- محبت . . . . ، نہیں ، بالکل نہیں ، محبت کے لئے خدا کی اتنی وسیع و عریض دنیا میں سلیم صاحب ہی ایک رہ گئے ہیں ؟

رعنا :- تو آخر دنیا میں وہ کون خوش قسمت ہے جس سے تم محبت کر سکتی ہو جس سے تم واقعی محبت کرتی ہو ؟

زبیدہ :- اگر اس خوش قسمت کا نام بتا دیا تو جلنے لگو گی اس سے خواہ مخواہ

رعنا :- نہیں ، خدا کی قسم نہیں . . . . . . بتاؤ وہ کون ہے وہ ؟

زبیدہ :- اس کا نام ہے رعنا -

یہ کہہ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی ، رعنا نے جھوٹ روٹھتے ہوئے کہا -

" جھوٹی کہیں کی "

زبیدہ بولی

میری بہن یہی تو ایک عیب ہے مجھ میں کہ جھوٹ نہیں بولتی کوشش کروں تو بھی نہیں بول سکتی "

رعنا :- کیا کہنا ہے تمہارا...... اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو، بتاؤ تم تھران کب چلتی ہو؟

زبیدہ :- بھئی ذرا شوٹنگ ختم ہو لے تو چلیں گے اطمینان سے،

رعنا :- یعنی جب وہاں کا موسم ختم ہو جائے گا، تب چلو گی؟

زبیدہ :- تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے، دو چار دن میں موسم بھی ختم ہو جائے گا وہاں کا...... دیکھو آج منگل ہے بس سنیچر کی دوپہر کو چل دیں گے اور پھر دس پندرہ دن ڈٹ کر رہیں گے وہاں....اب تو خوش ہوئیں؟

رعنا : ہاں، لیکن اگر نہ چلیں تو؟

زبیدہ :- تو جو چور کی سزا وہ ہماری

دونوں کو ہنسی آ گئی۔

(۲۰)

ماتھران کا سفر

بمبئی اور پونا کے راستہ میں ایک پہاڑی نزہت گاہ ماتھران
بے انتہا سرسبز و شاداب مقام، مناظر قدرت سے مالامال، اس کی
پستی میں، اونچے نیچے مکانوں میں، باغوں اور پارکوں میں، نالوں
آبشاروں میں عجب طرح کی دل آویزی ہے۔ موسم نہایت خوشگوار
کی گہما گہمی، شور و غل، ہنگامہ اور بے پناہ مصروفیت سے
آکر، کچھ دنوں کے لئے دولت مند اور سرمایہ دار طبقہ کے لوگ
اور عافیت کی نعمت حاصل کرنے یہاں آجاتے ہیں۔ چند ہی
یہاں کی پرسکون زندگی انہیں پھر سے تازہ دم بنا دیتی ہے۔ رہنمانے
کئی فلموں میں رات دن کام کیا تھا اور اسکا اثر اسکی صحت پر پڑ رہا تھا۔ کئی مرتبہ
ماتھران جانے کا پروگرام بنایا لیکن زبیدہ کیوجہ سے ہر مرتبہ ناکام ہوا۔ زبیدہ

سے اسے انس تھا کہ بغیر اس کے ماتھران جانے پر وہ کسی طرح تیار نہیں تھی۔

آخر خدا خدا کر کے زبیدہ کی مصروفیت ختم ہوئی، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور پندرہ دن کا پروگرام بنا کر رعنا کے ساتھ ماتھران روانہ ہو گئی۔ یہاں ایک خوش منظر اور دل آویز مقام پر ایک اچھا سا بنگلہ پہلے سے کرائے پر لے لیا گیا تھا۔ قیام کی کوئی دقت نہ تھی، آتے ہی یہ لوگ گھر کی طرح آرام اور بے فکری سے رہنے لگے۔ زبیدہ کا ارادہ تو نہیں تھا کہ سلیم کو اپنے ساتھ لائے۔ لیکن عین وقت پر جب موٹر میں سامان رکھا جا رہا تھا سلیم صاحب تشریف لے آئے۔ اور نہایت سادگی کے ساتھ زبیدہ سے دریافت فرمایا۔

"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

اس غیر متوقع سوال پر وہ کچھ سٹ پٹا گئی، اس نے کہا۔

"میں تو ماتھران جا رہی ہوں رعنا کے ساتھ، پندرہ دن کے لئے۔ آپ وہاں جا کر کیا کریں گے؟"

سلیم نے فوراً اپنا ارادہ ختم کر دیا۔

"اچھا تو نہیں جاتا۔"

زبیدہ نے اس سعادت مندی سے متاثر ہو کر اخلاقاً کہا۔

"میں منع بھی نہیں کرتی، اگر آپ کا جی چاہ رہا ہو تو چلیئے۔"

کہنے لگے "جی تو چاہ رہا ہے، اس لئے تو پوچھا ہے آپ سے۔"

زبیدہ اپنی مسکراہٹ نہ ضبط کر سکی، بولی، تو پھر چلئے !..... کیپٹن
تو کوئی کام نہیں ہے ؟"

رعنا اب تک چپ چاپ موٹر میں بیٹھی ان دونوں کی باتیں سن رہی
تھی اب ضبط نہ کر سکی، کہنے لگی ۔

" اگر آپ چلنا چاہتے ہیں تو ضرور چلئے ، جائیے ، سامان لے آیئے، ہم آپ
کا یہیں انتظار کر رہے ہیں، جلدی کیجئے، ویسے ہی زبیدہ کے بناؤ سنگار
نے کافی دیر کر دی ہے !......... توبہ ہے ، آپ اب تک زبیدہ
کی طرف التجا طلب نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں، بھئی زبیدہ
دونا کہ چلے چلئے آپ بھی ۔"

زبیدہ نے جواب دیا "کہہ تو دیا، چلئے، پھر آ جایئے جلدی سے !"

سلیم کے چہرے پر خوشی اور انبساط کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ "ابھی
کہہ کر اپنا سامان لینے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد رعنا نے زبیدہ...
سے کہا ۔

مجھے تو بہت قابل رحم آدمی نظر آتا ہے ...... کسی یتیم خانہ سے
اٹھا لائی ہو اسے ؟

زبیدہ نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا .... یہ دنیا ایک بہت
بڑا یتیم خانہ ہے - یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو یتیم یعنی بے یار
اور بے سہارا محسوس نہ کرتے ہوں ----- یہاں دولت کی حکومت
ہے اور وہ چند لوگوں کی باندی بنی ہوئی ہے ، باقی لوگوں کو اپنی صورت

بھی نہیں دکھاتی۔"

رعنا نے زبیدہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، کہا۔

"بس شروع کر دی تم نے ایک لمبی سی تقریر! میں تو پوچھ کر پچھتائی۔ سوال تھا سلیم صاحب کے سلسلہ میں اور جواب دیا جا رہا ہے دنیا کے یتیم خانے کے بارے میں۔"

اتنے میں ایک ہینڈ بیگ لئے ہوئے، سلیم صاحب شاداں و فرحاں تشریف لائے۔ رعنا نے پوچھا۔

"بس یہی آپ کا سامان، یہ آپ کی کائنات ؟"

وہ بولا، "جی ہاں، اور میں سمجھتا ہوں، بہت کافی ہے!

رعنا زبیدہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئی، "لیجئے، اب دوسرے بقراط صاحب کا فلسفہ شروع ہو گیا۔ اب مجھے ڈر ہے کہیں تم لوگوں کے درمیان رہ کر میں پاگل نہ ہو جاؤں ؟"

زبیدہ بولی، "ایسی باتیں نہ کرو، پاگل ہوں تمہارے دشمن، ماتھران جیسی جگہ پر جا کر تو پاگل بھی آدمی بن جاتے ہیں!"

رعنا نے شوخ اور ستمگر آنکھوں سے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے زبیدہ سے دریافت کیا، "تمہارا مطلب یہ ہے کہ سلیم صاحب وہاں جا کر آدمی بن جائیں گے۔"

زبیدہ ہنسنے لگی، "تمہارے خیال میں یہ پاگل ہیں ؟"

رعنا نے اب کی براہ راست سلیم سے سوال کیا۔

"سلیم صاحب، آپ ہی بتا دیجئے، آپ پاگل ہیں یا انسان ؟"

سلیم نے بڑی سادگی سے اور بے ساختگی سے کہا، پاگلوں میں پاگل

انسانوں میں انسان !

زبیدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، "سلیم صاحب، آپ کے اس جواب نے

جی خوش کر دیا، کیوں بی رعنا، اب کیا کہتی ہو ؟"

رعنا :- یہ سوچنے کے بعد بتاؤں گی، فی الحال تو ہمیں ماتھران چلنا چاہئے

سلیم :- رقیہ اور اسلم ؟.......

زبیدہ :- لڑ رہے ہوں گے آپس میں ؟ "

سلیم :- جی نہیں

زبیدہ :- (پریشان ہو کر) خدا نخواستہ کسی کی طبیعت خراب ہے ؟

سلیم :- نہیں اچھے ہیں دونوں بالکل -

زبیدہ :- پھر آپ کیا کہہ رہے تھے ؟

سلیم :- میرا مطلب یہ ہے کہ کیوں نہ انہیں بھی ساتھ لے لیا جائے .

زبیدہ :- یہ کیوں خیال آیا آپ کے دماغ میں ....؟

کیا کریں گے ؟

سلیم :- کھیلیں گے، تفریح کریں گے، شرارت کریں گے ...... صحت پر

اچھا اثر پڑے گا -

زبیدہ :- جی معاف کیجئے، کھیل کود میں وہ پہلے ہی کم مشتاق نہیں

تفریح اتنی کرتے ہیں کہ آپ کا دل ہی جانتا ہوگا، ان

ان کی شرارت کو سکینہ بوا پہلے بہت صدقے واری ہوا کرتی تھی۔ اب وہ بھی عاجز آچکی ہیں، انہیں یہیں رہنے دیجئے، ورنہ وہ رنگ میں بھنگ ہوگا کہ دوسرے ہی وان ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑے گا......

ڈرائیور چلو!

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔ سلیم اس کے پاس بیٹھ گیا پچھلی نشست پر رعنا اور زبیدہ بیٹھی تھیں۔ کار ہوا سے باتیں کرتی روانہ ہو گئی۔

کچھ دیر تک تو خاموشی رہی۔ پھر زبیدہ نے رعنا کو...... چھیڑتے ہوئے کہا۔

"خاموش کیوں ہو؟"

وہ بولی، "باتیں کرتے کرتے منہ تھک گیا ہے......، ذرا آرام لے رہی ہوں۔

زبیدہ: لیکن ایک بات تو بتاؤ، اکیلی کیوں چل رہی ہو؟ تمہارے نواب تجمل حسین کہاں رہ گئے؟ وہ ہوتے تو ماتھران کے دن بڑے مزے میں کٹتے۔

رعنا: مجھے تو ان میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی، لیکن تمہاری خاطر بہر حال عزیز ہے، چاہو تو بے لو اپنے ساتھ...... لیکن وہ لاکھ دلچسپ ہوں قاسم سیٹھ سے زیادہ دلچسپ نہیں ہو سکتے۔ انہیں کیوں فرقت کے دن اور جدائی کی راتیں بسر کرنے کے لئے چھوڑے جاتی ہو؟"

حد ہو گئی ظلم کی ۔"

زُبیدہ :- اچھا بھئی معاف کر دو - میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں !

رعنا بے ساختہ ہنس پڑی، پھر اس نے ذرا بلند آواز میں سلیم سے ا

" آپ تو ہم لوگوں کی باتیں نہیں سن رہے ہیں ؟ "

سلیم نے منہ پھیر کر جواب دیا، اتنا تو محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ باتیں کر ر

لیکن وہ باتیں کس قسم کی ہیں، یہ نہیں سمجھ پاتا -

زبیدہ :- اسکا تو دماغ چل گیا ہے، آپ بیٹھے رہئے آرام سے - سلیم نے

گردن پھیری، اور پھر اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا -

---

(۲۱)

ماتھران کے شب روز

ماتھران کے شب و روز طرح طرح کی رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مرقع تھے، یہاں آکر زبیدہ نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ اسے نشاط افروزیوں کے سوا کوئی اور کام بھی ہے، یہی کیفیت رعنا کی تھی - وہ یہاں کی رونق اور چہل پہل اور گہما گہمی سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ بار بار زبیدہ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی تھی، خدا کے لئے کم سے کم ایک مہینہ تو رہنا، یہاں سلیم صاحب کے چہرے سے بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کس عالم میں ہیں؟ کبھی خوش نظر آتے تھے تو اتنے زیادہ کہ جیسے دولت کونین حاصل ہو گئی ہے۔ کبھی افسردگی اور اضمحلال کا دورہ پڑتا تو جیسے دنیا سے بیزار ہیں اور عنقریب خودکشی کا ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچانے والے ہیں - زبیدہ تو انہیں زیادہ منہ نہ نہیں لگاتی تھی، لیکن رعنا کی تو ساری دلچسپی اسی عجیب المخلوقات کے دم

سے قائم تھی، وہ برابر سلیم کو چھیڑا کرتی تھی۔ فقرے چست کیا کرتی تھی، بنایا کرتی تھی، سلیم صاحب نہایت خاموشی اور سعادت مندی کے ساتھ اس کے وار برداشت کرتے تھے۔ لیکن سو سنار کی ایک لوہار کی۔ کبھی کبھی ایسا جچا تلا ہوا جواب دیتے کہ بیچاری کی ساری شوخی اور زندہ دلی کافور ہو جاتی تھی، پھر وہ چپ سادھ لینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ یہ منظر زبیدہ کے لئے بڑا دلچسپ ہوتا۔ وہ رعنا کو ایسا ایسا چھیڑتی کہ کبھی کبھی تو وہ روہانسی ہو جاتی تھی۔

ایک روز بنگلہ کے برآمدہ میں رعنا اور زبیدہ بہار کی خوب صورت اور خوشنما کرسیوں پر بیٹھی حسب معمول ادھر کی باتیں کر رہی تھی کہ ایک خوبصورت سی موٹر پورٹیکو میں آکر رکی۔ رعنا نے آکر پوچھا۔

"یہ کون ٹپک پڑا اس وقت؟"

زبیدہ نے ناگوار لہجہ میں کہا۔

نہ جانے کون ہے؟ .... یہاں بھی جب دیکھو کوئی نہ کوئی وقت ضائع کرنے آہی جاتا ہے، کیا فائدہ ہوا پھر یہاں آنے اور رہنے سے؟

رعنا کی نظر اب تک موٹر کی طرف جمی ہوئی تھی، دروازہ کھلا۔ کسی نے اترنے سے پہلے سر باہر نکالا تو رعنا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ارے یہ تو نجمہ ہے، آہا! بڑا مزا رہے گا اب تو،

نجمہ کا نام سن کر زبیدہ بھی خوش ہو گئی اور نئے مہمان کے استقبال کے لئے لپکی، زینہ پر چڑھتے ہوئے، رعنا اور زبیدہ نے اسے اپنے بازوؤں میں

جکڑ لیا۔ اس نے دونوں کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

توبہ ہے میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے، باز آئی اس محبت سے پرے ہٹو نا"

لیکن یہ دونوں کب چھوڑنے والی تھیں۔ گھسیٹتی ہوئی اپنے ساتھ برآمدہ میں لے آئیں۔ تینوں نے ایک ایک کرسی پر قبضہ کر لیا۔

رعنا نے پوچھا۔

"کب آئیں تم ؟"

زبیدہ نے سوال کیا۔

"سامان کہاں ہے ؟"

نجمہ نے پہلے رعنا کو جواب دیا۔

"میں تو ایک مہینہ سے یہیں ہوں۔"

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئی۔

"سامان رائل ہوٹل میں ہے .... اتنی دولت مند تو نہیں کہ بنگلہ کرایہ پر لے سکوں۔ اوسط درجہ کا ہوٹل ہے، دس بارہ روپے روز میں کام چل جاتا ہے۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا، یہاں ہو، کل اتفاقاً معلوم ہوا کہ آپ دونوں یاغفران میں رونق افروز ہیں۔"

زبیدہ بولی۔ "ہمیں کب معلوم تھا، ورنہ تمہیں چھوڑ دیتے ؟"

رعنا نے کہا، "اب آئی ہو تو الو ہیں، دیکھیں اب یہاں سے ... کیسے جاتی ہو ؟"

وہ کہنے لگی، "نہیں بھئی جہاں ہو وہیں ٹھیک ہے۔ البتہ ملاقات

روز ہوتی رہے گی ۔"

زبیدہ نے جواب دیا ۔

" واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا ؟"

رعنا :۔ (اداکاری کرتے ہوئے) خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں !!

نجمہ :۔ ماشاءاللہ ، خدا نظر بد سے بچائے خوب چہکنے لگی ہو بلبل کی طرح !

رعنا :۔ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں طبیعت پر رومان غالب آجاتا ہے ،

نجمہ :۔ محبت بھی بہت کرتی ہو مجھ سے ۔

رعنا :۔ تو کیا شک ہے تمہیں کچھ ؟

زبیدہ :۔ نجمہ یہ بتاؤ کہ پونہ میں کیسی گزر رہی ہے ؟ بمبئی سے تم ایسی گئیں کہ بھول کر نہ کبھی خط لکھا ، نہ آئیں ، ہم لوگ تو یہ پروگرام بنا رہے تھے کہ بمبئی جانے سے پہلے ایک دن پونہ آئیں گے ۔"

نجمہ :۔ تمہیں زحمت سے بچانے کے لئے خود پونہ تمہارے پاس آگیا ۔

زبیدہ ابھی کوئی جواب نہ دے پاتی تھی کہ سلیم صاحب کہیں سے آتے ہوئے دکھائی دیئے ، انہیں دیکھ کر رعنا کی باچھیں کھل گئیں .... اور مسکراتی ہوئی اٹھی ، اور سلیم کو راستہ ہی میں جالیا ۔ اسے ایک طرف لے جا کر رازدارانہ طور پر مسکرا مسکرا کر کچھ باتیں کرتی رہی ۔ سلیم صاحب نہایت متانت اور سنجیدگی سے ، بغیر ہنسے اور مسکرائے ، اس کی باتیں سنتے رہے ۔ پھر جدھر سے ... آئے تھے ، اسی طرف تشریف لے گئے ۔ رعنا مسکراتی ہوئی آکر پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی ، زبیدہ نے کہا ۔

"اب تو بڑے رازو نیاز ہونے لگے ہیں تم دونوں میں۔"

وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور گویا ہوئی۔"

"تو پھر تمہیں کیا؟ . . . . قاضی جی کیوں دبلے؟ شہر کے اندیشہ ہیں!"

زبیدہ :۔ اچھا بھائی غلطی ہوئی، کان پکڑتے ہیں۔ اب کبھی جو بولیں تم دونوں کے معاملہ ہیں۔

نجمہ :۔ معاملہ کیا ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ۔

زبیدہ :۔ اب بھی کچھ بتانے کی ضرورت ہے؟

نجمہ :۔ اچھا میں سمجھ گئی، کیوں رعنا؟

رعنا :۔ ہاں بھئی ہاں۔

نجمہ :۔ تو یہ زبیدہ سچ کہہ رہی ہیں؟

رعنا :۔ زبیدہ سے بڑھ کر سچا کوئی آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔

نجمہ :۔ بڑی بے غیرت ہو، ذرا تو شرمائی ہوتیں!

رعنا :۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ یہ تو دل کا معاملہ ہے۔ تم جب تنویر کے پیچھے بھاگا کرتی تھیں، میں نے کبھی بے غیرتی کا طعنہ دیا تمہیں؟ (رنجیدہ ہوتے) واہ بھئی ہم تو کسی کے معاملے میں نہ بولیں، اور ہمارے معاملات میں جسے دیکھو ٹانگ اڑانے میں موجود، اچھی رہی یہ بھی!

زبیدہ :۔ ہنستے ہوئے انجمہ تم بھی کس کی باتوں میں پڑی ہو۔ رعنا سے بڑھ کر جھوٹا دنیا کے پردے پر نہیں ملے گا۔ صرف تمہیں بنا رہی ہے اور اداکاری دکھا رہی ہے۔

نجمہ : تو پھر یہ کون صاحب تھے جن سے آنی بے تکلفی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کی جارہی تھیں ؟

زبیدہ :۔ ہیں ایک صاحب، بڑے اچھے آدمی ہیں۔ لیکن اتفاق سے پنے سینہ میں دل نہیں رکھتے۔ بس یہی ایک کمزوری ہے بیچارے میں، تم نے دیکھا نہیں، یہ تو لہرا لہرا کر ادائیں دکھا رہی تھی اور وہ اس طرح ساکت و خاموش کھڑے تھے جیسے کھمبا۔ دل ہوتا تو وہیں کھڑے کھڑے بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ بھلا رعنا جیسی پری وش کسی سے لگاوٹ کی باتیں کرے اور اس پر اثر بھی نہ ہو ؟

نجمہ کچھ کہنے والی تھی کہ زینہ پر سے سلیم صاحب اترتے ہوئے تشریف لائے۔ انہیں زینہ سے اترتا دیکھ کر زبیدہ کو بڑی حیرت ہوئی، اس نے دریافت کیا۔

" آپ تو ابھی باہر سے آئے تھے، اور فوراً ہی باہر چلے گئے تھے پھر بالاخانہ سے کیسے اتر رہے ہیں۔ ؟"

رعنا :۔ یہ جادوگر بھی تو ہیں زبیدہ :۔

زبیدہ :۔ بتایئے سلیم صاحب۔

سلیم :۔ اس مرتبہ پچھلے دروازے سے بنگلے میں داخل ہونا پڑا

زبیدہ :۔ کیوں اس کی کیا ضرورت تھی ؟

رعنا :۔ دیکھ تو رہی ہو، نجمہ یہاں بیٹھی ہے، اور یہ نئی عورتوں سے شرماتے ہیں۔ اب یہ سوچ کر اترے ہوں گے کہ نجمہ چلی گئی، لیکن دیکھ کر چکرا گئے

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

زبیدہ ہنسنے لگی۔ اتنے میں ملازم آیا تو اس نے عرض کیا، "چائے تیار ہے" زبیدہ بولی "یہیں لے آؤ، اب کون اٹھے۔" ملازم نے ادب سے گردن جھکائی اور تعمیل ارشاد کے لئے واپس چلا گیا۔ ذرا دیر میں چائے، کیک ..... پیسٹری، تمام چیزیں لگا دی گئیں۔ زبیدہ، رعنا اور نجمہ نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ سلیم اس مجمع میں موجود تھا، لیکن غیر متحرک۔ نہ اس نے چائے کی طرف توجہ کی نہ کیک نہ پیسٹری کی طرف۔ نجمہ نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی اور کیک پیسٹری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "شوق کیجئے" رعنا بیچ میں بول پڑی۔ "آج روزہ سے ہیں۔" زبیدہ نے ڈانٹا۔ "ہر وقت بک بک نہ کیا کرو، سلیم صاحب لیجئے کھائیے۔ دیکھئے یہ پیسٹری بڑی لذیذ ہے۔" رعنا نے چائے کی پیالی سامنے رکھ دی اور کہا "کھائیے بھی اور پیجئے بھی۔ چائے بھی اتنی عمدہ بنی ہے کہ لطف آجائے گا۔" سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی کے ساتھ چائے پینے لگا۔ نجمہ نے کہا "بڑے خاموش آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" رعنا نے کہا "چپ شاہ کہو۔" نجمہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ زبیدہ نے پھر ڈانٹا۔ "رعنا۔ میں کہتی ہوں مت چھیڑو سلیم صاحب کو۔" رعنا اس طرح چپ ہو گئی جیسے زبیدہ کی ڈانٹ سے واقعی سہم گئی ہو۔ نجمہ نے زبیدہ سے کہا۔ "آخر سلیم صاحب کی کچھ تعریف تو کرو۔" زبیدہ نے کہا۔ "بڑے اچھے شاعر، بڑے اچھے اسٹوری رائٹر ہیں۔ ہماری کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ بڑے نیک اور شریف آدمی بھی ہیں۔"

رعنا کی خاموشی پھر ٹوٹ گئی۔ کہنے لگی۔

"ہاں اور کیا بڑے نیک۔"

جتنے ہو نیک اتنے ہی بدذات بھی تو ہو،

یہ مصرعہ اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے پڑھا کہ زبیدہ اور نجمہ تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں خود سلیم صاحب کا یہ حال تھا کہ لاکھ لاکھ تبسم کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ہونٹ تھے کہ عجب طرز کے خطوط و نقوش بنانے پر مچلے ہوئے تھے۔

بڑی دیر تک یہ دلچسپ اور پُرلطف صحبت قائم رہی، پھر نجمہ اٹھی، اس نے کہا۔ "اب چلیں گے، بہت دیر ہو گئی۔"

رعنا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو ہم بھی چلتے ہیں تمہارے ساتھ۔"

نجمہ نے خوش ہو کر "واہ نیکی اور پوچھ پوچھ، آؤ زبیدہ تم بھی چلو۔"

زبیدہ نے معذرت کر دی۔ نجمہ اور رعنا موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔

زبیدہ نے سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "رعنا اتنی منچلی ہے کہ بعض اوقات اس کی باتوں سے طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ اس وقت نجمہ کی خبر بھی لے رہی تھی۔ اور آپ پر بھی وار کر رہی تھی۔ بُرا نہ مانا کیجیے۔ زبان کی اکھڑ ہے لیکن دل کی صاف ہے۔"

سلیم نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ جواب دیا "نہیں، میں بُرا نہیں مانتا۔"

زبیدہ نے کہا "ذرا دیر میں پھر آ جائے گی اور دماغ چاٹنا شروع

کر دے گی۔ اس کے آنے سے پہلے ہمیں تازہ دم ہو لینا چاہیئے چلئے ذرا گھوم آئیں۔ ابھی آجائیں گے تھوڑی دیر میں!"

سلیم نے بڑی مستعدی اور آمادگی کے ساتھ جواب دیا۔ چلئے، لیکن کہاں چلئے گا؟

وہ بولی "کسی طرف بھی نکل چلیں گے، ذرا سنسان سا راستہ ہو زیادہ بھیڑ بھاڑ سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے!"

دونوں سرکلر روڈ کی طرف چل پڑے۔

---

(۲۲)

تلاشِ وفا

یہ راستہ یوں بھی ذرا کم ہی چلتا تھا، لیکن اس وقت بالکل سنسا[ن] نظر آرہا تھا، کوئی اکا دکا آدمی نظر آگیا تو آگیا، ورنہ زمین کی طرف دیکھئے [تو] حدِ نظر تک سبزہ نورستہ، سر اوپر اٹھایئے تو بادلوں کا لشکر حملہ کرنے کے لئے پا بہ رکاب، داہنے بائیں نظر ڈالیے تو بلند و بالا درخت، وقار کا مجسمہ تند و تیز طوفانی جھکڑوں کے مقابلہ کرنے کو کمر بستہ اور مستعد، منظر بڑا دل[آویز] اور دلکش تھا۔ راستہ میں ایک ٹیلہ سا نظر آیا۔ وہاں چند بنچیں پڑی تھیں

زبیدہ نے ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے بیٹھ لیں کچھ، میں تو تھک گئی ہوں!"

سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے بنچ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ زبیدہ اطمینان سے بیٹھ گئی، لیکن وہ بدستور کھڑا رہا۔

زبیدہ نے کہا۔ "ارے آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھئے۔" وہ بنچ کے ایک کونے پہ بیٹھ گیا۔

ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔ زبیدہ کے خوب صورت بالوں کی لٹیں، اس کی چاند سی پیشانی کو چومنے کے لئے بار بار بکھر رہی تھیں۔ وہ ایک ادا کے ساتھ انہیں ہر دفعہ پرے ہٹا دیتی جیسے کسی ضدی بچے کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا جائے۔ سلیم کی نگاہیں نیچی تھیں اور زبیدہ منظر کی دلربائی سے پورے طور پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ لیکن خاموش وہ بھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سلیم سے سوال کیا "کہیئے، آپ کو اپنا گھر بھی یاد آتا ہے کبھی؟"

سلیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "نہیں۔"

زبیدہ:- ارے آپ کو اپنا گھر نہیں یاد آتا کبھی؟

سلیم:- گھر ہے کہاں جو یاد آئے۔

زبیدہ:- (متاثر ہو کر) تو آپ خانماں برباد ہیں۔

سلیم:- یہی سمجھ لیجئے، نہ ماں ہے، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن، میں ہوں اور خدا کی یہ وسیع دنیا۔ یہی میرا کنبہ ہے۔ یہی میرا خاندان ۔۔۔۔۔۔ یہی میرا گھر ۔۔۔۔۔۔ یہی ۔۔۔۔۔۔"

زبیدہ:- پھر آپ نے شاعری شروع کر دی ۔۔۔۔۔۔ آپ کی شادی ہو گئی ہو گی؟"

سلیم:- جی نہیں، ایک بے روزگار، شادی اور گھریلو زندگی کا تصور مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔

زبیدہ :۔ لیکن اب تو آپ بے روزگار نہیں ہیں، شادی کر لیجئے جلدی سے
میں آپ کی دلہن کو بڑے اچھے تحفے دوں گی ۔"

سلیم :۔ (فیصلہ کن لہجہ میں) نہیں میں شادی نہیں کروں گا ۔

زبیدہ :۔ کیوں بھلا ؟ پھر زندگی کس طرح تیر ہوگی ؟ آخر دنیا میں کوئی تو ایسا ہونا
چاہیئے ۔ جو آپ کو اپنا کہہ سکے ۔ جسے آپ اپنا کہہ سکیں ، یہ خدا کی
وسیع دنیا جسے آپ اپنا کنبہ اور خاندان کہہ رہے ہیں خود غرضوں کی دنیا ہے
اس پر بھروسہ نہ کیجئے ۔ اس پر تکیہ کرنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں ۔

سلیم : (تعجب سے) کیا آپ کو بھی دنیا سے کچھ شکائتیں ہیں ؟"

زبیدہ :۔ بہت زیادہ ، بہت زیادہ ۔

سلیم :۔ حیرت ہے ۔

زبیدہ :۔ میرے دل پہ داغ پڑے ہوئے ہیں ۔ اور یہ داغ انہی دنیا والوں نے
ڈالے ہیں ۔ لوگ مجھے ہنستا اور مسکراتا دیکھتے ہیں ، لیکن انہیں کیا معلوم
اس تبسم میں کتنا سوگ پنہاں ہے ؟ لوگ مجھے خوش و خرم دیکھتے ہیں ۔
لیکن وہ نہیں جانتے ، ان خوشیوں کے پھولوں کے نیچے غم کے کیسے انگارے
دہک رہے ہیں ؟ لوگ مجھے زرق برق لباس میں شاندار بنگلہ میں دیکھتے ہیں
لیکن وہ بالکل نہیں جانتے ، اس زرق برق لباس کی ، اس شاندار بنگلہ کی
اس موٹر کی ، ان زیورات کی کتنی زیادہ قیمت مجھے دینی پڑتی ہے ۔

سلیم :۔ میں کیا سن رہا ہوں مس زبیدہ ؟

زبیدہ : ایک حقیقت ، ایک عریاں اور برہنہ حقیقت

سلیم :۔ اور شاید بہت زیادہ تلخ بھی،

زبیدہ :۔ جی ہاں بہت زیادہ تلخ بھی، اس تلخی کو صرف میں محسوس کرتی ہوں دوسروں کو یہ شیریں ہی نظر آتی ہے۔

سلیم :۔ میں تو آپ کو بہت خوش اور مطمئن سمجھتا تھا۔

زبیدہ :۔ آپ ہی نہیں بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔۔۔۔۔ ابھی آپ نے کہا تھا۔ اس دنیا میں کوئی آپ کا نہیں۔

سلیم :۔ جی ہاں میں نے عرض کیا تھا۔

زبیدہ : بالکل یہی حال میرا بھی ہے۔

سلیم : خدا کے لئے ایسا تو نہ کہئے۔

زبیدہ : سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ کیسے نہ کہوں؟ اور چپ بھی رہوں تو کیا میری خاموشی سے حقیقت بدل جائے گی۔؟۔۔۔۔۔۔۔ بتایئے کون ہے میرا اس دنیا میں؟۔

سلیم :۔ عزیزوں میں رقیہ اور اسلم، بزرگوں میں سکینہ بوا اور دوستوں میں رعنا جیسی مخلص، اور شاید نجمہ صاحبہ بھی ایسی ہی ہوں گی۔

زبیدہ :۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، رقیہ اور اسلم کی صورت میں خدا نے مجھے بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ سچ پوچھئے کہ انہی دونوں کی وجہ سے میں نے یہ زندگی اختیار کی ہے۔ میں مٹ جاؤں اسکا مجھے کوئی غم نہیں۔ یہ بن جائیں یہی سب کچھ ہے۔ سکینہ بوا بھی بڑی وفادار اور جان نثار ہیں، رعنا تو بڑی سچی سہیلی ہے، نجمہ بھی بڑی اچھی دوست ہے، لیکن

کیا ان میں سے کوئی میرے درد کی دوا بن سکتا ہے ؟

سلیم :۔ آپ کا درد ؟ آپ کے درد کی دوا ؟

زبیدہ : جناب ۔۔۔۔۔۔۔۔ درد، اور وہ بھی درد لاندا ۔۔۔۔۔ میں سب کی ہوں اور میرا کوئی نہیں ،

سلیم :۔ جی نہیں چاہتا آپ کی ان باتوں کو باور کرنے کا ۔

زبیدہ :۔ نہ کیجئے ، میں اصرار تو نہیں کرتی کہ باور کر ہی لیجئے ۔ لیکن جو کچھ محسوس کرتی ہوں ، اسے جب تک محسوس کروں گی ، درد بھی محسوس کرتی رہوں گی ۔۔۔۔۔۔

سلیم :۔ کاش ایسا نہ ہوتا ، کاش

زبیدہ :۔ کاش ۔۔۔۔۔۔ یہ لفظ میری زبان پر بھی اکثر آتا رہتا ہے ، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بے معنی لفظ ہے ، کیا معنی ہیں کاش کے ؟ ۔۔۔۔۔ دیکھئے نا میں اس دنیا میں تنہا ہوں ، کاش کوئی ایسا ہوتا جو میری تنہائی کو آزادی سے بدل دیتا ، میں سب کے ساتھ اپنائیت کا برتاؤ کرتی ہوں ۔ کاش کوئی ایسا ہوتا جسے میں اپنا کہہ سکتی ، میں سب کے سامنے ہنستی ہوں ، کاش یہ ہنسی سچی ہوتی ، میں اکیلے میں روتی ہوں ۔ کاش کوئی میرے آنسو پونچھنے والا ہوتا ۔ میں دوسروں کا دکھ درد محسوس کرتی ہوں ، کاش کوئی ایسا ہوتا جو میری روح کی تڑپ ، میرے دل کی بے چینی ، میرے احساس کی چبھن محسوس کر سکتا ! دیکھا آپ نے سلیم صاحب ! "کاش" کی فہرست میرے مختصر کرنے پر بھی طویل ہوتی جا رہی ہے ؟

سلیم :۔ کاش !......

زبیدہ : نہیں، خدا کے لئے یہ لفظ میرے سامنے نہ استعمال کیجئے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

سلیم :۔ بہت بہتر، اب ایسا نہیں کرونگا۔

زبیدہ :۔ (جھنجھلا کر) میں آپ سے اطاعت اور سعادت نہیں طلب کرتی۔ غلط کہتی ہوں تو ٹوک... دیجئے، جھوٹ بولتی ہوں تو روک دیجئے.... خلاف واقعہ کوئی بات میرے منہ سے نکلے تو ضرور اسے رد کر دیجئے، لیکن خالی خولی ہاں میں ہاں نہ ملائیے...... میری ایک بہت بڑی بدقسمتی آپ جانتے ہیں، کیا ہے ؟

سلیم :۔ جب تک آپ خود نہ بتائیں کیسے جان سکتا ہوں ؟

زبیدہ :۔ میری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے کوئی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہر شخص اپنی فکر میں ہے۔ اپنی گھات میں لگا ہوا ہے اپنے داؤ پیچ دکھا رہا ہے۔

سلیم :۔ معاف کیجئے گا۔ میں اب بھی نہیں سمجھ سکا کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

زبیدہ :۔ لوگ مجھے کھلونا سمجھتے ہیں، جب تک چاہا جی بہلایا۔ جب جی بھر گیا، توڑ کر پھینک دیا۔

سلیم :۔ کیا ایسے لوگ بھی ہیں ؟

زبیدہ : جی بہت..... گنیئے، قاسم سیٹھ، خاں بہادر صاحب، نواب

صاحب، فلاں ہیرو، فلاں پروڈیوسر - یہ سب لوگ آخر اور کیا کرتے ہیں ؟ وہ تو میرا دم ہے جو اب تک بچی ہوئی ہوں، لیکن یہ سوچ کر دل لرز جاتا ہے کہ آخر کب تک بچ سکوں گی ؟

سلیم :- (ذرا برہمی کے ساتھ) کیا آپ خطرہ محسوس کرتی ہیں کسی کی طرف سے -

زبیدہ :- خطرہ سے میں نہیں ڈرتی، البتہ اپنے آپ سے اپنی کمزوریوں سے ضرور خائف ہوں - مجھ میں خود اعتمادی کا مادہ بہت زیادہ ہے لوگوں کی ..... چیز نے ابھی تک مجھ پر آنچ نہیں آنے دی، لیکن اب میں حوصلہ ہار رہی ہوں - اب میری ہمت جواب دے رہی ہے - اب میرا اعتماد ڈوبا جا رہا ہے، حد ہوتی ہے ہر چیز کی آخر کب تک اور کہاں تک بغیر کسی سہارے کے لڑتی رہوں ؟

سلیم :- یہ تو ٹھیک ہے، لیکن قاسم سیٹھ اور خاں بہادر صاحب اور نواب صاحب تو آپ کے اشاروں پر چلتے ہیں -

زبیدہ :- تاکہ مجھے اشاروں پر چلا سکیں، جس روز مایوس ہو گئے اس دن مجھے زہر دے دیں گے یا گلا گھونٹ دیں گے -

سلیم :- (بڑی برہمی کے ساتھ) ایسا نہیں ہو سکتا -

زبیدہ :- کیوں نہیں ہو سکتا ؟ میل ملت اگر خلوص پر مبنی ہو، تو نعمت ہے - خود غرضی پر مبنی ہو تو لعنت ہے - یہ لوگ خود غرض ہیں یہ نہیں جانتے کہ خلوص کس چیز کا نام ہے ..... نہ یہ خلوص کے لفظ سے واقف ہیں، نہ

اس کے معنی سے،

ریاضؔ دہر میں ہیں یوں تو رنگ رنگ کے پھول
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

"یہ لوگ مجھ سے وفا کے طالب ہیں ۔خود وفا نا آشنا ہیں۔ ۔ ۔لیکن میں بھی کیسا دکھڑا لے کے بیٹھ گئی ۔آپ بھی کہتے ہوں گے یہ سودائی ہے۔ ۔ ۔ دیکھئے میں نے تو اب تک ایک آنسو بھی آنکھ سے نہیں گرنے دیا، لیکن میرا حالِ زار شاید آسمان تک پہنچ گیا، یا دل میرے حال زار پر زار زار رونے کی تیاریاں کر رہے ہیں، دیکھئے کتنی بڑی بوند پڑی ہے یہ ابھی میرے ہاتھ پر، آیئے جلد نکل چلیں، ورنہ اگر باقاعدہ بارش ہو گئی تو گھر تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

واقعی اکا دکا لیکن بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگی تھیں، یہ اس بات کا اعلان تھا کہ بس اب زور کی بارش ہوا چاہتی ہے!۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں تیز تیز چلنے لگے۔

(۲۳)

شرارت

نجمہ، رعنا کے ساتھ ہوٹل پہنچی، ہنستی، مسکراتی، بل کھاتی، تبسم کی بجلیاں گراتی، اداؤں کے تیر چلاتی، باتیں کرتی، رعنا کو چھیڑتی اور اس کی چھیڑ خانی سے لطف لیتی، اپنے کمرہ میں داخل ہوئی......... لیکن اتنی ہی دیر میں کمرہ کا رنگ یہ ہو گیا کہ جس کمرہ کو مقفل کر کے چابی منیجر کو دے گئی تھی وہ آغوش شوق کی طرح کھلا ہوا تھا۔ جہاں کوئی نہ تھا وہاں اس وقت دو نوجوان میاں بیوی داد عیش دے رہے تھے۔ شوہر کی آنکھوں سے محبت کی بارش ہو رہی تھی، بیوی لجائی، سمٹی، دبی دبی سی بیٹھی تھی۔ لیکن محبت کی سرخی اس کے گالوں پر بکھری ہوئی تھی۔ نجمہ اور رعنا کو دیکھ کر دونوں ششدر رہ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے چہروں پر ناگواری کے آثار تھے۔ یہ دونوں اگر عورت کے بجائے مرد ہوتیں تو شاید شوہر صاحب کان پکڑ کر باہر نکال

یتے، لیکن عورتوں کا، اور وہ بھی نجمہ اور رعنا جیسی تقویٰ شکن عورتوں کا معاملہ تھا، مجبوراً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرد نے پوچھا۔

"آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟"

نجمہ نے ایک نظر کمرے پر ڈالی اور سراپا حیرت بن کر کہا۔

"کیا یہ میرا کمرہ نہیں ہے؟"

اس شخص نے کہا، شوق سے اسے اپنا کمرہ سمجھئے، تشریف لائیے، بیٹھئے

نجمہ نے تیوری چڑھا کر سوال کیا "آپ کا قیام اس کمرہ میں ہے؟"

وہ بولا۔ "جی ہاں، کیا آپ کو اعتراض ہے کچھ؟"

نجمہ نے رعنا سے مخاطب ہو کر کہا .... "شائد ہمیں غلط فہمی ہوئی، آؤ چلیں۔"

دونوں میاں بیوی حیرت سے نجمہ اور رعنا کو دیکھنے لگے، نجمہ رعنا کو لے کر باہر نکلی، کمرہ کے نمبر پر نظر پڑی تو جاتے جاتے ٹھٹھک گئی کہنے لگی نمبر تو وہی ہے! رعنا نے پوچھا، "کیسا نمبر؟" وہ بولی "میرے کمرے کا نمبر ۲۲ تھا۔ دیکھو دروازے پر وہی نمبر درج ہے .... پھر آخرکار معمہ کیا ہے؟"

رعنا:۔ میں کیا جانوں؟ بات ہے تو عجیب سی!

نجمہ:۔ بڑی حیرت ہے،

رعنا:۔ چلو مینجر سے پوچھ لو چل کر، معاملہ کیا ہے؟ اسکو معلوم ہوگا، وہی بتا سکے گا۔

نجمہ :- ہاں ٹھیک ہے آئیے چلیں

مینیجر کمرہ کے سامنے ہی تھا۔ نجمہ برہمی کا پیکر بنی پہنچی، وہ اسے دیکھ کر استقبال کے لئے کھڑا ہوگیا، بڑی خندہ پیشانی سے گویا ہوا۔

"آئیے مس نجمہ، میرے لائق کوئی خدمت ؟"

نجمہ :- کیا آپ بتا سکتے ہیں میرے کمرہ کا نمبر کیا تھا ؟

مینیجر :- جی ہاں، ۲۲

نجمہ :- میں معلوم کرنا چاہتی ہوں، اس وقت وہاں کون مقیم ہے ؟

مینیجر :- جی ہاں، مسٹر کھنڈالا والا - اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ مقیم ہیں۔ ابھی حال ہی میں شادی ہوئی ہے، بڑے اچھے آدمی ہیں ۔ بمبئی میں موٹر کا کارخانہ ہے ان کا۔

نجمہ :- بس ان کی تاریخ نہیں پوچھتی، یہ بتائیے، کیا ایک ہی کمرہ دو آدمیوں کے لئے بھی ریزرو کیا جاسکتا ہے ؟

مینیجر :- ہرگز نہیں .... ایسا کیسے ہوسکتا ہے جناب ؟

نجمہ :- پھر وہ میرے کمرہ میں کیوں قدم رنجہ ہیں؟

مینیجر :- جی کیا فرمایا آپ نے؟

نجمہ :- اور میرا سامان کہاں ہے۔ اس سامان میں میرے قیمتی زیورات اور ملبوسات بھی تو تھے؟

مینیجر :- ضرور ہوں گے۔ بھلا آپ کا مقابلہ کون کرسکتا ہے خدا نظر بد سے بچائے۔

نجمہ :۔ قصیدہ نہ پڑھئے، یہ بتلایئے، وہ سب چیزیں کیوں نکالی گئیں؟ اور اب کہاں ہیں۔ یہ بھی جواب دیجئے کہ آپ کو کیا حق تھا میرا کمرہ کسی اور کو دے دیں

منیجر :۔ (سر کھجاتے ہوئے) آپ تو اسطرح خفا ہو رہی ہیں جیسے میں نے آپ کا کمرہ خالی کرا لیا ہو؟

نجمہ :۔ اگر آپ نے خالی نہیں کرایا تو پھر دوسرا آدمی کیسے پہنچ گیا؟

منیجر :۔ اس لئے کہ آپ نے کمرہ خالی کر دیا تھا۔

نجمہ :۔ یک نہ شد دو شد ..... میں نے خالی کر دیا تھا؟

منیجر :۔ جی بے شک۔

نجمہ :۔ وہ کس طرح

منیجر :۔ آپ کی بہن کے بھیجے ہوئے ایک صاحب یہاں تشریف لائے اور سامان لے گئے کہ آپ وہیں رہیں گی۔

نجمہ :۔ میری بہن .... ؟ وہ میری بہن کونسی ہے جسے میں نہیں جانتی؟

منیجر :۔ یہ میں کیا جانوں؟

نجمہ :۔ وہ آدمی کس وضع قطع کا تھا۔

منیجر نے سلیم کا پورا حلیہ بیان کر دیا۔ نجمہ اور منیجر کی جب جھڑپ شروع ہوئی رعنا کمرے سے باہر آکر برآمدہ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ نجمہ یہ اتہ پتہ کی باتیں سن کر باہر آئی، زور سے ایک چٹکی لی رعنا کے، پھر پوچھا "سلیم صاحب سے کہہ کر تم نے سامان منگایا ہے؟

رعنا نے بے تعلقی کے ساتھ بالکل انجان بن کر کہا "مجھے کیا غرض تھی کس
کا سامان منگانے کی، وہ جو ہیں بی زبیدہ یہ حرکت انہی کی ہو گی، اندر چلیں، ابھی
معلوم ہو جائے گا سب کچھ!

نجمہ نے بگڑتے ہوئے کہا "بڑی بے وقوف ہو، مفت میں ذلیل کیا تم
مینجر کی نگاہ میں، ...... اب سمجھ میں آیا، سلیم صاحب کو راستہ ہی میں روک
کر ان سے کیا باتیں ہو رہی تھیں ؟ ...... پگلی کہیں کی!

رعنا نے مفاہمت آمیز لہجہ میں کہا "اچھا بھئی جو چاہو کہہ لو۔ ہماری لڑائی جھگڑ
کی عادت تو ہے نہیں .... لیکن یہاں سے تو چلو کسی طرح!

نجمہ پھر مینجر کے کمرہ میں پہنچی، اس نے معذرت کی، بل چکایا اور رعنا کے ساتھ
زبیدہ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستہ میں رعنا نے کہا۔

مینجر صاحب سے تو تم نے معذرت کر لی۔ اچھا کیا، لیکن مسٹر کھنڈالا والا نے
کیا خطا کی تھی ؟ ان سے بھی معافی مانگنی چاہیے تھی۔ تمہیں بے چارے کیا کہتے ہوں
گے اپنے دل میں .... نجمہ نے کہا، "دیکھو رعنا اس وقت میں غصہ میں ہوں
تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ چپ رہو، ذرا پہنچ لو تم گھر تک، پھر دیکھنا تمہارے
سلیم صاحب کی کیسی خبر لیتی ہوں۔ زبیدہ تو اس کی بڑی تعریف کر رہی تھیں، لیکن
یہ خدا کا بندہ تو اچھا خاصہ جعلیا نکلا، واقعی چہرہ دیکھ کر کبھی کسی آدمی کے بارے
میں رائے قائم کرنی چاہیئے۔" رعنا نے کہا۔ "ہاں اور کیا چہرہ دیکھ کر تو جانوروں
کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔"

(۲۴)

انکشاف

زبیدہ اور سلیم کے گھر پہنچتے پہنچتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دونوں خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دونوں پر ایک تاثر کا عالم طاری تھا۔ آج کی گفتگو نے سلیم کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا، وہ سوچ رہا تھا، میں تو اپنے ہی کو سب سے زیادہ مظلوم اور مجبور سمجھ رہا تھا، لیکن زبیدہ بھی میری ہمدرد نکلی، میرا درد تو لادوا ہے لیکن کیا زبیدہ کے زخم کا مرہم اور درد کا درماں بھی قدرت مہیا نہیں کرے گی؟

ادھر زبیدہ اپنے کمرہ میں چپ چاپ ایک آرام کرسی پر دراز اپنے حال و مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج جو باتیں اس نے سلیم کیلئے کی تھیں، اب محسوس کر رہی تھی کہ یہ نہ کرنا چاہیئے تھیں۔ اس دنیا میں کون کسی کا ہوتا ہے؟ کیا فائدہ ایسی باتوں سے؟

اہل دنیا ہیں فقط صورت شناس روزِ عیش
شام غم کی تیرگی کون کس کا آشنا

اپنے غموں اور پریشانیوں کا دوسروں کے سامنے اظہار کرنا اپنے آپ کو سبک کرنا ہے۔

اب رات شروع ہو چکی تھی، زبیدہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو اس نے سنا سلیم کے کمرہ سے نجمہ کی آواز آ رہی ہے، جیسے وہ خفا ہو رہی ہو یا رہی ہو۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ تیر کی طرح سیدھی وہاں گئی بی جمالو یعنی رعنا الگ ایک گوشہ میں کھڑی "فلم انڈیا" کی ورق گردانی کر رہی تھیں اور... نجمہ سلیم سے الجھی ہوئی تھی قبل اس کے کہ زبیدہ نجمہ یا سلیم سے پوچھے یہ کیا ہو رہا ہے؟ رعنا فلم انڈیا لئے ہوئے اس کے پاس آئی اور ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو تمہاری یہ تصویر کتنی شاندار آئی ہے۔؟"

زبیدہ نے بے توجہی کے ساتھ کہا "ہاں ہو گا۔ اتنے میں نجمہ کی آواز اس کے کان میں آئی۔

"سلیم صاحب، ویسے تو آپ بڑے نیک اور سیدھے معلوم ہوتے ہیں لیکن نکلے بڑے حضرت!

سلیم نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے، ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہے!"

اس جواب سے نجمہ کی آن کو ٹھیس سی لگی، اس نے بگڑتے ہوئے...

لہجہ میں سوال کیا۔

"آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں ؟

سلیم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھے نیک اور سیدھا سمجھتی تھیں، حالانکہ میں خود !

نجمہ نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

"لیکن میں آپ کو رنگا سیار بھی تو سمجھتی ہوں۔"

سلیم نے اسی معصومیت کے ساتھ جواب دیا

"لیکن میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔!"

زبیدہ :- نجمہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ سلیم صاحب سے لڑ رہی ہو،

نجمہ :- سلیم صاحب .... ان کی وجہ سے آج مجھے بہت ذلیل ہونا پڑا

زبیدہ :- یہ بیچارے نہ کسی کے بھلے میں نہ برے میں - ان کی وجہ سے کوئی کیسے ذلیل ہو سکتا ہے ؟

نجمہ :- اسی حسن ظن نے تو ان حضرت کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا ہے۔

زبیدہ :- تو کیا اب مجھ سے لڑو گی ؟ .... کچھ معلوم بھی تو ہو بات کیا ہے ؟

نجمہ نے ساری رام کہانی از اول تا آخر سنا ڈالی - اور زبیدہ نے سلیم صاحب سے دریافت کیا۔

"کیوں سلیم صاحب یہ سچ ہے ؟"

سلیم :- جی ہاں یہی تو ہے!

زبیدہ :- یہ آپ کو کیا سوجھی تھی ..... کیوں آپ ہوٹل سے نجمہ کا سا[مان]
چپ چپاتے لے آئے جا کر؟ اور اگر ایسا کیا تھا تو مجھ سے تو ذ[کر کرنا]
چاہیئے تھا۔

سلیم :- مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ آپ کہہ رہی ہیں، میں ہوٹل جاؤں اور مس [نجمہ]
کا سامان لا کر، آپ کے کمرہ سے ملے ہوئے کمرہ میں سجا دوں، میں
نے سامان لا کر وہاں سجا دیا، آپ سے یوں نہیں کہا کہ جب آپ [نے]
خود ہی اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تو میں کیوں کچھ کہتا۔ میر[ے]
اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ آپ کے ارشاد کی میں نے تعمیل کر دی!

زبیدہ :- آخر کس نے میری طرف سے آپ کو سامان لانے کے [لئے]
بھیجا تھا۔

سلیم :- جی، مس رعنا نے!

زبیدہ :- کیوں رعنا، تم چپ چاپ کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی ہو۔ بتاتی[ں]
نہیں کہ معاملہ کیا ہے؟

رعنا :- معاملہ وہی ہے جو سلیم صاحب کہہ رہے ہیں ....
ان کی بات جھٹلاؤں تو یقین کر لو گی؟ تمہارے نزدیک تو وہ آسمان [سے]
اترے ہوئے فرشتے ہیں، پھر بھلا فرشتہ کی تردید کر کے میں کیو[ں]
نکو بنوں

نجمہ :- بہرحال سلیم صاحب آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا..... یہ بڑ[ی]

ناروا حرکت سرزد ہوئی ہے ان سے، کم از کم میں تو ایسی باتیں کبھی نہیں برداشت کر سکتی۔

سلیم۔ اچھا تو میں وہ سامان لے جا کر پھر رکھے دیتا ہوں ہوٹل میں —— مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہ شرارت ہے تو ہرگز حصہ نہ لیتا اس میں،

رعنا۔ کیوں سلیم صاحب آپ ہمیں شریر کہہ رہے ہیں، یاد رکھئے گا۔

سلیم۔ میں نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔

رعنا۔ اور اگر کہا تو صرف شریر کہا، بہت معمولی بات ہے، بھلا اس کا بھی کہیں برا مانا جا سکتا ہے؟ واقعی اس دنیا میں کیسے کیسے بگلا بھگت موجود ہیں، آج اندازہ ہوا مجھے —— بہت اچھا جناب ساری خطا میری ہی ہے۔ سر جھکا ہوا ہے، گردن مار دیجئے، نہ زبیدہ نے کچھ کہا نہ آپ نے کچھ کہا، بس میں ہی خطاوار اور مجرم ہوں، وہ تو جب آپ نجمہ کو دیکھ کر گھبرائے ہیں، اسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ ساری آئی گئی مجھ پر ہو گی۔

سلیم۔ کیا آپ کا خیال ہے، میں نے جو کچھ کیا، اپنی رائے اور مرضی سے کیا۔

رعنا۔ نہیں صاحب، میں کچھ نہیں کہتی، بھلا میں بے چاری کیا، اور میرا خیال کیا۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا؟ زبیدہ اس گھر کی مالک ہیں، ہم لوگ ٹھہرے ان کے دبیل جو چاہے کہہ لیجئے سننا ہی پڑے گا۔ مجال ہے کہ چوں کر سکوں؟

زبیدہ نے ایک دوہتڑ رعنا کی پیٹھ پہ مارا۔ "چل یہاں سے۔" [illegible]
نجمہ کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آئی، مسکراتی ہوئی۔

(۲۵)

معذرت

نجمہ کے آنے سے گھر کا ماحول بدل گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قہقہوں کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا، یوں تو رعنا ہی کیا کم تھی، لیکن نجمہ نے آکر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ بڑی دیر تک زبیدہ، نجمہ اور رعنا کی محفل جمی رہی۔ سلیم اپنے کمرے میں خاموش اور افسردہ لبستر پہ دراز تھا۔ اس کے کانوں میں نقرئی قہقہوں کی سامع نواز آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آج اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ سوچ رہا تھا آخر میرے اندر وہ کونسا نقص ہے جس نے اس گھر میں ہر شخص کو مجھ سے غیر مانوس بنا رکھا ہے۔ بے شک زبیدہ میری محسن ہے اس نے اگر مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا۔ شاید کہیں آٹھ آنے روز پہ مزدوری کر رہا ہوتا، اس نے مجھے سہارا دیا، پناہ دی انہائیت کا برتاؤ کیا۔ میرے دکھ درد کو محسوس کیا۔ میری راحت اور آرام

خیال رکھا۔ لیکن میرا اس کا تعلق اس سے زیادہ تو نہیں کہ میں ایک قاب
آدمی ہوں۔ اور وہ اپنے رحم و کرم کی دولت مجھ پر لٹا رہی ہے۔ میں نے ا
کے گھر میں اپنی جگہ بنائی، لیکن اس کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا سکا۔ اور شا
بھی نہیں سکتا۔ کہاں گنگو تیلی، کہاں راجہ بھوج۔ کہاں وہ، کہاں میں
ایک ذرۂ ناچیز، اور کہاں آفتابِ عالم تاب،

اور یہ رعنا ــــــ ہنس مکھ ہے، شوخ ہے، چنچل ہے، حا
جواب ہے، لیکن اس کے یہ سارے کمالات صرف مجھے ذلیل کرنے
صرف ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بناتی ہے، میرا مذاق اڑاتی ہے، مجھے حقیر
ہے۔ مجھ پر طعن کرتی ہے۔ مجھے بے مایہ خیال کرتی ہے۔ جب موقع ملتا
میرے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرتی ہے، میں خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں
برداشت کر لیتا ہوں۔ آخر کیوں؟ کہاں میری خودداری کا یہ عالم تھا کہ
سے بے گھر ہو گیا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی رقمِ خطیر پر مڑ کر نظر بھی نہ ڈالی، ک
ذلتِ نفس کی یہ کیفیت کہ جو چاہے مجھے ذلیل کرے۔ میرا سر جھکا ہوا۔ آخر
یہ کمزوری مجھ میں کیسے پیدا ہو گئی۔ کیا اس کا واحد سبب ز
نہیں ہے؟ میں اس سے مرعوب ہوں، متاثر ہوں، کوئی ایسی با
نہیں کر سکتا جو اسے ناگوار ہو۔ لہٰذا مجبوراً رعنا کی ہر طرح کی باتیں سن
اور برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

نجمہ کو ابھی آئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی ہے، کئے آمدی دیکھے
شدی، لیکن وہ بھی جلال دکھاتی ہوئی تشریف لائیں اور اس طرح گ

اور یہ بس گویا میں ان کا زرخرید غلام ہوں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹا، بگڑ بیٹھا ہوتیں اور میں چپ چاپ سنتا رہا جیسے وہ مجھے برا بھلا نہیں کہہ رہی تھیں۔ کوئی مدھرا گیت گا رہی تھیں، جسے محویت اور بے خودی کے عالم میں سن رہا تھا —— اور ستم ظریفی دیکھئے یہ سب کچھ زبیدہ کی موجودگی میں ہوا۔ اس کے سامنے ہوا، وہ ہنستی رہی، مسکراتی رہی اور ساری باتیں اس طرح سنتی رہی جیسے جو کچھ ہو رہا ہے بالکل بجا اور درست ہے، میں اسی قابل ہوں کہ گالیاں سنوں، دوسرے لوگ اس گھر میں اس لئے آتے ہیں کہ مجھے گالیاں دیں؟ کوئی پوچھے، آخر مجھے کیا غرض پڑی تھی کہ ہوٹل جا کر سامان لے آتا۔ ایک معمولی آدمی کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیئے تھی کہ بغیر کسی کے اشارہ اور مرضی کے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، لیکن کسی سے تو کچھ نہ کہا گیا، میں ہدفِ ستم بنا لیا گیا۔

پھر آخر میں کیا کروں؟ —— کہاں جاؤں؟ —— کہاں رہوں؟

اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے، وہ چونک پڑا، بڑی دیر ہو گئی۔ اب مجھے سونا چاہیئے، صبح اٹھ کر بہت سے کام کرنے ہیں۔ کہانی کے مکالمے درست کرنا ہیں، گیت لکھنا ہیں۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا کہ بجلی آف کر دے اور بستر پہ دراز ہو جائے۔ زبیدہ کے کمرے سے ہنسی اور قہقہوں کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ شاید سونا پڑ گیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا ہی تھا کہ کسی کی چاپ سنائی دی۔ پھر دستک کی آواز آئی۔ اس نے پوچھا،

کون ہے ؟

جواب میں سوال کیا گیا

"سلیم صاحب! کیا آپ جاگ رہے ہیں ؟"

یہ آواز رعنا کی تھی، خون کھولنے لگا یہ آواز سن کر مجبوراً جواب دیا۔

"جی ہاں! مس رعنا، خاکسار ابھی جاگ رہا ہے!"

پھر سوال کیا گیا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں ؟"

یہ بڑا بے ڈھب سوال تھا، لیکن جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ

"تشریف لائیے۔"

رعنا اندر چلی آئی۔

بارہ بج چکے ہیں اور آپ ابھی تک اختر شماری میں مصروف ہیں

سلیم۔ بس اب سونے جا ہی رہا تھا۔

رعنا۔ تو کیا میں چلی جاؤں ؟

سلیم۔ نہیں تشریف رکھئے ——— لیکن اس وقت آپ نے زحمت کیسے کی ؟

رعنا۔ مجبور ہوگئی۔ جب کسی کل چین نہ ملا تو آنا ہی پڑا۔

سلیم۔ خیریت تو ہے ؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں ؟ آپ بے چین کیوں ہیں

رعنا۔ آپ کی وجہ سے،

سلیم۔ تعجب ہے اتنی دور بیٹھی آپ دل کی فریاد سن لیتی ہیں؟

رعنا۔ دل کی فریاد، ——— یعنی؟

سلیم۔ یعنی کچھ نہیں،

رعنا۔ سلیم صاحب میں آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں۔

سلیم۔ وہ کس تقریب میں؟

رعنا۔ اوہو، آپ تو بےحد خفا معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کب تک روٹھے رہیں گے آپ؟

سلیم۔ یہ آپ نے دوسری دلچسپ بات کہہ دی۔ بھلا میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟"

رعنا۔ آپ لاجواب ہو سکتے ہیں۔ میں اسے کبھی نہیں مان سکتی۔

سلیم۔ آپ تو صرف وہی مانیں گی جو ماننا چاہیں!

رعنا۔ وہی جلی کٹی باتیں ——— خدا شاہد ہے سلیم صاحب کہ نجمہ نے آپ کی توہین کی ہے، میں اس سے لڑ کر آ رہی ہوں۔

سلیم۔ توہین کا تو میں عادی ہو چکا ہوں۔ مس نجمہ نے اگر ایک بار توہین کی، تو آپ ہر روز کرتی رہتی ہیں۔

رعنا۔ آپ سے اسی جواب کا اندیشہ تھا مجھے۔

سلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اندیشہ پورا ہوا۔

رعنا۔ سلیم صاحب! میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔

سلیم۔ ضرور ہوگی، آپ کی اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے
الفاظ نہیں ملتے مجھے،

رعنا۔ شاید آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟

سلیم۔ فرض کر لیجئے سمجھ رہا ہوں، پھر بھی میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گا۔

رعنا۔ آپ برابر میرا دل دکھائے جا رہے ہیں

سلیم۔ مس رعنا! کیا آپ کے سینہ میں دل بھی ہے؟

رعنا۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ آپ بول رہے ہیں؟ ——— آپ؟
جس کے بارے میں مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ ہر فن آتا ہے مگر بولنا نہیں
آتا اور پھر یہ بے دردانہ انداز گفتگو! کہہ دیجئے، میں جھوٹی ہوں،
اگر آپ یہ کہہ دیں گے تو مجھے خوشی ہوگی،

سلیم۔ یعنی اپنے جھوٹے ہونے پر آپ خوش ہونگی

رعنا۔ جی ہاں، یہ مجھے گوارا ہے لیکن یہ باور نہیں کرنا چاہتی کہ آپ ایسی جلی
کٹی باتیں کر سکتے ہیں، اتنے سفاک اور ایسے سنگ دل ہیں کہ دوسروں
کا دل چھلنی کر دیں گے اپنے طنز کے تیروں سے۔

سلیم۔ مس رعنا! مجھے حیرت ہے کہ یہ بول آپ کے منہ سے نکل رہے
ہیں۔

رعنا۔ کیوں؟ حیرت کس بات پر؟

سلیم۔ جس کا شب و روز کا مشغلہ ہی یہ ہو کہ دوسروں کا دل توڑے
دوسروں کی توہین و تذلیل کرے، دوسروں کو حقیر اور کم مایہ سمجھے،

اسے یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ اپنے کشتۂ ستم کے زخم پر مرہم رکھے، معاف کیجئے، میرے دل میں ایک اور اندیشہ بھی پیدا ہو رہا ہے۔

رعنا۔ اسے بھی کہہ ڈالئے۔

سلیم۔ کہیں یہ وہی انداز تو نہیں جو بلی چوہے کے ساتھ روا رکھتی ہے؟ جب تک اسے ہلاک نہیں کر دیتی، اس کے ساتھ کھیلتی اُسے کھلاتی رہتی ہے، اسے پکڑ لیتی ہے، پھر چھوڑ دیتی ہے، جب وہ بھاگنے لگتا ہے تو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب زد سے باہر نکلنے کو ہوتا ہے تو ایک ہی جست میں پھر اسے پکڑ لاتی ہے، پھر اسے جھنجھوڑتی ہے۔ پھر اپنے ریشمی بالوں اور مخملی کھال کے غلاف خون آشام پنجے باہر نکالتی ہے اور گڑو دیتی ہے اس کے جسم ناتواں میں

رعنا۔ (ذرا بلند آواز سے) سلیم صاحب!

سلیم۔ جی فرمایئے، میں سن رہا ہوں۔

رعنا۔ جتنا دکھ میں نے آپ کو اتنے دنوں میں اب تک پہنچایا تھا، آپ نے اس وقت اُس سے زیادہ پہنچا دیا۔ اب معاف کیجئے، رحم کیجئے اس سے زیادہ برداشت کی تاب و تواں مجھ میں نہیں ہے۔

سلیم۔ بہت خوب، تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ چپ ہوا جاتا ہوں، اب کوئی لفظ میرے منہ سے نہیں نکلے گا۔

رعنا۔ کیا آپ مجھے، معاف نہیں کر سکتے؟

سلیم۔ اگر آپ یہ لفظ میرے منہ سے کہلوانے پر بضد ہیں، تو چاہیے ایں
ںنے معاف کر دیا —— بس؟

رعنا۔ سچ مچ کر دیجیے، میرا مطلب یہ ہے کہ سچے دل سے۔

سلیم۔ آپ کس طرح باور کریں گی کہ میں سچ بول رہا ہوں؟

رعنا۔ اچھا رہنے دیجیے، نہ معاف کیجیے، میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔

سلیم نے نظر اوپر اٹھائی تو رعنا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بڑے بڑے
قطرے تیر رہے تھے۔ سلیم نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ بجلی کی سی تیزی سے نکل چلی گئی۔

---

(۲۶)

بھرا ہوا پستول

صبح سلیم کی آنکھ بہت دیر میں کھلی، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قاسم سیٹھ اپنی پوری سرمایہ دارانہ شان سے موجود ہیں، آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے ماتھران سے اچھی کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں کے دلکشا اور روح پرور مناظر فلم میں جان ڈال دیں گے۔ پھر اتفاق سے زبیدہ موجود ہی ہے، شہر کی گہما گہمی، کمپنی کی بے پناہ مصروفیت اور دوسری مصروفیات کے سبب زبیدہ سے یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا، سوچا یک کرشمہ دو کار۔ ماتھران کی سیر بھی ہو جائے گی، آؤٹ ڈور شوٹنگ کا پروگرام بھی مکمل ہو جائے گا۔ اور جی کھول کے نہایت یک سوئی اور فراغِ خاطر کے ساتھ وہ تمام باتیں کر لی جائیں گی جو ایک عرصہ سے دماغ میں گردش کر رہی ہیں ——

زبان تک آنے کا جنہیں موقع نہیں ملتا۔ یہ سوچتے ہی انہوں نے ماتھران کا پروگرام بنایا۔ اسٹاف کو ساتھ لیا اور چشم زدن میں یہاں پہنچ گئے۔ ٹیکنیشینس اور آرٹسٹس تو ہوٹل میں ٹھہرا دیئے گئے۔ خود ناخواندہ مہمان بن کر زبیدہ کے بنگلہ پہ پہنچ گئے، اور یہ دیکھ کر پھولے نہ سمائے کہ رعنا اور نجمہ بھی موجود ہیں۔ رعنا سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی، اسی طرح نجمہ سے وہ بے تکلف ضرور تھے لیکن ذرا خفا بھی تھے۔ پہلے نجمہ انہی کی فلم کمپنی میں کام کرتی تھی، اور یہ اس پہ ضرورت سے زیادہ مہربان بھی تھے۔ وہ بھی سراپا سپردگی بنی ہوئی تھی۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ جس نے نجمہ سے بمبئی چھڑا دیا۔ جس فلم میں وہ کام کر رہی تھی، اس کا ہیرو "تنویر" تھا۔ سیٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی اور بہت جلد رومان میں تبدیل ہوگئی، پھر جلد ہی اس رومان نے شادی کی صورت اختیار کرلی۔ قاسم سیٹھ کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے دونوں کو چلتا کر دیا، کچھ عرصہ بعد "تنویر" کو پونا کی ایک فلم کمپنی میں جگہ مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی نجمہ بھی نتھی ہوگئی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا قاسم سیٹھ کے دل کا گھاؤ بھرتا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ نجمہ کی نالائقی بھول گئے۔ اب جب بھی ملاقات ہوتی وہی بے تکلفی پھر عود کر آتی۔

اس وقت وہ بڑے مزے میں کرشن کنھیا بنے اپنی گوپیوں میں بیٹھے تھے، ہنسی، قہقہے اور دل لگی کا سلسلہ جاری تھا، کبھی زبیدہ پر فقرہ سمر کر دیتے، کبھی رعنا پہ کوئی جملہ چست کر دیتے۔ کبھی نجمہ کی شامت آجاتی۔

زبیدہ بھی اس وقت ترنگ میں تھی۔ خوب گل افشانیاں کر رہی تھی، یہی حال نجمہ اور رعنا کا تھا۔ یہ دونوں بھی بلبل کی طرح چہک رہی تھیں۔ اتنے میں سلیم ادھر سے گذرا، اسے دیکھ کر قاسم سیٹھ کی تیوری چڑھ گئی نجمہ مسکرانے لگی۔ رعنا نظر نیچی کئے بیٹھی رہی۔ زبیدہ بالکل غیر متعلق نظر آ رہی تھی قاسم سیٹھ نے سلیم کو للکارا۔

سلیم صاحب آداب عرض!

سلام کا جواب دے کر وہ بیٹھ گیا۔

قاسم سیٹھ۔ ہیں آپ بڑے ضدی،

زبیدہ۔ یہ آپ نے کیسے جانا؟

قاسم سیٹھ۔ میں منع کرتا رہ گیا۔ لیکن یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے ایک نہ سنی مانتھران چلے آئے۔

زبیدہ۔ (حیرت سے) کیا آپ نے منع کیا تھا انہیں؟

قاسم سیٹھ۔ ہاں بھئی کئی کام تھے جو ان سے لینے تھے۔ مگر یہ کسی کی کب سنتے ہیں۔

زبیدہ۔ تعجب ہے —— سلیم صاحب آپ نے مجھ سے تو اس کا ذکر نہیں کیا۔

سلیم۔ ضرورت بھی نہ تھی۔

قاسم سیٹھ۔ سلیم صاحب، ابھی تو تمہارا نام بھی کچھ اتنا نہیں اچھلا ہے ابھی سے اڑنے لگے، اتنی تمیز بھی نہیں کہ عورتوں سے باتیں کس طرح

کی جاتی ہیں؟ مس زبیدہ کے سوال کا جواب اتنا ہی گستاخانہ ہو
چاہیئے تھا؟ اسی لب و لہجہ میں۔

زبیدہ۔ لیکن سیٹھ صاحب، مجھے تو کوئی شکایت نہیں، آپ کیوں خفا
ہو رہے ہیں بیچارے پر؟

قاسم سیٹھ۔ نہیں مس زبیدہ، یہ نباہ کے لچھن نہیں ہیں، اس طرح ہمارا ان
کا گذر نہیں ہو سکتا، انہیں اگر اپنے قلم پر ناز ہے تو ہمیں اپنے
روپے پر گھمنڈ ہے۔ یہ اچھی سے اچھی کہانی اور گیت لکھ سکتے ہیں۔ ہم
زیادہ سے زیادہ دام دے کر ایک سے ایک کہانی اور گیت خرید سکتے ہیں
ہمارے پاس تو اسی کا گذر ہو سکتا ہے جو ہمارے اشاروں پر چلے
سن لیا آپ نے سلیم صاحب؟

سلیم۔ جی ہاں سن لیا۔

قاسم سیٹھ۔ تو پھر کیا فیصلہ ہے آپ کا؟

سلیم۔ جو ایک شریف اور خوددار آدمی کا ہونا چاہیئے۔

قاسم سیٹھ۔ یعنی؟

سلیم۔ یعنی یہ کہ میرا اور آپ کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

زبیدہ۔ سلیم صاحب آپ تو خفا ہو گئے۔

سلیم۔ مس زبیدہ! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن بدتمیزی اور
بیہودگی نہیں برداشت کر سکتا۔

قاسم سیٹھ۔ (گرج کر) میں بدتمیز ہوں، میں بے ہودہ ہوں ——؟

سلیم۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔

قاسم سیٹھ۔ معلوم ہوتا ہے شامت آئی ہے تمہاری۔

سلیم۔ اگر آپ خفا نہ ہو گئے تو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کس کی شامت آئی ہے

قاسم سیٹھ۔ (چیخ کر) سلیم!

سلیم۔ (نہایت سنجیدگی سے) میں آپ سے ذرا بھی بے تکلف نہیں ہونا چاہتا سلیم صاحب کہیئے، ورنہ میری زبان سے بھی صرف قاسم سننے کے لئے تیار رہیئے۔

قاسم سیٹھ۔ (جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) میری جیب میں ہمیشہ بھرا ہوا پستول رہتا ہے اور یہ پستول کئی زندگیوں کے فیصلے بھی کر چکا ہے، زیادہ غصہ نہ دلایئے سلیم صاحب!

سلیم۔ پستول نکالیئے، ـــــ لیکن نکالنے سے پہلے یاد رکھئے کہ پستول اسی کا دوست ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہو۔ اپنے ہاتھوں کا جائزہ لے لیجئے، کہیں وہ کمزور نہ ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پستول کو اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکیں۔ سن لیا آپ نے سیٹھ صاحب!

قاسم سیٹھ۔ میں شوٹ کر دونگا۔

سلیم۔ تو انتظار کا ہے کا ہے؟

قاسم سیٹھ نے پستول نکال لیا، لیکن سلیم نے اتنی تیزی سے ان کے ہاتھ کو گرفت میں لے کر پستول چھینا کہ چشم زدن میں ہاتھ تبدیل ہو چکے تھے۔

اب پستول قاسم سیٹھ کے ہاتھ میں نہیں سلیم کے ہاتھ میں تھا۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہوا کہ زبیدہ، رعنا اور نج
ششدر رہ گئیں۔ خود قاسم سیٹھ کا بھی یہ حال تھا کہ ہوائیاں چھوٹ رہی تھی
آج جو کچھ ہوا بالکل خلاف توقع تھا۔ انہیں سلیم سے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ
ترکی بہ ترکی جواب دیگا۔ وہ سمجھتے تھے۔ یہ بھی دوسرا برق ہے۔ گالیاں بھی
کھائے گا اور ٹھوکریں بھی۔ مگر حدِ آداب سے قدم باہر نہ نکالے
لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ قاسم سیٹھ
کا پستول واقعی بڑا خوفناک اور خطرناک تھا۔ سچ مچ یہ کئی زندگیاں ختم
کر چکا تھا اور کسی مرتبہ بھی اپنے سرمایہ دار مالک کی دولت اور ثروت
کے باعث گرفت میں نہیں آیا تھا۔ اس پستول پر انہیں بڑا ناز تھا
اسے وہ لاڈلے بچے کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ لیکن وہ لاڈلا بچہ دغا دے
گیا۔ قاسم سیٹھ کی گود سے ایک چھلانگ لگائی اور سلیم کے ہاتھوں میں
گیا۔ اب تک قاسم سیٹھ سمجھ رہے تھے کہ سلیم کی زندگی ان کے رحم و کرم
پر ہے، اب انہیں اپنی زندگی سلیم کے رحم و کرم پر نظر آ رہی تھی۔ زندگی
میں پہلی مرتبہ موت ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی، اپنے بارے میں ا
کا خیال تھا کہ ایک لامعلوم مدت تک نہیں مریں گے۔ اور جب بھی مریں
گے بڑے آدمیوں کی طرح بستر پر آرام کرتے کرتے مریں گے۔ یہ کبھی نہیں
سوچا تھا کہ کتے کی موت مارے جائیں گے، دشمن کے ہاتھ میں پستول ہوگا
ان کا سینہ گولی کی زد پر ہوگا۔ اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے ہوں گے۔

قاسم سیٹھ کا چہرہ فق تھا، ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا سارے بدن پر رعشہ کی کیفیت طاری تھی، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر زبان یاری نہیں دیتی تھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتے تھے۔ مگر قدموں میں دم کہاں؟ وہ سلیم کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے مگر کیا انہی ہاتھوں سے جو پستول کی لبلبی تک نہ دبا سکے۔

اب کیا ہوگا؟ —— کیا بمبئی سے ماتھران مجھے موت کھینچ کر لائی تھی؟ کیا یہاں سے میرے بجائے میری لاش واپس جائے گی؟ —— قاسم سیٹھ کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔

پستول بدستور سلیم کے ہاتھ میں تھا، وہ انہیں گھورے جا رہا تھا اس کی نگاہ میں نفرت، حقارت اور بیزاری کا طوفان جھلک رہا تھا۔ بار بار وہ پستول کو جنبش دیتا تھا۔ مگر پھر رک جاتا تھا نجمہ اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ رعنا کے چہرے پر اس وقت سرور و نشاط کی ایسی کیفیت نمایاں تھی جسے کسی طرح بھی وہ چھپانے پر قادر نہیں تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ حاضرین میں سے کوئی اس کیفیت کو محسوس نہیں کر سکا۔ کیونکہ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ نہ بیدہ کا چہرہ اس وقت بھی سنجیدہ تھا، اس پر نہ برہمی کی کیفیت تھی نہ اضطراب کی، نہ خوف و دہشت کی،

سلیم نے پستول کو تولتے ہوئے ایک نظر قاسم سیٹھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو ہاں سیٹھ صاحب مجھے افسوس ہے کہ آپ کا پستول بے و
اور دغا باز نکلا، میں نے اسے بلایا۔ وہ آپ کے پاس سے چپ چاپ
چلا آیا۔ اگر آپ بلائیں تو ہرگز وہ میرے پاس سے نہیں جائے گا۔ آپ
کئی زندگیوں کا کھیل اس کی نالی سے کھیل چکے ہیں، یہ میں آپ پ
الزام نہیں لگاتا، آپ نے خود ہی اعتراف فرمایا تھوڑی دیر پہلے
اور اب یہ آپ کی زندگی سے کھیلنے پر مچلا ہوا ہے۔ کافی ضدی او
سرکش معلوم ہوتا ہے، شاید مجھے اس کی ضد پوری کرنا پڑے گی —
—— تیار ہو جائیے سیٹھ صاحب، شاید آپ کو وصیت کا وق
بھی نہ مل سکے۔

یہ کہہ کر سلیم نے پستول سنبھال لیا۔ گویا اب وار کیا ہی چاہت
ہے۔ قاسم سیٹھ پر مُردنی طاری ہو چکی تھی، صاف معلوم ہوتا
تھا کہ چند لمحوں کے اندر اندر حرکتِ قلب بند ہونے کا قوی
امکان ہے

اتنے میں زبیدہ اٹھی اور لپک کر سلیم کے پاس پہنچی۔ اس نے
پرسکون اور پراعتماد لہجہ میں کہا۔

"پستول مجھے دیدیجئے سلیم صاحب؟"

سلیم نے ایک نظر زبیدہ پر ڈالی۔ کچھ سوچا، اور پستول اس
کے حوالے کر دیا۔

زبیدہ نے کہا۔

اب آپ جا سکتے ہیں؟"

وہ الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

---

(۲۷)

شہرِ خموشاں

جو گھر ابھی قہقہوں اور چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ دفعتاً وہاں
کا سناٹا چھا گیا ـــــ سلیم کی جرأتِ رندانہ نے فضا کو بدل دیا۔ ای
عجیب قسم کی دہشت چھائی ہوئی تھی، ساری فضا پر۔ سب لوگ اس طر
خاموش بیٹھے تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو انہیں، نہ کوئی حرک
نہ جنبش، نہ ہنسی، نہ دل لگی، نہ چھیڑ چھاڑ، نہ شوخی، اور نہ بذل
نہ بحث و گفتگو، نہ تبادلہ خیال اور تنقید و نکتہ چینی، گھر کیا
شہرِ خموشاں تھا۔

حاضرین میں سے ہر شخص چاہتا تھا کہ طلسم سکوت ٹوٹے لیکن
کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، بڑی دیر اسی طرح گذر گئی، آخر
کو رحم آیا، دفعتہً ڈائریکٹر، کیمرہ مین، ڈانس ڈائریکٹر، میوزک ڈائریک

سٹرا گرلس، ہیرو اور دوسرے بہت سے متعلق لوگ جنہیں قاسم سیٹھ نے ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ آگئے، ڈائریکٹر صاحب نے آتے ہی کہا۔ "لیجیے سیٹھ صاحب کام بن گیا۔ ایک ایسا دلفریب منظر منتخب کر کے آیا ہوں کہ تصویر میں جان پڑ جائے گی۔ چلیے، آپ بھی دیکھ لیجیے یں کہ۔ اگر آپ کو پسند آگیا تو دو گھنٹے کے اندر ہم شوٹنگ شروع کر دیں گے۔"

قاسم سیٹھ کا دل بجھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"آپ نے پسند کر لیا تو ٹھیک ہی ہے، جائیے شوٹنگ کا انتظام کیجیے۔"

ڈائریکٹر صاحب مچل گئے۔ "یہ نہیں ہو سکتا، آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔ آئیے، اٹھیے، چلیے، بس اب زیادہ غور نہ کیجیے۔"

ڈائریکٹر صاحب قاسم سیٹھ سے بے تکلف تھے۔ انہوں نے ایک نہ سنی، آخر سیٹھ صاحب کو بادلِ نخواستہ اٹھنا پڑا۔ زبیدہ نے کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔" لیکن ڈائریکٹر صاحب نے روک دیا۔ "نہیں اتنے عرصہ میں اپنا میک اپ وغیرہ ٹھیک کر لیجیے، ہم لوگ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں آجائیں گے۔ کھانا یہیں کھائیں گے، پھر یہیں سے شوٹنگ میں چلے چلیں گے۔" قاسم سیٹھ کو ڈائریکٹر صاحب کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں تھا۔ وہ زبیدہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن خاموش رہے۔

سیٹھ صاحب کے چلے جانے کے بعد، زبیدہ سلیم کے کمرے میں

پہنچی، اس کے چہرہ پر برہمی اور غصّہ کے آثار اب تک موجود تھے۔ وہ
آرام کرسی پر لیٹا، سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ زبیدہ کو آتا دیکھ
کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیے آپ بھی!"

وہ بیٹھ گیا، زبیدہ نے کہا۔

سلیم صاحب، آج کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ اتنا غُصّہ؟

سلیم نے جواب دیا۔

"اگر میری اس حرکت سے آپ کو صدمہ پہنچا ہے، تو میں معافی
مانگتا ہوں لیکن جو کچھ میں نے کیا، اس پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں"

زبیدہ۔ میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آئی، صرف یہ پوچھنے آئی ہوں
غصّہ آپ کو بھی آتا ہے؟ اور اتنا شدید؟ سچ سلیم صاحب
میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔

سلیم۔ آپ کے خیال میں قاسم سیٹھ کے تلخ الفاظ، شیر و شکر کی طرح
پی لینے چاہیئے تھے۔ ان کی دھمکی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے
تھا؟ ان کی امارت اور سرمایہ داری کے سامنے سر بسجود ہو
جانا چاہیئے تھا مجھے؟ جب انھوں نے پستول نکالا تھا تو سینہ
آگے کر دینا چاہیئے تھا، کہ ہدف موجود ہے شوق سے مشق فرمائیے
——— مس زبیدہ، یقین کیجیے، اگر یہ گھر آپ کا نہ ہوتا اور
آپ موقع پر موجود نہ ہوتیں، تو ———

زبیدہ۔ آپ ضرور قاسم سیٹھ کو مار ڈالتے، کیوں یہی نا؟

سلیم۔ جی ہاں، میں ہرگز اپنے آپ کو روک نہیں سکتا تھا۔ آپ نے پستول مانگا، میں نے دے دیا، ورنہ دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لے سکتی تھی مجھ سے،

زبیدہ۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

سلیم۔ اگر یہ طنز ہے تو مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس ہے اور اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس کا مستحق نہیں، اگر آپ بھی مس رعنا کی طرح میرا مذاق اُڑانا چاہتی ہیں تو میرے لئے خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہیں۔

زبیدہ۔ آپ تو مجھ سے بھی خفا معلوم ہوتے ہیں؟ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے، رعنا پاگل ہے جو آپ کا مذاق اڑاتی ہے۔ میرے دل میں آپ کی عزت ہے، میں بھلا کس طرح آپ کا مذاق اڑا سکتی ہوں۔ (مسکرا کر) اپنے الفاظ واپس لیجئے۔

سلیم۔ (ایک نظر زبیدہ کے چہرہ پر ڈال کر) میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

زبیدہ۔ (زیر لب تبسم کے ساتھ) وعدہ کیجئے اب ایسا غلط خیال بھی نہیں آئے گا؟

سلیم۔ نہیں آئے گا —— یہ میرا وعدہ ہے،

زبیدہ۔ مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ میں خوش ہوں کہ میری توقع آپ نے پوری کر دی۔ لیکن ایک بات آپ کو ماننا پڑے گی۔

وعدہ کیجیے، مان لیں گے؟

سلیم۔ ضرور مانوں گا، فرمایئے۔

زبیدہ۔ وعدہ رہا؟

سلیم۔ آپ کی بات رد کر دوں، یہ کسی طرح ممکن نہیں —— فرمایئے اور اس اطمینان کے ساتھ فرمایئے کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل ہو کر رہے گی۔

زبیدہ۔ شکریہ، —— میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آئندہ سے ذرا محتاط رہیے۔

سلیم۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

زبیدہ۔ دیکھیے یہ سرمایہ دار لوگ بڑے مردم آزار بلکہ مردم خور ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں انسان کی انسانیت اور شرافت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ یہ وقت کے فرعون ہیں، اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنا بندہ۔ یہ اپنے نافرمان بندوں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں ان کی جان لیتے ہیں، انہیں ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، چاہے ایک کی جگہ ہزار خرچ ہو جائیں۔

سلیم۔ میں جانتا ہوں ان لوگوں کی ذہنیت اور جبلت کو۔

زبیدہ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ع

با ہمیں مردماں بباید ساخت

ان ہی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے۔ ان کا کام ہمارے بغیر چل سکتا ہے لیکن ہمارا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ پھر دریا میں رہ

کہ مگر مجھ سے بیر کرنا عقلمندی نہیں، نادانی ہے،

سلیم۔ درست ہے واقعی یہی بات ہے

زبیدہ۔ لہٰذا تقاضائے دانش یہ ہے کہ ان لوگوں سے حکمت عملی کے ساتھ کام لیا جائے، یعنی ان سے الجھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی جائے اس میں اپنا ہی زیاں ہے۔ ان کا تو کچھ بگڑے گا نہیں۔

سلیم۔ درست فرما رہی ہیں آپ!

زبیدہ۔ تو میں مطمئن ہو جاؤں؟ —— اب تو نہیں کریں گے آپ ایسی حرکت جیسی آج کر گذرے ہیں؟

سلیم۔ نہیں، اب اس کا موقع ہی نہ آنے پائے گا، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری —— ایسے بر خود غلط لوگوں سے میں تعلق ہی نہ رکھوں گا کسی طرح کا، پھر بانس اور بانسری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

زبیدہ۔ تعلق تو رکھنا ہی پڑیگا۔

سلیم۔ کیوں رکھنا پڑے گا؟ یہ سرمایہ دار خدائی کے مدعی ضرور ہیں لیکن سچ مچ تو خدا نہیں ہیں، میرا سر خدا کے سامنے جھک سکتا ہے ان کے سامنے کبھی نہیں جھکے گا۔ قاسم سیٹھ کو شاید اس پر غرہ ہو کہ وہ مجھے بیش قرار تنخواہ دیتے ہیں، وہ مجھے برخاست کر دینگے تو میں فاقے کرنے لگوں گا، ممکن ہے فاقے کرنے لگوں لیکن یقین کیجئے پھر بھی ان کے پندار کو ٹھوکر لگانا میں اپنا فرض سمجھوں گا، قبل اس کے کہ وہ مجھے برخواست کر کے اپنے غرورِ نفس کو تسکین دینے کی کوشش کریں،

میرا استعفا انہیں ایک مرتبہ یہ سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ پیٹ ہی سب کچھ نہیں ہے۔

زبیدہ۔ تو کیا آپ استعفا دیدیں گے؟

سلیم۔ ہاں یہ میرا فیصلہ ہے۔

زبیدہ۔ اس فیصلہ میں آپ میری خاطر بھی تبدیلی نہیں کریں گے؟

سلیم صرف یہی ایک ایسی بات ہے جس میں آپ کی خاطر بھی، جو مجھے ساری دنیا سے عزیز ہے۔ میرے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکے گی۔

زبیدہ نے سلیم پر ایک نظر ڈالی اور خاموش ہو گئی۔ یکایک رعنا درّانی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس نے زبیدہ سے کہا "سیٹھ صاحب تشریف لے آئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں"۔

زبیدہ خاموشی سے اٹھی اور قاسم سیٹھ کے پاس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد رعنا نے کہا۔ "سلیم صاحب! آج تو آپ نے کمال کر دیا۔ آپ اتنے غصہ ور ہیں، اتنے بہادر ہیں، اتنے بے لچک ہیں۔ اس کا تو میں تصور ہی نہ کر سکتی تھی۔

تعریف و تحسین کے ان الفاظ سے سلیم بظاہر ذرا بھی متاثر نہ ہوا ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "مس رعنا، شاید مجھے آپ پھر بنا رہی ہیں"۔

رعنا۔ شاید آپ پھر یہ چاہتے ہیں کہ مجھے رلائیں؟

سلیم۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا اچھا، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

رعنا۔ آپ نے قاسم سیٹھ کو کانپتے دیکھا تھا۔ خدا کی قسم سارے بدن سے تھر تھر کانپ رہا تھا، آپ کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر، موئا زنخا کہیں کا!۔۔۔۔ لیکن ایک بات ہے۔

سلیم۔ وہ کونسی بات ہے؟ کہہ ڈالئے اسے بھی۔

رعنا۔ وہ بدلہ ضرور لے گا۔

سلیم۔ اسے بدلہ ضرور لینا چاہیئے۔

رعنا۔ اور کچھ نہ کر سکے گا تو کم از کم یہ تو ضرور کرے گا کہ آپ کو جواب دیدیگا۔ تاکہ بے روزگاری سے آپ پریشان ہوں اور وہ لطف اٹھائے یہ دولت مند لوگ، بڑے قسی القلب ہوتے ہیں۔ پتھر ہوتا ہے دل کے بجائے ان کے سینے میں۔

سلیم۔ جی ہاں، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، یہ اگر پتھر ہیں تو میں بھی چٹان ہوں قبل اس کے کہ یہ مجھے جواب دیں، میں نے انہیں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

رعنا۔ یعنی استعفا دیدیں گے آپ؟

سلیم۔ جی ہاں، آپ کا خیال صحیح ہے۔

رعنا۔ آپ کے اس فیصلہ سے مجھے خوشی ہوئی۔

سلیم۔ مجھے خوشی ہے کہ میری کسی بات سے تو آپ خوش ہوئیں۔

رعنا۔ نہیں سچ، واقعی مجھے خوشی ہوئی، یہ کم ظرف اس قابل نہیں ہے کہ آپ جیسا آدمی اس کے ہاں کام کرے، آپ فکر نہ کیجئے، انشاءاللہ

اس سے زیادہ تنخواہ پر بمبئی پہنچتے ہی آپ کا تقرر میں اپنی کمپنی میں کرا دونگی۔ پھر انگاروں پر لوٹیں گے یہ سیٹھ صاحب!

سلیم۔ لیکن استعفیٰ کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا ہے کہ اب کسی کمپنی میں نوکری نہیں کرونگا!

رعنا کچھ نہ بول سکی، خاموش ہو گئی۔

---

(۲۸)

حادثہ

کسی فلم کمپنی میں بھی کام نہ کرنے کے ارادہ کا اظہار کرکے سلیم نے رعنا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات اس نے ایسے عزم اور تیور کے ساتھ کہی تھی کہ وہ کچھ بول نہ سکی۔ چپ چاپ چلی آئی۔ اپنے کمرہ میں نجمہ بیٹھی ہوئی مدھرے میں کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ رعنا کو دیکھ کر وہ چپ ہوگئی، رعنا نے کہا، چپ کیوں ہوگئیں؟ کیا گا رہی تھیں، نجمہ مسکرائی پھر اس نے کہا۔ "ہاں گا رہی تھی، اک بے وفا سے پیار کیا ہائے کیا کیا؟" رعنا بولی: "کیا تنویر بے وفا ہے؟ نجمہ نے جواب دیا۔ تنویر بے چارا کیسا بے وفائی کریگا۔ میرا اشارہ تو کسی اور طرف تھا" رعنا نے پوچھا وہ کون ذات شریف ہیں جن سے تم اشارے کرتی ہو۔ ذرا میں بھی تو ان کا نام سنوں؟ نجمہ نے جواب دیا، وہ ہیں سلیم صاحب۔ تم مانو یا نہ مانو،

یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ کون، لیکن یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تم تینوں میں سے کوئی ایک ہے ضرور تیرِ محبّت کا گھائل۔"

رعنا ہنس پڑی۔

"بڑی دور کی کوڑی لائیں بی نجمہ۔ کیا کہنے ہیں تمہاری ذہانت کے۔" نجمہ نے کہا۔ "باتوں میں نہ اڑاؤ، میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔"

رعنا نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"یہ بھی کہو کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں، اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہوں۔ ہم مانتے ہیں کہ استاد ہو بلکہ میں تو یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ محبت کا چور جس کامیابی سے تم پکڑ سکتی ہو کوئی نہیں پکڑ سکتا، آخر محبت کر چکی ہو، کرتی ہو۔ تم سے زیادہ محبت کی اونچ نیچ سے کون واقف ہوگا۔" نجمہ نے تسلیمات کرتے ہوئے کہا "شکریہ شکریہ، اس قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن بندہ پرور بات وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کی۔ آپ تینوں میں سے کوئی نہ کوئی محبت میں ضرور مبتلا ہے۔ رعنا نے سوال کیا "کون ہو سکتا ہے؟" نجمہ نے جواب دیا۔ "زبیدہ بھی ہو سکتی ہے، تم بھی ہو سکتی ہو اور سلیم صاحب بھی ہو سکتے ہیں"، رعنا نے پھر سوال کیا "لیکن ان تینوں میں سے کس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ وہی مجرم ہے۔" نجمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ٹیڑھا سوال ہے، زبیدہ اتنی سنجیدہ ہے کہ اس کی طبیعت کا اندازہ مشکل ہے۔ تم اتنی باتونی ہو کہ تمہاری باتوں میں سے جھوٹ اور سچ کو الگ کرنا دشوار ہے۔ رہے سلیم صاحب تو وہ اتنے کھوئے کھوئے سے

رہتے ہیں کہ یہ پتہ چلانا آسان نہیں کتنے پانی میں ہیں "

رعنا نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا ۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں ۔ جو محبت کرے گا خود ہی بھگتے گا ۔ تم تو اپنا حال سناؤ ۔ کیسی گذر رہی ہے تنویر کے ساتھ یہ آج کل کے نوجوان عشق کے سوانگ تو بڑے شاندار طریقہ پر رچاتے ہیں ۔ لیکن میدان بھی بہت جلد چھوڑ دیتے ہیں ، تمہارے تنویر مجھے کچھ زیادہ قابل اعتماد آدمی نہیں معلوم ہوتے ، ذرا خیال رکھنا ۔

نجمہ ہنسنے لگی ، اس نے کہا ۔ تنویر غریب کو کیوں نشانہ بنا رہی ہو ۔ وہ تو جیسا ہے ، ہے ، میں جانوں اور وہ جانے ، اپنی خبر لو ۔

رعنا ۔ اپنی خبر کیا لوں ؟ نہ میں نے کسی سے محبّت کی ، نہ فی الحال ایسا ارادہ ہے ۔

نجمہ ۔ جھوٹی ہو اول درجہ کی ۔

رعنا ۔ ہو سکتا ہے ۔

نجمہ ۔ تم ہی نہیں ، زبیدہ بھی کسی چکر میں ہے ۔

رعنا ۔ ہو گی ۔ لیکن قاضی جی کیوں دبلے

نجمہ ۔ (ہنستے ہوئے) شہر کے اندیشہ میں —— آؤ ایک بات کریں ۔

رعنا ۔ کوئی نئی سوجھی ہو گی ؟

نجمہ ۔ ہاں چلو ذرا سلیم صاحب کے پاس چلتے ہیں ۔

رعنا ۔ یہ کیوں ، وہاں جا کر کیا کرو گی

نجمہ ۔ ذرا انہیں ٹٹولوں گی ۔

رعنا۔ نہیں، میں نہیں جاؤں گی، بلکہ تمہیں بھی مشورہ نہیں دونگی۔

نجمہ۔ یہ کیوں؟ کیا وہ کوئی ہوا ہیں؟ ڈر کیوں رہی ہو اُن سے؟

رعنا۔ تمہارا ایسا دیدہ کہاں سے لاؤں، میں تو واقعی اس شخص سے ڈرنے لگی ہوں، یاد ہے، قاسم صاحب کی کیا حالت بنا دی تھی۔ ظالم نے،

نجمہ۔ ہاں یاد کیوں نہیں ہے،

رعنا۔ جب سے اس کا دماغ درست نہیں ہے، دیکھ لو، نہ کمرہ سے باہر نکلا، نہ کسی سے بات چیت کی۔ چہرہ پر جلال برس رہا ہے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے ـــــ نا بابا میں نہیں جاتی۔ تم جاسکتی ہو تو جاؤ۔ تمہیں منع بھی نہیں کرتی۔

نجمہ۔ تم نے تو مجھے بھی ڈرا دیا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ زبیدہ گھبرائی اور سہمی ہوئی، پریشان اور مضطر آتی نظر آئی، اسے اس حالت میں دیکھ کر نجمہ اور رعنا بھی گھبرا گئیں دونوں نے بیک آواز دریافت کیا۔ "کیا بات ہے زبیدہ اتنی پریشان کیوں ہو؟

زبیدہ نے کہا۔ "قاسم سیٹھ"

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رعنا کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

"کیا ہوا قاسم سیٹھ کو؟ کیا کوئی حادثہ پیش آگیا۔

زبیدہ نے کہا۔" ہاں ـــــ موٹر الٹ گئی، حالت نازک ہے، انہیں

بمبئی لے جا رہے ہیں، میں بھی ساتھ جا رہی ہوں، تم سامان ساتھ لے کر سلیم صاحب کے ساتھ جلد از جلد بمبئی پہنچو۔"

رعنا کوئی جواب نہ دے سکی، انکار کا تو سوال ہی نہیں تھا مزید ہدایات بھی طلب نہ کر سکی، زبیدہ تیزی کے ساتھ واپس چلی گئی، موٹر کی آواز نے بتا دیا، زبیدہ گئی!

---

(۲۹)

روپوشی

رعنا نے نجمہ سے کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

نجمہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پریشان کیوں ہوتی ہو؟ انسان کی زندگی حوادث کا مجموعہ ہے، صبح سے شام تک حادثے ہی حادثے پیش آتے رہتے ہیں، حادثے کا شکار ہونا تعجب انگیز نہیں، تعجب خیز ہے حادثے سے بچ جانا ——— رہے قاسم سیٹھ تو ان کا وجود خود ایک حادثہ ہے۔ وہ ایک بہت بڑا حادثہ ہیں، اچھے ہو جائیں گے، سخت جان آدمی ہیں۔ آسانی سے نہیں مر سکتے۔ اچھا تم بمبئی سدھارو، ہم اپنے ہوٹل واپس جاتے ہیں۔"

رعنا نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "نہیں مجھے یوں اکیلا نہ چھوڑو۔ تم بھی بمبئی چلو ہمارے ساتھ۔

نجمہ نے پوچھا۔ "لیکن آخر کیوں؟ میں ٹھہری عورت ذات، کیا مدد کر سکتی ہوں تمہاری؟ سلیم صاحب خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ انہیں ساتھ لے جاؤ" ——!

رعنا مچل گئی۔ "چاہے دوسرے ہی دن واپس آجانا، لیکن تمہیں بہرحال بمبئی چلنا پڑے گا۔"

نجمہ انکار پر قائم نہ رہ سکی، بولی "اچھا، نہیں مانتیں تو چلی چلوں گی لیکن زیادہ ٹھہر نہ سکوں گی۔ مجھے پونا بھی جلد ہی واپس پہنچنا ہے، اتنا سُن لو۔ کبھی بعد میں وہاں پھر ضد کرنے لگو۔"

رعنا نے اطمینان دلایا، ہاں شوق سے دوسرے دن چلی آنا —— میں نہیں روکنے کی۔

نجمہ کو مطمئن کر کے وہ سلیم کے کمرے میں پہنچی، لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔

رعنا نے بے تحاشا پکارنا شروع کیا۔ "سلیم صاحب، سلیم صاحب!" لیکن کسی گوشہ سے جواب نہ ملا، رعنا روہانسی ہو کر نجمہ کے پاس آئی۔ نجمہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "کیا سلیم صاحب سے پٹ کر آ رہی ہو؟ اتنی بدحواس کیوں ہو؟"

رعنا نے پوچھا، "کیا سلیم صاحب ادھر آئے تھے؟ —— وہاں تو نہیں ہیں، نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں؟ میں نے پکارا بھی مگر کوئی جواب نہ ملا۔"

اب تو نجمہ کے کان کھڑے ہوئے، اس نے کہا۔ "واقعی سلیم صاحب

نہیں ہیں، لیکن ادھر تو وہ نہیں آئے۔"

رعنا نے مایوس لہجہ میں کہا: "معلوم ہوتا ہے چلے گئے"،

نجمہ۔ چلے گئے؟ یہ کون سا وقت ہے کہیں جانے کا؟

رعنا۔ میرا خیال ہے، وہ اس گھر سے چلے گئے۔

نجمہ۔ کچھ دیوانی ہوئی ہے، گھر سے کیوں جائیں گے؟

رعنا۔ تم نہیں جانتیں کچھ، مجھے اندیشہ ہے، وہ گئے اور اب نہیں آئیں گے!

نجمہ۔ لیکن اس اندیشہ کی کوئی بنیاد بھی تو ہو گی؟

رعنا۔ آج وہ کچھ اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

نجمہ۔ اور یہ اب بتا رہی ہو۔ سانپ نکل جانے کے بعد۔

رعنا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔

نجمہ۔ آؤ چلیں، اگر وہ چلے گئے ہیں تو ضرور کوئی تحریر چھوڑ گئے ہوں گے ——— بہر حال وہ اتنے غیر ذمہ دار نہیں ہو سکتے کہ بے کہے سنے جدھر منہ اٹھے، اس طرف چل دیں ——— آؤ میرے ساتھ آؤ۔

لیکن رعنا نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔

رعنا۔ نہیں نجمہ، بے کار ہے ——— وہ گئے۔

رعنا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نجمہ پریشان ہو گئی۔

نجمہ۔ گئے تو جانے دو ——— تم کیوں کڑھ رہی ہو، ایک دیوانے آدمی پر

رعنا۔ میں اس بات پر کڑھ رہی ہوں کہ میں نے انہیں بہت پریشان کیا ہے بہت چھیڑا ہے۔ معافی بھی نہ مانگ سکی ان سے، روک تو نہ سکی

لیکن اپنے ضمیر کا بوجھ تو ضرور ہلکا کر لیتی،

نجمہ۔ ہاں، یہ تو سچ ہے ——— لیکن گئے کہاں ہونگے؟ سوا بمبئی کے اور کہاں جا سکتے ہیں اور ہم بمبئی چل ہی رہے ہیں۔

رعنا۔ مجھے اندیشہ ہے وہ بمبئی میں بھی نہیں ملیں گے۔

نجمہ۔ کیوں، کیا خودکشی کر کے عالم بالا پہنچ جائیں گے؟

رعنا۔ ایسا نہ کہو ایک نیک اور شریف آدمی کی موت کیوں چاہ رہی ہو۔

نجمہ۔ خدا نہ کرے کسی کی موت چاہوں، وہ تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ تم خواہ مخواہ برا مان گئیں، بہر حال اطمینان رکھو سلیم صاحب بمبئی کے سوا کہیں اور نہیں جا سکتے، وہاں ضرور ملاقات ہو گی، میں ڈھونڈ لاؤں گی انہیں، تمہارے لئے شہر کا ایک ایک چپہ چھان ماروں گی، اخباروں میں ان کی تصویر چھپوا دوں گی۔ سی۔آئی۔ڈی کو اطلاع دے دوں گی

رعنا۔ یہ سب کچھ کیوں کرو گی آخر تم؟

نجمہ۔ سلیم صاحب کو تلاش کرنے کے لئے ——— رعنا تم نہیں جانتیں میں کتنی خوش ہوں اس وقت۔

رعنا۔ تم خوش ہو؟

نجمہ۔ ہاں میرا دل بلّیوں اچھل رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔

رعنا۔ لیکن کیوں؟ کس بات پر اتنی خوش ہو کہ بندِ قبا ٹوٹے جا رہے ہیں؟

نجمہ۔ یہ بھی بتادوں گی کسی وقت۔

رعنا۔ کسی وقت کیوں؟ ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟

نجمہ۔ میں بہت خوش ہوں رعنا، اس وقت مجھے نہ چھیڑو۔

رعنا۔ کچھ دیوانی ہو گئی ہو، تمہاری خوشی سے کیا مجھے خوشی نہیں ہے۔ لیکن یہ تو
بتاؤ کیوں خوش ہو؟ تاکہ کچھ لطف بھی آئے۔

نجمہ۔ بتادوں؟

رعنا۔ تو یہ ہے، تم تو پہیلیاں بجھانے لگیں، بتا بھی چکو کسی طرح۔

نجمہ۔ میں نے چور پکڑ لیا رعنا، پکڑ لیا میں نے چور!

رعنا۔ واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے۔

نجمہ۔ جو چاہو کہہ لو، لیکن میری خوشی کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ میں نے چور
پکڑ لیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں، خوش ہوں۔

رعنا۔ کہاں ہے وہ چور؟

نجمہ۔ میرے پاس کھڑا ہے۔ (رعنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ را
یہ، ہاں یہ!

رعنا۔ یعنی میں؟ —— میری طرف اشارہ کر رہی ہو تم؟

نجمہ۔ ہاں، تم ہی تو ہو۔

رعنا۔ میں چور ہوں؟

نجمہ۔ ہاں، —— کیا تم سلیم سے محبت نہیں کرتیں؟

رعنا ہنس پڑی، احمق کہیں کی، میں محبت کر سکتی ہوں بھلا؟ اللہ

وہ بھی سلیم صاحب سے؟ محبّت کر کے اپنی شہرت، عزت، وقعت دولت سب خاک میں ملا دوں؟ مجھے ان سے ہمدردی ضرور ہے۔ میرے دل میں ان کی عزت بھی ہے، ان کی بہادری، قابلیت اور شاعرانہ اداؤں کی میرے دل میں قدر بھی ہے، لیکن محبت ——— ؟ نہیں نجمہ، سلیم تو سلیم، میں کسی تنویر جیسے آدمی سے بھی محبت نہیں کر سکتی، میں اس سے محبت کروں گی جو بے انتہا دولت مند ہو، بے انتہا خوبصورت ہو۔ سلیم صاحب تو بے انتہا غریب ہیں اور ———

نجمہ۔ بے انتہا بدصورت بھی، خدا کے غضب سے ڈرو رعنا، مانا کہ وہ گلفام نہیں ہیں، لیکن مردانہ جاہ و جلال ان کے چہرے بشرے سے عیاں ہے، بے شک وہ دولت مند نہیں ہیں لیکن دولت آنی جانی چیز ہے۔ باقی رہنے والی چیز تو انسانیت اور شرافت ہے، قدر انسانیت اور شرافت کی ہوتی ہے، نہ کہ دولت و ثروت کی؟ —— کیسے نیچے خیالات ہیں تمہارے!

رعنا۔ تم تو وکالت کرنے لگیں سلیم صاحب کی، ایجنٹ ہو، ان کی؟

نجمہ۔ مجھے کسی کا ایجنٹ بننے کی کیا ضرورت ہے؟ جو سچی بات تھی میں نے کہہ دی، باقی محبت کسی کے کہنے سننے سے تو ہوتی نہیں، تم جانو اور تمہارا دل! —— لیکن آؤ ذرا پتہ تو چلائیں سلیم صاحب واقعی چلے گئے ہیں، یا صرف تمہارا وہم ہی وہم ہے؟

نجمہ رعنا کے ساتھ سلیم کے کمرہ میں پہنچی، وہاں سلیم اب بھی نہیں

تھا، نہ اس کا اٹیچی کیس تھا، ہاں میز پر اس کا ایک رقعہ ضرور رکھا تھا، سب سے پہلے اس پر نجمہ کی نظر پڑی، اس نے کہا۔" دیکھو یہ رہا سلیم صاحب کا وصیت نامہ، رعنا نے نجمہ کے کاندھے پر سر رکھ لیا۔ اور دونوں پڑھنے لگیں۔ سلیم نے لکھا تھا۔

"قاسم سیٹھ سے معرکہ آرائی کے بعد اب میرا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے چلا جانا چاہئے میں جا رہا ہوں، شاید بمبئی، فی الحال وہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ کوئی نہ کوئی روزگار تلاش کر ہی لوں گا، آپ کے احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا جب تک زندہ ہوں بندہ ہوں۔ بے شک آپ کے گھر میں رہنا میرے لئے اب ممکن نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں رفیعہ اور اسلم کو پڑھانے کے لئے اوقاتِ مقررہ پر آتا رہوں گا تو آپ کو اعتراض نہ ہوگا۔

اچھا اب میں اجازت چاہتا ہوں مس رعنا اور مس نجمہ تک میرا سلام پہنچا دیجئے مس رعنا کی شوخی مجھے دیکھ کر تازہ ہو جاتی تھی۔ اور بیساختہ طرح طرح کے فقرے ان کی زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے، میرے بعد ان کی شوخی اور زندہ دلی کا ہدف کون بنے گا۔

کس کے گھر جائے گا یہ سیلِ بلا میرے بعد

بہر حال اگر کبھی آپ کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے قطعاً بُرا نہ معلوم ہوگا، بلکہ میں خوش ہوں گا، اگر وہ نئے فقرے مجھ پر چست کریں۔ مس نجمہ سے عذر خواہ ہوں، انہیں بجا طور پر خفا ہونے کا حق تھا، اور اس حق سے

انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ کاش میں انہیں یقین دلا سکتا کہ ان کا سامان لانے کا جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا، وہ اختیاری نہ تھا۔ مس رعنا نے آپ کا نام لیا، اور پھر میرے لئے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔

---

(۳۰)

راستہ میں

زبیدہ تو جھٹ پٹ بمبئی چلی گئی، لیکن رعنا کو سامان درست کرنے، مکان خالی کرنے اور سفر کا بندوبست کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ پھر وہ اور نجمہ ساتھ ساتھ روانہ ہوئیں، گاڑی فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ رعنا اور نجمہ دونوں خاموش تھیں۔ جیسے کوئی بڑا اہم مسئلہ زیرِ غور تھا۔ لیکن نہ جانے کیا؟

نجمہ کے لئے جب خاموش رہنا ناممکن ہو گیا تو اس نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"اے بی رعنا، میں یہیں سے واپس جاتی ہوں۔ تم اطمینان سے اپنا مراقبہ جاری رکھو!

رعنا چونک پڑی مسکرائی اور جھوٹ موٹ اسے دھکیلتے ہوئے

کہا۔ "جاؤ ورنہ دھکا دے کر گرا دوں گی، ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے"۔

نجمہ۔ آخر سوچ کیا رہی ہو؟

رعنا۔ کچھ بھی نہیں۔

نجمہ۔ پھر چپ کیوں ہو؟

رعنا۔ یونہی، تم بھی تو چپ ہو،

نجمہ۔ اچھا، میرے ایک سوال کا جواب دو، سوال یہ ہے کہ حضرت سلیم تشریف کہاں لے گئے؟

رعنا۔ یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔

نجمہ۔ (مسکراتے ہوئے) تو یوں کہیئے یہ سوچ رہی تھیں۔

رعنا ہاں نجمہ، بڑا دکھ ہو رہا ہے، میں نے بے چارے کو بہت چھیڑا ہے۔ بہت پریشان کیا ہے، جب سوچتی ہوں تو غصہ آنے لگتا ہے اپنے آپ پر۔

نجمہ۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے تمہیں اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا ہے اور انہیں پیار آنے لگتا ہے تم پر، ــــــ خط پڑھا تھا نا ان کا؟ کتنے میٹھے بول لکھے تھے تمہارے بارے میں؟

رعنا۔ اونہہ تم تو ہر وقت مذاق ہی کیا کرتی ہو ــــــ کبھی کام کی بات بھی کیا کرو۔

نجمہ۔ تو یہ کام کی بات نہ تھی؟ ــــــ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔

رعنا۔ بڑی سمجھ دار ہو ــــــ آج تک کوئی بات سمجھ میں آئی ہے؟

ہمیشہ کی بیوقوف ہو۔

نجمہ۔ وہ بات یہ ہے کہ ——

رعنا۔ نہیں، میں کچھ نہیں پوچھتی، بیٹھو چپ چاپ۔

نجمہ۔ آخر زبیدہ کے سامنے سلیم صاحب کی ساری تڑ کی کیوں تمام ہو جاتی ہے؟

رعنا۔ کیا مطلب؟

نجمہ۔ اب آنے لگا لطف اس گفتگو میں —— میرا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قاسم سیٹھ کا شیشۂ پندار چکنا چور کر دیا، جو پستول لے کر مردانہ وار ایک بڑے سرمایہ کے مقابلہ میں ڈٹ گیا، جس نے دنیائے فلم کے شہنشاہ کی کرکری کر دی وہ زبیدہ کے سامنے اتنا بے بس کیوں ہو گیا کہ زبیدہ نے کہا، پستول بڑھاؤ، ادھر، چپ چاپ نذر کر دیا۔ اس نے کہا۔ واپس جاؤ اپنے کمرہ میں۔ وہ ایک کمترین چاکر کی طرح واپس چلا گیا۔ کہاں وہ دم خم، کہاں یہ فروتنی؟

رعنا۔ تم تو پاگل ہو اچھی خاصی۔

نجمہ۔ نہیں پاگل مرد ہوتے ہیں اور مجنوں کہلاتے ہیں۔ عورتیں تو پاگل بناتی ہیں دوسروں کو اور نہایت ٹھاٹھ سے لیلیٰ کہلاتی ہیں۔

رعنا۔ سلیم ایک شریف آدمی ہے۔

نجمہ۔ ہاں اگر وہ آدمی ہے تو پھر اس کی شرافت بھی تسلیم کر لینی چاہیئے۔

رعنا۔ زبیدہ کے اس پر احسانات ہیں، اور جو کسی کا زیر بار احسان ہو وہ اس

سے آنکھیں نہیں چار کر سکتا

نجمہ۔ نہیں، صرف یہی نہیں، کچھ اور بات بھی ہے۔ یعنی زیادہ نہیں تو تھوڑا سا دال میں کالا ضرور ہے۔

رعنا۔ یعنی زبیدہ لٹو ہے سلیم پر۔

نجمہ۔ نہیں سلیم صاحب ——

رعنا۔ فریفتہ ہیں زبیدہ پر؟

نجمہ۔ ہاں ٹھیک سمجھیں تم

رعنا۔ کس برتے پر؟ عقل کے پیچھے اس طرح ڈنڈا لے کر نہ گھومو۔

نجمہ۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ میرے دل میں تو رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے۔

رعنا۔ اگر یہ بات تھی تو سلیم نے زبیدہ کا گھر کیوں چھوڑ دیا۔ پھر تو اسے یہیں رہنا چاہیئے تھا۔ بلکہ زبیدہ نکالتی اور وہ نہ نکلتا۔

نجمہ۔ یہ باتیں ناگوار گذری ہیں شاید؟

رعنا۔ کون سی باتیں؟

نجمہ۔ یہی سلیم اور زبیدہ کا ذکر۔

رعنا۔ توبہ کرو مجھے کیا پڑی ہے جو کسی کی باتیں ناگوار گذریں گی۔

نجمہ۔ دیکھ لینا، بہت جلد کوئی گل کھلا چاہتا ہے —— میں نے بھی آخر دنیا دیکھی ہے۔

رعنا۔ ہوگا، کچھ اور باتیں کرو —— ہاں یہ تو بتاؤ، تنویر سے کیسے گذر رہی ہے؟

نجمہ۔ بہت اچھی ——— اب تک تو بہت اچھی گذر رہی ہے آگے کا
خدا جانے۔

رعنا۔ لوگ کہتے ہیں محبت کرنے والوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے، فرق
آجاتا ہے اس طرح محبت میں، کیا یہ سچ ہے؟

نجمہ۔ میں تو بالکل جھوٹ سمجھتی ہوں، ہماری محبت تو دن بدن بڑھ رہی ہے
روز ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل مقابلہ میں آج ہم زیادہ محبت کرنے
لگے ہیں ایک دوسرے سے ——— لوگوں کا کیا ہے، وہ تو بے پر کی
اُڑایا ہی کرتے ہیں

رعنا۔ واہ! میں نے کئی کتابوں میں پڑھا ہے۔ کیا وہ بھی سب بے پر کی
اڑاتے ہیں؟

نجمہ۔ ہاں بالکل ——— میں کہتی ہوں تجربہ کر کے دیکھ لو۔

رعنا۔ (مسکراتے ہوئے) جی بخشئے، یہ مشورہ اپنے ہی تک رکھئے، میں نہ
کسی سے محبت کرتی ہوں، نہ کروں گی، کہاں یہ آزاد اور بے پروا
زندگی، کہاں محبت کا جنجال، مشورہ وہ دو جو قابلِ قبول ہو۔ ایسی
بے تکی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟

نجمہ۔ اچھا معافی مانگتی ہوں۔ معاف کر دو، اب ایسی غلطی نہ ہوگی۔ تم تو
بس نفرت ہی کیا کرو سب سے۔

اتنے میں ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر رکی، زبیدہ کا گھر آگیا تھا۔

---

(۳۱)

اتفاقات

اتفاقات کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ اتفاقات کسی کی زندگی بنا دیتے ہیں، کسی کی زندگی کو گھن لگا دیتے ہیں، کسی کو بامِ عروج پہ پہنچا دیتے ہیں اور کسی کو پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔ کوئی دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں ترقی کر کے انتہائی منزل پہ پہنچ جاتا ہے۔ کوئی پلوں، گھنٹوں اور دنوں میں ناکامی و نامرادی کی ساری منزلیں طے کر لیتا ہے۔ ماتھران سے واپس آنے کے بعد سلیم اور زبیدہ کی زندگی اتفاقات کی پابند ہو کر رہ گئی تھی۔

دو چار روز تک سلیم رفیہ اور اسلم کو پڑھانے کے لئے آیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ زبیدہ کچھ کھچی کھچی سی ہے، اس نے آنا چھوڑ دیا۔ زبیدہ نے پرواہ بھی نہ کی۔ اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ وہاں رہنے لگا۔

کچھ تھوڑے سے روپے پاس تھے۔ ان سے گذر بسر ہونے لگی۔ رعنا نے
وعدہ کیا تھا کہ اپنی کمپنی میں بیش قرار مشاہرہ پر اسے ملازم رکھا دیگی لیکن
اس نے یہ پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ پھر وہ رعنا سے ملا بھی نہیں۔ قائم
کی نوکری چھوڑ ہی چکا تھا جو تھوڑا سا سرمایہ تھا، وہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا
اس عرصہ میں اس نے ایک ناول لکھا۔ ناول کیا تھا دل کے واردات تھے
صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے تھے۔ ایک پبلشر کے پاس پہنچا، اس نے چند ور
الٹ پلٹ کر دیکھے اور چھاپنے سے معذوری ظاہر کی۔ دوسرے ناشر کے
پاس پہنچا، ان حضرت نے بڑے اخلاق و تپاک کا مظاہرہ کیا۔ ناول
لیا اور ایک ہفتہ کے بعد بلایا۔ ایک ہفتہ بعد پہنچا تو ناشر صاحب نے
سو روپے کا نوٹ جیب سے نکالا، میز کے خانہ سے کتاب نکالی اور دونو
چیزیں سلیم کے سامنے رکھ دیں، سلیم حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ انہوں
نے فرمایا۔

"اس ناول کے دائمی حق اشاعت کا معاوضہ سو روپے دے سکتا
ہوں، منظور ہو تو قبول کر لیجئے۔ نامنظور ہو تو مسودہ سامنے رکھا ہے
واپس لے جائیے۔ معاف کیجئے گا ــــــــــ میں دو ٹوک بات کرنے
کا عادی ہوں۔"

سلیم نے اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ ایک لمحہ تک کچھ سوچا۔ پھر
نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اور کتاب ناشر کی طرف بڑھا دی۔
ناشر نے سلیم کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ جانے لگا تو کہا۔ اگر کوئی

کتاب نئی آپ نے لکھی ہو، یا لکھنے والے ہوں تو اسی معاوضہ میں قبول کروں گا۔"

سلیم نے شکریہ ادا کیا اور چلا آیا۔ کتاب بہت جلد منظرِ عام پر آگئی اور خلاف توقع بہت مقبول ہوئی۔ تین مہینے کے اندر دو ایڈیشن نکل گئے۔ سلیم اب پھر ایک ناول لکھ رہا تھا، سو روپے ختم ہو چکے تھے۔ زندگی کی گاڑی آگے دھکیلنے کے لئے کم از کم سو روپے اور درکار تھے۔ وہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا تو دو فیشن ایبل آدمی سامنے کھڑے تھے۔ وضع قطع سے ایک پارسی معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا ہندو۔ سلیم نے پوچھا۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

پارسی نے جواب دیا۔

"سلیم صاحب سے ——— کیا آپ سلیم صاحب ہیں؟"

سلیم نے کہا۔

"جی ہاں میرا نام سلیم ہے۔"

پارسی نے بتایا۔

"میرا نام ہرمز جی ہے اور یہ صاحب جو میرے پاس کھڑے ہیں یہ مسٹر مہتا ہیں۔ آپ نے دادر مودی ٹون کا نام سنا ہوگا۔ میں اس کا مالک ہوں۔ مسٹر مہتا ہماری کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں۔"

بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

مجھے بھی بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔

آپ کا ناول "تیرِ نیم کش" میں نے پڑھا اور سیٹھ صاحب کو سنایا۔ ہم دونوں کی رائے یہ ہے کہ اسے فلمایا جائے۔ کیا آپ ہم سے تعاون کریں گے؟

بڑی خوشی سے۔

کیا معاوضہ لیں گے آپ؟

مجھے تو اگر خزانۂ قارون مل جائے تو بھی انکار نہ کروں گا۔ آپ بتائیے کیا دے سکتے ہیں؟

ہماری پیش کش تو پانچ ہزار کی ہے۔

(حیرت سے) پانچ ہزار!

شاید آپ کی نظر میں یہ رقم کافی نہیں، اچھا سات ہزار سہی۔ دیکھئے ہمیں گیت اور مکالمے بھی تو کسی سے لکھوانا پڑیں گے، اس کا معاوضہ الگ دینا پڑے گا۔

سلیم صاحب میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ مکالمے بہترین لکھ سکتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ مکالمے آپ ہی لکھیں۔

میں گیت بھی لکھ سکتا ہوں۔

اگر یہ بات ہے تو ہم مکمل اسٹوری یعنی کہانی، مکالمے اور گیت کا معاوضہ آپ کو دس ہزار دیں گے، اب زیادہ نہ سوچئے

مسٹر سلیم معاہدے پر دستخط کر دیجئے۔

سلیم نے معاہدے پر دستخط کر دیئے اور دس ہزار کا چیک وصول کر کے اسی دن کام شروع کر دیا۔ دو مہینے کے اندر ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ مسٹر مہتا نے گانے مکالمے بہت پسند کیے۔ اور ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہونے کے فوراً بعد سیٹ پر کام شروع کر دیا، چونکہ مسٹر مہتا کو اس کہانی سے بڑا لگاؤ تھا، اس لئے دن رات شوٹنگ کر کے بہت جلد تصویر مکمل کر لی۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو سلیم سے کہا "فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے خاص خاص لوگوں کو آج میں نے مدعو کیا ہے، چلئے آپ کا تعارف بھی ہو جائے گا ان لوگوں سے، اور یہ بھی دیکھ لیجئے گا۔ دن رات ایک کر کے میں نے کیسی تصویر بنائی ہے۔

لیکن سلیم نے انکار کر دیا، اس نے کہا، مہتا جی، میں نے عہد کیا ہے کسی فلم کمپنی کے اسٹوڈیو میں قدم نہیں رکھوں گا، آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے اب تک اس عہد کے نباہنے میں میری مدد کی۔ جو کچھ میں نے بھیج دیا، آپ نے قبول کر لیا۔ کہیں کچھ ترمیم کرانا ہوئی تو خود تشریف لے آئے۔ اور حسبِ مقصد تبدیل کرا لی، میں اس عہد پر قائم رہنا چاہتا ہوں، نہیں جاؤں گا۔ اس لائن کے سیٹھوں، ساہوکاروں اور فنکاروں، ایکٹروں، ایکٹرسوں سے ملنے کی مجھے ذرا تمنا نہیں۔ پھر تعارف کی کیا ضرورت ہے، میرے لئے یہ بہت ہے کہ آپ اور مہرزجی میری قدر کرتے ہیں۔ میری خدمات کو کسی لائق سمجھتے ہیں۔ بس یہی بہت ہے!

مسٹر مہتا اور ہرمز جی دونوں سلیم کے سنکی ہونے کے قائل تھے انہوں نے زور نہ دیا، چلے گئے۔ سلیم ایک دوسری سٹوری کا خاکہ بنانے لگا۔ اسے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ ٹائیٹل پر اس کا نام آتا ہے یا نہیں؟ نہ کبھی یہ سوچا کہ کس کس نے کام کیا ہے، ایک اسٹوری لکھ کر اتنا کما لیا تھا کہ اگر دو تین سال تک کوئی کام نہ ملتا تو بھی اطمینان سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ ہرمز جی نے اسے دس ہزار کی رقم دی تھی اور یہ رقم اس کے لئے بہت کافی تھی۔ اور پھر یہ پہلا کاروبار تھا۔ ابھی کل ہی کا تو واقعہ ہے کہ ہرمز جی اور مہتا جی نے اس سے ایک نئی کہانی کی فرمائش کی تھی، اور اس کے بغیر کہے از خود پندرہ ہزار کی پیشکش کی تھی۔

---

(۳۴)

عجیب

"دادر مووی ٹون" کی آرائش آج دیکھنے کے قابل تھی۔ اسٹوڈیو دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے تمام سربرآوردہ لوگ موجود تھے۔ فائنسر بھی، ڈسٹری بیوٹر بھی، اگزیبیٹر بھی، ڈائریکٹر بھی، ایکٹر بھی اور ایکٹرسیں بھی، کمپنی کی یہ پہلی فلم تھی جسے مشہور ڈائریکٹر مہتا نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ ہر مز جی کی باچھیں کھلی جارہی تھیں، بڑی خندہ جبینی سے مہمانوں کے استقبال میں مصروف تھے۔ اس پکچر پر انہوں نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا تھا۔ اور انہیں امید تھی، وارے نیارے ہو جائیں گے۔

مسٹر مہتا نے اس فلم کی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ دوسری کمپنیوں کے مشہور اداکاروں کو منہ مانگے دام دے دے کر انہوں نے "بطور قرض" حاصل کیا تھا۔ فلم ہر اعتبار سے مکمل،

اسٹوری لاجواب، مکالمے دل نشیں، گیت سریلے، اداکاروں میں جہاں پرویز اپنی صورت اور فطری اداکاری کے باعث اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہاں رعنا بھی اپنے حسن و جمال اور بے ساختہ اداکاری میں اپنی مثال آپ تھی۔ جس تصویر کا پرویز جیسا ہیرو اور رعنا جیسی ہیروئن ہو ویسے ہی اس کی کامیابی یقینی تھی، پھر بتا دماں صاحب کی نئی نئی دھنیں، ملہوترا کے فن کارانہ پوز، اور سب سے بڑھ کر کہانی کا اتار چڑھاؤ۔ مکالموں کا زور۔ گیتوں کا زیر و بم، یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے نمائش سے پہلے ہی فلم کو مقبول بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایگزیبیٹرس چیک بکیں جیب میں رکھ کر لائے تھے کہ منہ مانگے دام دے کر اپنے اپنے سینما میں نمائش کے لئے اسے حاصل کر کے رہیں گے۔

کمپنی کے ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ پہلی صف میں قاسم سیٹھ (لمز ود ہونے کے باوجود) مع زبیدہ کے موجود تھے۔ زبیدہ کے پاس رعنا اور رعنا سے ملی ہوئی نجمہ بیٹھی تھی، پھر صوفوں کی قطار تھی۔ یہاں دوسری کمپنیوں کے اداکار، مالک اور فن کار متمکن تھے۔ زبیدہ نے رعنا سے کہا۔

"سنا ہے اس فلم میں قیامت بن کر نمودار ہوئی ہو؟"

نجمہ بھلا کیوں چپ رہتی، بول پڑی۔

"میں نے سنا ہے اس فلم میں رعنا نے جادوگرنی کا پارٹ ادا کیا ہے!"

رعنا جل ہی تو گئی، کہنے لگی۔ "ہاں تمہاری طرح چڑیل کا پارٹ مجھے نہیں آتا"

زبیدہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"کہانی کیسی ہے؟"

رعنا۔ بہت اچھی، سچ کہتی ہوں، غضب کی کہانی ہے۔ مکالمے تو اس غضب کے ہیں کہ بولتے بولتے کئی دفعہ میرے آنسو نکل آئے۔ یہی حال گیتوں کا ہے ایک ایک گیت غضب کا ہے، اس فلم میں کچھ نہ ہوتا تو بھی محض کہانی کے بوتے پر کامیاب ہوتی۔

زبیدہ۔ کس نے لکھی ہے کہانی؟

رعنا۔ یہ تو میں نہیں جانتی۔

نجمہ۔ سلیم صاحب کے سوا اور کون ہوسکتا ہے، انہیں نے زورِ قلم دکھایا ہوگا۔

رعنا۔ ان کا نام نہ لو نجمہ، نہ جانے کہاں ہیں بیچارے۔

زبیدہ بہت ہمدردی ہے تمہیں ان سے؟

رعنا۔ ہاں کیوں نہیں، ضرور ہے۔ لیکن تم سے زیادہ تو نہیں۔ تم ہی نے تو انہیں سہارا دیا تھا، اپنے گھر میں پناہ دی تھی، اپنی کمپنی میں نوکر رکھایا تھا۔ بھلا میں تمہارا کیسے مقابلہ کرسکتی ہوں؟

اتنے میں روشنی گل ہوگئی، پردہ سیمیں سے نغمہ و موسیقی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لوگوں کی سرگوشیاں ختم ہوگئیں۔ سب ٹکٹکی لگا کر پردہ کی طرف دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے ٹائیٹل نظر کے سامنے آیا۔ اس پر پہلا نام سلیم کا تھا۔

کہانی، مکالمے، گانے: سلیم۔

نجمہ نے رعنا کے ایک چٹکی لی، اور آہستہ سے کہا۔
"کیوں ری جھوٹی۔"
رعنا ٹائیٹل دیکھ کر غرقِ حیرت ہوگئی، نجمہ کی دوسری چٹکی پر کسمسائی اور پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
"خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم تھا یہ سلیم صاحب ہیں، ہرمز جی انہیں کہاں سے ڈھونڈ لائے ہیں بالکل نہیں جانتی، اب پوچھوں گی۔"
نجمہ نے پھر چھیڑا۔ "سچ ہے، ایک جھوٹ کو نباہنے کے لئے آدمی کو مجبوراً کئی دوسرے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔"
رعنا نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ تمہیں کس طرح یقین دلاؤں؟ —— میں نے تو انہیں کبھی اسٹوڈیو میں بھی نہیں دیکھا۔
نجمہ بھلا کب ہار ماننے والی تھی، کہنے لگی۔ "ٹھیک کہتی ہو، فون سے گیت اور مکالمے لکھا دیتے ہوں گے۔ تم بے چاری کیا جانو؟
زبیدہ نے اس گفتگو میں بالکل حصہ نہ لیا، اندھیرا تھا، اس لئے اس کے جذبات و تاثرات کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ یہی کیفیت قاسم سیٹھ کی تھی لیکن وہ بےچینی کے ساتھ بار بار اس طرح پہلو بدل رہے تھے کہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ برہم ہیں۔ بس نہیں چلتا تھا۔ ورنہ ابھی ہال سے اُٹھ جاتے۔
تقریباً دو گھنٹے تک خاموشی کے ساتھ فلم دیکھتے رہے۔ پھر دفعتاً روشنی ہوگئی۔ پکچر ختم ہو چکی تھی، ہرمز جی، مسٹر مہتا، رعنا، شادماں صاحب

وزہ اور پرویز کو مبارکباد دینے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے ۔ شکریہ ادا
تے کرتے ان بے چاروں کی زبان گھسی جارہی تھی ۔ زبیدہ نے بھی بڑھ
رعنا کو مبارکباد دی ۔ لیکن اس مبارک میں گرم جوشی زیادہ تھی ، خلوص
م ، قاسم سیٹھ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا ۔ چہرہ پر برہمی اور بدمزگی کے
ثار نمایاں تھے ۔ جیسے نہایت لذیذ کھانے کے ساتھ کسی نے مکھی نگل لی ہو ۔
یعت متلا رہی ہو ۔ قاسم سیٹھ نے کسی کو مبارکباد نہیں دی ۔ زبیدہ سے کہا ۔

"چلو دیر ہو رہی ہے (گھڑی دیکھ کر) بہت دیر ہوگئی ۔"

زبیدہ نے آہستہ سے کہا

"چلئے ——"

اور یہ دونوں میزبان سے رخصت ہوئے بغیر چلے گئے ۔ مجمع اتنا زیادہ
تھا اور میزبان اتنے مصروف تھے کہ کسی نے ان دونوں کے اس طرح چلے
انے کو محسوس نہ کیا ۔ نجمہ لہراتی ہوئی مہتا صاحب کے پاس پہنچی اور کہنے
لی بارات موجود مگر دولہا غائب ، آخر سلیم صاحب کہاں ہیں ؟

مہتا صاحب نے فرمایا ۔

"وہ نہیں آئے ، انہوں نے آج تک اسٹوڈیو میں قدم نہیں رکھا ۔
کی صاحب ، غضب کا فنکار ہے ۔ اس کا ہر ناز اٹھانے پر ہم مجبور ہیں ۔"

(۳۳)

آگ کا کھیل

زبیدہ اور قاسم سیٹھ دادر موو ی ٹون سے اپنی بھارت فلمز کے اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہوئے، راستہ بھر دونوں پہ خاموشی طاری رہی۔ زبیدہ بھی کچھ سوچ رہی تھی اور قاسم سیٹھ بھی کسی فکر میں غرق تھے۔ کار ہموار کرتی رواں دواں تھی۔ اسٹوڈیو پہنچنے کے بعد قاسم سیٹھ اپنے پرائیویٹ کمرے میں چلے گئے۔ زبیدہ بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ ایک صوفے پہ دونوں آمنے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ دونوں اب تک خاموش تھے قاسم سیٹھ نے کریون اے کا ڈبہ کھولا، سگریٹ نکالا، سلگایا اور ایک زوردار کش لے کر زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو آج ہمیں اس لئے بلایا گیا تھا کہ ذلیل کیا جائے، ہرمز جی اور مہتا میرے نزدیک قابلِ معافی ہیں لیکن یہ رعنا، یہ نجمہ؟ کیا یہ بھی قابلِ معافی ہیں۔ کہاں ان کی اس ذلیل حرکت

ے بھی چشم پوشی کی جا سکتی ہے ؟ رعنا تمہاری جان و جگر ہے ۔ نجمہ سے بھی
تمہارے تعلقات بڑے گہرے ہیں ، ان حرامزادیوں نے تمہاری پروا
بھی نہیں کی ۔

زبیدہ نے دیوار سے لگی ہوئی اپنی شاندار تصویر کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا، "کیا کہوں سیٹھ صاحب، اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے ۔ میں
تو آپ کی وجہ سے گھر سے باہر بھی نہیں نکلی ، کہیں بھی نہ جا سکی ۔ بس
گھر، یا نرسنگ ہوم ، خدا کا شکر ہے آپ اچھے ہو گئے ، ابھی کافی کمزوری
باقی ہے ۔ ایسی باتیں نہ سوچیئے ۔ جن سے غصہ آئے ۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے
رہیں رعنا اور نجمہ تو ان سے میں سمجھ لوں گی "۔

قاسم سیٹھ نے ادھ جلا سگریٹ پھینک کر دوسرا سلگایا ۔ اور فرمایا
"میں آج کل پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں ، بھائی صاحب (حاتم سیٹھ) فالج
کے مریض ہیں ، خدا ہی بہتر جانتا ہے اچھے بھی ہوں گے یا نہیں ؟ سال بھر
ہونے کو آیا ۔ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مایوس کن ہی ہوتی جا رہی
ہے ، روپیہ ساتھ چھوڑ رہا ہے ، قارون کا خزانہ بھی ، اگر آمدنی نہ ہو صرف
خرچ ہی خرچ ہو تو بڑی جلدی ختم ہو جائے گا ۔ ہماری کئی فلمیں ناکام ہو چکی ہیں ۔
کئی اس ڈر سے نمائش کے لئے پیش نہیں کر رہا ہوں کہ ان میں بھی کچھ دم
نہیں ہے ، سوچا تھا ۔ اگلی پچھلی کسر اس نمک حرام سلیم کی پکچر سے نکل
جائے گی ۔ مگر وہ بھی گئی ہاتھ سے ۔

زبیدہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا "کیوں ؟ پکچر تو تیار ہے جب چاہیئے

لگا دیجیے۔"

قاسم سیٹھ بگڑ گئے۔ "مس زبیدہ کم از کم تم ایسی باتیں نہ کرو!"

زبیدہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی، انہوں نے فرمایا، "میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اب اس فلم سے فائدہ اٹھاؤں، سلیم کیا کہے گا۔ یہی نا کہ قاسم سیٹھ نے دھندا بنائی لیکن میرے نام اور کام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

زبیدہ۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا آپ نے انہیں روپیہ نہیں دیا؟

قاسم سیٹھ۔ دیا کیوں نہیں — ؟ لیکن میں ہرگز یہ سننا نہیں چاہتا کہ میری کامیابی میں سلیم کے نام یا اس کی کوشش کا بھی کوئی حصہ ہے، جانتی ہو، میں کیا کروں گا؟

زبیدہ۔ میں نہیں جانتی، بتائیے۔ کیا کرنے والے ہیں آپ؟

قاسم سیٹھ۔ میں سلولائڈ کے اس فیتے میں جس میں سلیم کی ناچتی، گاتی، بولتی اسٹوری قید ہے آگ لگا دوں گا۔ میں نے اس پکچر پہ لاکھوں روپیہ صرف کیا ہے۔ پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے لیکن ایک آنہ کی نئی ماچس خریدوں گا، صرف ایک تیلی اس فیتے کو آن کی آن میں جلا دے گی۔ اور اس کے ساتھ سلیم کا نام بھی جل جائے گا۔ اس کے گانے بھی جل جائیں گے، اس کی کہانی بھی جل جائے گی — سن لیا تم نے مس زبیدہ میں یہ کروں گا آج اور ابھی۔ تمہیں اسی لئے ساتھ لایا ہوں کہ یہ تماشہ دیکھتی جاؤ۔

زبیدہ۔ خدا کے لئے سیٹھ صاحب ایسا غضب نہ کیجیے گا، یہ تو گھر

ہونک تماشا دیکھتا ہوا۔

ئم سیٹھ۔ میں اپنا فیصلہ بدلا نہیں کرتا۔ میں یہ تماشا دیکھوں گا۔

بیدہ۔ لیکن نقصان کس کا ہوگا؟ سلیم کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ رعنا اور نجمہ کو آپ کے نفع نقصان سے کیا بحث؟ حاتم سیٹھ سنیں گے تو ان کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ خود آپ کے مستقبل پر اس کا بُرا اور گہرا اثر پڑے گا۔ نہیں۔ ایسا نہ کیجئے، کہنا مان لیجئے میرا۔

ئم سیٹھ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

بیدہ۔ آپ بڑے ضدی ہیں۔

م سیٹھ۔ ہاں، ضد اور آن پر میں ہر چیز کی بازی لگا سکتا ہوں۔ صرف مال و زر کی نہیں، جان اور آبرو بھی۔ جانتی ہو سلولائیڈ کے فیلتے میں آگ لگانے کے بعد میرا دوسرا کام کیا ہوگا؟

بیدہ۔ (پریشان ہو کر) نہیں آپ کچھ نہ کہیئے۔ چپ رہیئے، خدا کے لیئے۔

م سیٹھ۔ تم میری محرمِ راز ہو۔ تم سے نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا۔

بیدہ۔ (بھرائے ہوئے لہجہ میں) اچھا کہیئے پھر، اس کے بعد کیا کریں گے آپ؟

م سیٹھ۔ اس کے بعد تھیلیوں کا منہ کھول دوں گا ———— اور ہر قیمت پر سلیم ————

بیدہ۔ (سہم کر) کیا سلیم کی جان لینے کا بھی فیصلہ کر چکے ہیں آپ؟

قاسم سیٹھ۔ ہاں، یہ میرا اٹل فیصلہ ہے،

زبیدہ۔ خدا کے لئے کسی اور پر نہیں، اپنے اوپر رحم کیجئے۔

قاسم سیٹھ۔ (مجنونانہ قہقہہ کے ساتھ) تم بزدل ہو، گھبرا گئیں،۔ شاید
سمجھتی ہو، میں پکڑ لیا جاؤں گا۔ میرے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑیں
میں عدالت میں گھسیٹا جاؤں گا۔ مجھے قتل کے الزام میں پھانسی ہو

زبیدہ۔ ہاں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ نہیں یہ کچھ نہیں ہو گا۔

زبیدہ۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

قاسم سیٹھ۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے، کیا یہ پولیس مجھے گرف
کرے گی جس کا انسپکٹر جنرل میرے ساتھ راتوں کو شراب پیتا
کیا وہ مجسٹریٹ میرے خلاف فیصلہ کرے گا جس کا گھر میر
تحفوں سے پٹا پڑا ہے؟ کیا وہ جج مجھے پھانسی کا فیصلہ سنائے
جو میری شبینہ مجلسوں میں برابر کا شریک ہوتا ہے —— نہیں
زبیدہ یہ کچھ نہیں ہو گا۔

زبیدہ۔ پھر بھی کسی کی جان لینا پاپ ہے گناہ ہے۔

قاسم سیٹھ۔ زبیدہ تم ایک فنکار ہو، واعظ نہیں، یہ ایک فلم کمپنی کا نگار خا
ہے، مجلس پند نہیں، میں ایک آدمی ہوں، فرشتہ یا دی
نہیں، مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو

زبیدہ۔ آپ کو تباہ ہوتے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں؟!

م سیٹھ۔ صرف دیکھتی رہو، زبان بند رکھو۔ سلیم اب زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ زندہ رہنے کا حق کھو چکا ہے۔ خوش قسمت تھا کہ ہیں موٹر ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر نرسنگ ہوم پہنچ گیا اور وہ بمبئی آکر ہرمزجی کا کارندہ بن گیا، ورنہ ماتھران سے کہیں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا، مگر اب ——؟ اب وہ مرے گا۔

بیدہ۔ واقعی سلیم نے بڑی بُری حرکت کی، میں نے پھر اسے منہ نہیں لگایا۔ وہ کئی دفعہ آیا۔ مگر میں نے بات بھی نہیں کی، لیکن

م سیٹھ۔ لیکن کیا؟

بیدہ۔ انسان کی جان بڑی قیمتی ہے۔

م سیٹھ۔ یعنی اسے زندہ رہنے دوں؟

بیدہ۔ جی ہاں۔

یٹھ۔ ناممکن —— اگر وہ زندہ رہے گا تو میری زندگی رائگاں جائیگی میں اگر اسے ہلاک نہ کر سکا تو خودکشی کر لوں گا۔

بیدہ۔ (سہم کر) سیٹھ صاحب!

یٹھ۔ ہاں مس زبیدہ، میں غلط نہیں کہتا۔ جب تک وہ زندہ ہے میرا دل جلتا رہے گا۔ میری روح جلتی رہے گی۔ میرا دماغ جلتا رہے گا۔ اس کو مر جانے دو تاکہ میں زندہ رہ سکوں، اسے مٹ جانے دو تاکہ میں باقی رہ سکوں۔ اسے فنا کے گھاٹ اتر جانے دو تاکہ میں زندگی کا لطف اٹھا سکوں۔

زبیدہ۔ آپ کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔

قاسم سیٹھ۔ مشکل نہیں، ناممکن۔

زبیدہ۔ شاید فخر ہے آپ کو اپنے ضدی ہونے پر؟

قاسم سیٹھ۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے

زبیدہ خاموش ہو گئی۔ قاسم سیٹھ نے بھی سکوت اختیار کر لیا گ
پر سگریٹ پیتے رہے۔ دو دو کش لینے کے بعد نیا سگریٹ جلاتے او
پھینک دیتے، لیکن دماغ خاموش نہیں تھا۔ ذہن کی کارگاہ میں کام ہو رہا
تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجائی۔ دربان حاضر ہوا۔ اس سے کہا۔ "جاؤ مسٹر جبری د
بلا لاؤ۔ وہ فوراً ہانپتے کانپتے حاضر ہوئے۔ قاسم سیٹھ نے ان سے فرمایا۔ "مرز
سے تو آپ کے بڑے تعلقات ہیں؟

مسٹر جبری والا نے اثبات میں سر ہلایا۔ قاسم سیٹھ نے کہا۔ "وہ دادر
ٹون کے جنرل مینیجر ہیں، ان سے ذرا پتہ لگایئے۔ سلیم کہاں رہتا ہے
وہ سلیم جو پہلے ہمارے ہاں تھا۔ اب ان کی کمپنی میں اسٹوری رائٹر
گیا ہے۔"

مسٹر جبری والا نے سر تسلیم خم کیا اور تشریف لے گئے۔ قاسم سیٹھ
چپ ہو گئے، ان کی آنکھیں لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔ چہرہ پر غصہ ا
برہمی کے آثار بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ زبیدہ گم سم بیٹھی یہ کیفیت دیکھ
تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے؟ بیٹھے یا چلی جائے؟ اس
میں قاسم سیٹھ نے پھر گھنٹی بجائی۔ دربان حاضر ہوا۔ اس

ے زمایا، مسٹر رضوی کو بلا لاؤ، وہ چلا گیا۔ ذرا دیر میں مسٹر رضوی تشریف لائے
سیٹھ صاحب کی کمپنی میں پروڈکشن مینیجر تھے۔ قاسم سیٹھ نے انہیں دیکھ
لتا ہوا سگریٹ زور سے دیوار پر دے مارا، پھر کہا۔

"ان سارے ڈبوں میں آگ لگا دیجئے جن میں سلیم کی لکھی اور ہماری
ئی ہوئی کہانی بند ہے۔"

رضوی صاحب اپنے آقا کا یہ عجیب و غریب فیصلہ سن کر دم بخود ہو
ں۔ صورت تصویر خاموش کھڑے رہے۔ سیٹھ صاحب کو جلال آ
۔ انہوں نے گرجتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

رضوی صاحب نے رکتے رکتے کہا "سن تو لیا لیکن ان ڈبوں میں
ولائیڈ کے فیتے نہیں، لاکھوں روپے بند ہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں،
ھوں روپوں میں آگ لگا دوں؟"

قاسم سیٹھ نے بادل کی طرح گرج کر کہا۔ "ہاں لگا دیجئے آگ۔ وہ میرا
یہ ہے میں اسے جیب میں بھی رکھ سکتا ہوں، آگ میں بھی ڈال سکتا ہوں،
ب کو آخر تامل کیوں ہے؟

رضوی صاحب پرانے آدمی تھے، دل میں سوچا شاید یہ شخص نشہ میں
ں کر رہا ہے، آخر کہا۔ "تو سرکار میں ماچس دیتا ہوں آگ آپ لگائیے۔"
م سیٹھ تیار ہو گئے۔ رضوی کے ساتھ اسٹاک روم میں گئے۔ سارے ڈبے
ے، ماچس لی اور آگ لگا دی۔ اور ڈبے شب برات کے پٹاخوں

کی طرح چیخ چیخ کر ختم ہو گئے۔ رضوی صاحب کی نلے کی سانس نلے، اوپر کی اوپر، زبیدہ بھی حیران اور دم بخود کھڑی تھی۔ ہاں قاسم سیٹھ تھے جو اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھے جیسے یہ سلولائیڈ کا فیتہ نہیں جلا، سلیم کی ارتھی میں آگ لگی ہے، وہ ہنسنے لگے۔ زبیدہ کا ہاتھ پکڑا، رضوی صاحب کو عالمِ نزع میں وہیں چھوڑا۔ اور پھر اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے یہاں مسٹر جری والا تمام حالات سے بے خبر منتظر بیٹھے تھے، پوچھا۔

"کہیے پتہ چلا؟"

مسٹر جری والا نے سبق دہرا دیا۔

"جی ہاں، وہ ماہم میں درگاہ کے قریب "گل منزل" کے کمرہ نمبر ۱۸ میں رہتا ہے!"

قاسم سیٹھ نے ایک قہقہہ لگایا۔ "جائیے اپنا کام کیجیے۔"

مسٹر جری والا چلے گئے۔

(۳۴)
گل منزل

"دادر موودی ٹون" کے اسٹڈیو سے خوش خوش نجمہ اور رعنا باہر نکلیں کار بالکل پھاٹک کے پاس کھڑی تھی، ڈرائیور نے اتر کر ادب سے دروازہ کھولا۔ دونوں بیٹھ گئیں، کچھ نہ کہنے کے معنی یہ تھے کہ گھر جانا ہے لیکن جب کار اسٹارٹ ہوئی تو نجمہ نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "ماہم چلو۔"

رعنا نے کہا۔ "ماہم چل کر کیا کرو گی اس وقت؟"

نجمہ نے بے رخی سے کہا۔ "ایک صاحب سے ملنا ہے۔ تم بھی مل لینا بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

رعنا۔ جی نہیں میں نہیں مل سکتی کسی سے ——— لیکن وہ ہیں کون صاحب؟

نجمہ۔ جب ملنا نہیں ہے تو نام پوچھ کر کیا کرو گی؟

رعنا۔ (بگڑ کر) ادھر نہ بناؤ، تم سے کچھ پوچھنا غضب ہو جاتا ہے، جیسے
میں لقمہ بنا کر کھا جاؤں گی۔ تمہارے ان صاحب کو۔

نجمہ۔ بس چلے تو ضرور کھا جاؤ، کیونکہ اسی فکر میں ہو، لیکن وہ صاحب
لوہے کے چنے ہیں، انہیں چبانا آسان نہیں ہے۔

رعنا۔ نجمہ تمہاری یہ باتیں بہت یاد آئیں گی، پونا چھوڑ دو، بمبئی آجاؤ۔

نجمہ۔ چلی تو آؤں، میرا خود وہاں جی نہیں لگتا، لیکن یہاں آکر کروں گی کیا؟

رعنا۔ جو وہاں کرتی ہو۔ میں نے ہرمزجی اور مسٹر مہتا سے بات چیت کر
لی ہے۔ تم سے اور تنویر سے اچھے شرائط پر کنٹریکٹ کرنے پر تیار
ہیں۔ آج ہی تنویر کو ٹرنک کال کر کے بلا لو۔

نجمہ۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

ڈرائیور نے کار کی رفتار مدھم کر دی اور پوچھا۔ "ماہم تو آگیا، کہاں
جانا ہے۔

نجمہ نے جواب دیا۔ "ہاں ڈرائیور درگاہ کے پاس چلو۔"

رعنا مسکرانے لگی۔ "کیا نذر ماننے آئی ہو؟

نجمہ نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ نذر دینے آئی ہوں۔ خدا
کرے قبول ہو جائے۔

ڈرائیور نے پھر رفتار کم کر دی، اور دریافت کیا۔ درگاہ آگئی کیا یہاں
اتریں گی۔

نجمہ نے جواب دیا۔ "ڈرائیور ذرا اتر کر معلوم کرو گل منزل کہاں ہے"

ڈرائیور نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ رہی صاحب"

نجمہ کار سے اتر آئی، رعنا سے پوچھا "یہیں بیٹھو گی یا ساتھ چلو گی؟"

وہ اترتی ہوئی بولی "جیسا کہو ——— لیکن یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کروں گی، چلو چلتی ہوں۔"

نجمہ کی راہ نمائی میں رعنا گل منزل کے ۱۸ نمبر کمرہ کے سامنے جا کھڑی ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ تھپتھپایا، ذرا دیر کے بعد دروازہ کھلا سلیم صاحب سامنے کھڑے تھے، نجمہ مسکرا رہی تھی۔ رعنا دم بخود تھی اور سلیم صاحب گھبرائے ہوئے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں شیطان کی خالائیں یہاں کیسے پہنچ گئیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ کیوں آئی ہیں، اب پذیرائی کیسے کی جائے؟

نجمہ نے کہا "اگر ہمارا آنا آپ کو ناگوار ہوا ہے تو چلے جاتے ہیں! آؤ رعنا!"

اب تو سلیم بالکل سٹ پٹا گیا۔ اس نے کہا "بھلا آپ کا آنا ناگوار کیسے ہو سکتا ہے ——— آیئے، تشریف لایئے!"

نجمہ اور رعنا اندر آ گئیں۔ ایک اوسط درجہ کا کمرہ تھا۔ ایک چارپائی، ایک میز، تین چار کرسیاں، اور کاغذات کا ڈھیر، نجمہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، نہ ہم لوگ چائے پئیں گے نہ سوڈا، کسی تکلف کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر زیادہ سے زیادہ آپ اپنی ترجمانی کا حق رکھتی ہیں، مس رعنا کے بارے میں کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ بھی کچھ نہیں پئیں گی، کیوں مس رعنا، چائے تو آپ ضرور پی لیں گی؟" رعنا نے جواب دیا، "پی لوں گی۔" نجمہ بولی۔ "بس اپنی باتوں پر جی جل جاتا ہے، یا تو ملاقات کرنے پر آمادہ نہیں تھیں، یا چائے پینے بیٹھ گئیں —— خیر سلیم صاحب میں بھی چکھ لوں گی، دیکھوں یہاں کی چائے کیسی ہوتی ہے؟"

سلیم چائے لینے کے لئے چلا گیا، اب رعنا کو موقع ملا۔ اس نے زور سے ایک دو ہتڑ نجمہ کی پیٹھ پر جمایا اور کہا۔ "میں کہتی ہوں کیا تو سراغرساں بھی ہے، سلیم صاحب کا پتہ کیسے معلوم کر لیا تو نے؟"

نجمہ ذرا پرے ہٹتے ہوئے بولی۔ تمہاری نظر میں چاہے قدر نہ ہو ورنہ میرا تبسم بڑا قیمتی ہے، مسٹر مہتا یہ وار نہ سہہ سکے، ایک ہی دفعہ میں بتا دیا تم تو ہر مز جی کو اپنی کافر ادائیں دکھانے میں مشغول تھیں، میں ہال کے گوشہ میں، مسٹر مہتا کو تبسم کے پھندے میں پھانس رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سلیم صاحب کا پتہ چل جائے اور پھر ان سے ملاقات نہ کی جائے خوش تو بہت ہو رہی ہو گی اس وقت جی ہی جی میں، شکریہ ادا کرو میرا، تمہاری نیت گناہ کی ہو تو ہو، میں نے تو ثواب سمجھ کر دو بچھڑے ہوؤں کو ملایا ہے۔ رعنا نے پھر ایک زور کی چٹکی لی اور کہا۔

شامت آئی ہے کچھ، چپ، خبردار جو اب کوئی بات منہ سے نکالی۔ بڑی حرفوں کی بنی ہوئی ہے تو بھلا تو یہ جیسے سیدھے سادھے آدمی کے

پاس کیا رہ سکے گی ؟ رو دے گا بیچارا اپنی قسمت کو، کتنی تیز ہے تو سوچتی ہوں اور دنگ رہ جاتی ہوں!"

نجمہ بولی "سب کچھ کہتی ہو، شکریہ ادا نہیں کرتیں میرا؟"

اتنے ہی سلیم واپس آگیا۔ بیرا، چائے کی ٹرے سر پر رکھے ساتھ تھا۔ سلیم نے چائے بنائی اور دونوں کے سامنے رکھ دی، ایک پیالی سے خود شغل کرنے لگا۔ نجمہ نے ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "بڑی میٹھی ہے۔" سلیم نے پوچھا۔ "کیا شکر زیادہ ہو گئی ہے؟" نجمہ نے جواب دیا۔ "جی ہاں اتنی زیادہ ہے کہ منہ کڑوا ہو گیا ہے!" سلیم نے ایک گھونٹ لیا، تو معلوم ہوا کہ سرے سے شکر ہی نہیں ہے، اس نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ، یہ ہوٹل والے بھی کیسے بدحواس ہوتے ہیں، ابھی لایا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پھر باہر چلا گیا اور ذرا دیر میں شکر لے کر واپس آگیا، چائے پینے کے بعد نجمہ نے کہا۔

"کہیے سلیم صاحب، داد تو نہ دیجیے گا۔ ہم نے آپ کو ڈھونڈ ہی نکالا ـــــ "تو جہاں جا کے چھپا، ہم نے وہیں دیکھ لیا۔"

سلیم۔ واقعی آپ نے کمال کیا کہ مجھ جیسے گمنام اور ناچیز شخص کو تلاش کر لیا۔ لیکن اس نوازش کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی؟

نجمہ۔ وجہ کیا، بس یوں ہی ملنے کو جی چاہ رہا تھا، چلے آئے، اور ہاں انہیں رعنا کو آپ سے معافی بھی مانگنی تھی۔

سلیم۔ معافی! مجھ سے؟

نجمہ۔ جی ہاں، بڑی باخدا ہو گئی ہیں آپ آج کل، یہ کئی دفعہ کہہ چکی ہیں ہیں

نے سلیم صاحب کو بہت ستایا ہے، کہیں ان کا وبال مجھ پر نہ پڑے۔

رعنا۔ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے، میں جاتی ہوں،

نجمہ۔ جاتی کیسے ہو۔ ابھی تو بہت سی باتیں کرنی ہیں سلیم صاحب سے۔

رعنا۔ اس طرح کی باتیں۔

نجمہ۔ مجھے تو ایسی آتی ہیں جیسی تمہیں آتی ہوں تم کرو۔ سلیم صاحب اب روئے سخن رعنا کی طرف کر لیجئے، میں صرف سنوں گی آپ دونوں کی باتیں ——— لیکن قبل اس کے کہ آپ دونوں راز و نیاز میں مصروف ہوں، پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔

سلیم۔ فرمایئے، کیا سوال ہے آپ کا؟

نجمہ۔ آج کل کیا کر رہے ہیں آپ؟

سلیم۔ کچھ نہیں، بس لکھتا پڑھتا رہتا ہوں۔

نجمہ۔ قاسم سیٹھ کے لئے کوئی نئی اسٹوری لکھ رہے ہوں گے؟

سلیم جی نہیں وہاں کا کام تو میں نے چھوڑ دیا ہے۔

نجمہ۔ ہاں ٹھیک ہے، زبیدہ سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ وہ بہت شاکی ہے آپ کی خود رائی کی۔

سلیم۔ یہ تو میں نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ خفا ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا، میری شاکی بھی ہیں۔

نجمہ۔ تو کیا آپ وہاں بھی نہیں جاتے؟

سلیم۔ جی ہاں، وہاں بھی نہیں جاتا۔

نجمہ۔ بڑے جنگ جو ہیں آپ، جس سے دیکھئے اس سے لڑنے کو موجود چاہے وہ عورت ہو یا مرد!

سلیم۔ میں تو کسی سے بھی نہیں لڑتا، اور عورتوں کی تو میری نظر میں بڑی عزت ہے۔ اس سے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مس زبیدہ میری اس دنیا میں سب سے بڑی محسن ہیں ان سے تو اسی دن لڑ سکتا ہوں جس دن پاگل ہو جاؤنگا۔

نجمہ۔ کیا اس کا بھی امکان ہے۔

رعنا۔ (ہنستے ہوئے) خدا کیلئے اپنی بکواس بند کرو، کوئی نہ ہوتا ہو تو تم اسے پاگل بنا دینے کے لئے کیا کم ہو؟ —— سلیم صاحب! آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانئے گا۔ اس کے دماغ کے پیچ ہمیشہ سے ڈھیلے ہیں۔

سلیم۔ جی نہیں، میں برا نہیں مانتا۔

نجمہ۔ شکریہ، —— ہاں تو آپ نے یہ نہیں بتایا، آج کل کیا مشغلہ ہے۔

سلیم۔ وہی لکھنے پڑھنے کا۔ پہلے میں نے ایک ناول لکھا تھا، پھر اسی کو فلمی کہانی میں منتقل کر دیا۔

نجمہ۔ اس کہانی کا کیا حشر ہوا۔

سلیم۔ ہرمز جی کوئی صاحب ہیں۔ انہوں نے معقول داموں پہ وہ خرید لی ہے۔

نجمہ۔ کون ہرمز جی؟ وہی دادر مووی ٹون کے پروپرائٹر؟

سلیم۔ جی ہاں، وہی

نجمہ۔ جو تازہ فلم انہوں نے بنائی ہے وہ آپ کی ہے؟

سلیم۔ میری ہی ہوگی، کیونکہ مجھے دعوت دینے تو آئے تھے، اس کے افتتاحی

جلسہ میں شرکت کی۔

نجمہ۔ جلسہ تو بڑا دلچسپ ہوگا۔ ہم بھی چلیں گے، کب ہے؟

سلیم۔ وہ تو شاید آج ہی تھا۔

نجمہ۔ آج ہی تھا، اور آپ تشریف نہیں لے گئے؟

سلیم۔ جی نہیں، —— میری یہ عادت نہیں، میں کہیں نہیں جاتا۔

نجمہ۔ اچھی عادت ہے اور ہر مزجی بھی خوب ہیں کہ اس عادت کو برداشت کر رہے ہیں۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو پتہ کٹ گیا ہوتا آپ کا اب تک کمپنی سے۔

سلیم۔ (ہنستے ہوئے) آپ تو انہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں گی ان سے کہیے وہ پتہ کاٹ دیں۔

نجمہ۔ میں زبیدہ کا دل کہاں سے لاؤں، ورنہ واقعی ایسا کرتی۔

سلیم۔ مس نجمہ میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا، اگر آپ مس زبیدہ کا نام بیچ میں نہ لائیں۔

نجمہ۔ کیوں جناب —— کیا یہ نام آپ نے رجسٹر کرا لیا ہے؟

سلیم۔ وہ میری محسن ہیں۔ میں ان کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔

نجمہ۔ لیکن میں نے ان کے خلاف تو کچھ نہیں کہا۔

سلیم۔ ممکن ہے کچھ نہ کہا ہو لیکن میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ اس لئے اپنے تاثرات عرض کر دیئے ہیں۔

نجمہ رعنا کی طرف دیکھنے لگی، رعنا اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ نجمہ نے کہا۔ "اچھا اب ایسی غلطی نہیں ہوگی، لیکن آج آپ نے بھی بہت بڑی غلطی کی

آج کے افتتاحی جلسہ میں جانا چاہیئے تھا آپ کو ـــــ شاید آپ کو تو یہ
بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس فلم میں ہیروئن کا پارٹ کس نے ادا کیا ہے ؟

میں نہیں جانتا !

تو ہاتھ بڑھائیے میں تعارف کرا دوں، ـــــ دیکھئے یہ ہیں مس رعنا۔
انہوں نے ہیروئن کا ایسا لاجواب پارٹ ادا کیا ہے آپ کی فلم میں کہ یہ
فیصلہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہو جائے گا کہ پکچر کی کامیابی کا سہرا آپ
کی کہانی کے سر باندھیں یا رعنا کی اداکاری کو خراج تحسین پیش کریں ،
واقعہ یہ ہے کہ دونوں چیزیں اپنے انتہائی عروج پہ ہیں۔

رعنا اٹھ کھڑی ہوئی ، اچھا سلیم صاحب اب اجازت دیجئے لیکن ایک
بات آپ کو میری ماننا پڑے گی۔ آج شام کا کھانا آپ میرے ساتھ ،
میرے غریب خانہ پہ کھائیں گے۔ باندرہ میں پالی ہل پہ رہتی ہوں،
میرے بنگلہ کا نمبر ۴ ہے آ رہے ہیں آپ ؟

سلیم نے جواب دیا۔ "بہ سر و چشم حاضر ہوں گا۔"

---

(۳۵)

عالمِ خیال

بمبئی کے مقامات میں پالی ہل، سمندر کے کنارے ایک رو
مقام ہے۔ آس پاس زیادہ آبادی دیسی عیسائیوں کی ہے۔ لیکن
سی پہاڑی اس مذہب کے پوجنے والوں پر مشتمل ہے جس کا نام دولت
یہاں امیروں اور دولت مندوں، تاجروں اور سرمایہ داروں، قومی
داروں اور آسمانِ فلم کے ستاروں کے شاندار بنگلے ہیں، کوٹھیاں ہیں
ہیں —— ایک چھوٹے سے لیکن خوش قطع ہیں رعنا بھی یہیں رہتی
اس وقت زرق برق لباس میں بنگلہ کے برآمدہ میں سنگِ مرمر کے ایک
سے ٹیک لگائے، پرشور اور مواج سمندر کے سامنے کھڑی سر بفلک
کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ رات اپنا ڈیرہ ڈال چکی تھی، چاندنی چھٹکی ہوئی
اس خاموش اور سہانے منظر میں اگر کوئی آواز گونج رہی تھی تو وہ سمند

ں اور مسلسل شور تھا ـــــ سلیم اب تک نہیں آیا تھا وہ اسی کا انتظار
ی۔

ی وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ
وں سے سلیم کی طرف میرا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اور آج تو میں ایسا
رہی ہوں جیسے مجھے اس سے محبت ہے ـــــ کیا واقعی میں اس
رنے لگی ہوں۔

ت کوئی بری چیز تو نہیں، میں نے، اس محبت کے راستے میں پتھر
یں وہ ایسے کمزور تھے کہ راستہ روک نہ سکے، ایک ہی جھونکے میں
گئے جیسے آندھی میں پھول بکھر جاتے ہیں، اسی طرح محبت کی آندھی
ھروں کو بکھیر دیا، کیا واقعی محبت اتنی طاقت ور ہے؟

لیم کو چھیڑتی تھی بناتی تھی، طنز و طعن کرتی تھی اس پر، یہ میری زندہ
وئی نہ تھی۔ یہ کشمش تھی، یہ میرے جذبات اور شعور میں جنگ
لیم کو پسند کرتی تھی، لیکن وہ میرے جوڑ کا آدمی نہ تھا۔ سوسائٹی
رتبہ اس سے کہیں اونچا تھا، میری تجوری اس کی جیب کی طرح خالی
لاوارث بھی نہ تھی کہ کوئی میرا پوچھنے والا اور چاہنے والا نہ ہو۔
ے کہ مچ کسی نے خودکشی نہ کی ہو۔ لیکن مجھ پہ مرنے والوں کی کمی
۔ میں سلیم کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ لیکن قسمت کے
ے ہیں، وہ میرے راستے سے نہ ہٹ سکا، میری منزل مقصود
ی زندگی بن گیا۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے زبیدہ کے ہاں اسے پہلے پہ
تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی، نہ طرحدار، نہ بانکا، نہ مجلس طر
باتوں کا جادوگر، نہ دولت مند، نہ شہرت یافتہ، لیکن میرا دل اسکی
جھکتا ہی رہا اور ما نفران میں جاکر تو اس نے مجھ سے بغاوت شروع
کیا وہ آنسو میں بھول سکتی ہوں جو سلیم سے باتیں کرتے کرتے دفعتہً ن
تھے۔ جب میں اپنی زیادتیوں پر اس سے معافی مانگنے گئی تھی۔ وہ
بے بسی کے نہ تھے، مجبوری کے نہ تھے، وہ میرا کیا کر سکتا تھا؟ کیا بگ
تھا میرا؟ کچھ بھی نہیں، لیکن میں اس سے معافی مانگ رہی
دل بے چین تھا، روح بے قرار تھی، طبیعت بے کل تھی، کسی پہ
نہ تھا۔

ہاں خوب یاد آیا، پہلے پہل محبت کی چنگاری سلیم کا وہ روپ
کر بھڑکی، جب اس نے قاسم سیٹھ کی رعونت کو پاؤں تلے کچلا تھا،
اس کی غربت نے قاسم سیٹھ کی دولت کو نیچا دکھایا تھا۔ جب وہ ایک
نڈر، دلیر اور باحوصلہ نوجوان کی طرح تمتماتے ہوئے چہرہ کے ساتھ
ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور قاسم سیٹھ بھیگی بلی بنے بیٹھے رہے
اس کا یہ روپ دیکھ کر میرا دل سرِ عقیدت خم کرنے پر مجبور ہو گیا
اب تک میں مزاحمت کرتی رہی تھی۔ اب وہ مزاحمت ختم ہو گئی اور
تسلیم کر لینا پڑا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ پھر خود دار بھی کس
ہے، دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ جیب میں ایک پیسہ نہیں۔ سر چھ

جاۓ نہیں لیکن اکڑ کا یہ عالم کہ قاسم سیٹھ کی نوکری چھوڑ دی۔ زبیدہ کا گھر چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی کمپنی میں نوکری دلوانے کی پیش کش کی، وہ مسترد کر دی۔ نہ جانے کس طرح بمبئی پہنچا اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگا۔ کیا ایسی آن کے آدمی کے ساتھ بھی محبت نہ کی جاۓ۔

ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

لیکن کیا وہ بھی مجھ سے محبّت کر سکتا ہے؟

نجمہ کا خیال ہے، وہ زبیدہ سے محبت کرتا ہے، نجمہ کا یہ خیال بھی ہے کہ خود زبیدہ بھی اسے چاہتی ہے۔

کیا یہ سچ ہے؟ —— یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

نجمہ بے وقوف ہے، وہ زبیدہ اور سلیم کی فطرت سے ناواقف ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کر ہی نہیں سکتے، سلیم زبیدہ کو محسن سمجھتا ہے۔ محسن سے عقیدت رکھی جا سکتی ہے، محبّت نہیں کی جا سکتی، زبیدہ نے اسے پناہ دی، روٹی دی، سہارا دیا نوکری دی۔ زندگی بھر وہ احساس برتری میں مبتلا رہے گی اور سلیم احساس کمتری میں۔ زبیدہ کبھی بھی سلیم کو اپنے برابر نہیں سمجھ سکتی، پھر وہ بھلا کس طرح محبت کر سکتی ہے اس سے؟ نہیں یہ نجمہ کا واہمہ ہے۔

خیر ہو گا، مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یا نفرت؟ محبت کسی کی جاگیر نہیں ہے مجھے بہر حال

محبت ہے سلیم سے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت حتیٰ کہ خود سلیم بھی مجھ سے یہ حق چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، میں محبّت کرتی ہوں۔ محبت کرتی رہونگی ——— یہ میرا فیصلہ ہے۔

اسی لئے میں نے اسے بلایا ہے کہ ذرا ٹٹولوں، دیکھوں کہ حضرت کتنے پانی میں ہیں؟ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نجمہ موجود نہیں ہے، وہ اگر اس وقت ہوتی تو رنگ میں بھنگ ہو جاتا، وہ خاموش نہ رہتی اور ضرور اپنی بذلہ سنجی سے اور شوخی سے فضا کو مکدّر کر دیتی۔ نہ میری سنتی نہ سلیم کی پرواہ کرتی۔ صرف اپنی کہے جاتی، لیکن وہ ان کے پیا، تنویر میاں، میری قسمت سے عین وقت پر بیمار پڑ گئے۔ فون سنتے ہی کیسا گھبرائی ہے اپریل تک کا انتظار نہ کیا۔ موٹر پہ بھاگوں بھاگ پونہ روانہ ہو گئی۔ خدا کرے جلد آجائے میری بڑی اچھی اور قابلِ اعتماد سہیلی ہے، ہرمزجی اور مسز مہتا نے وعدہ کر ہی لیا ہے۔ دونوں میاں بیوی پونہ کے مقابلہ میں یہاں بہت زیادہ کامیاب رہیں گے۔

اب رات کے آٹھ بج چکے تھے سلیم اب تک نہیں آیا تھا۔

رعنا نے گھڑی دیکھی اور چہرہ پہ فکر و تشویش کے آثار بیدار ہو گئے وہ سوچنے لگی، کہیں ایسا تو نہیں، سلیم نے یوں ہی مروت میں آنے کا وعدہ کر دیا ہو۔ لیکن وہ تو بڑا کھرا اور سچا آدمی ہے نہ آنا ہوتا تو صاف معذرت کر دیتا، وعدہ کے بعد نہ آنا، یہ اس کا شیوہ نہیں، پھر؟ کہیں کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آگیا؟ جاؤں، اس کا گھر تو دیکھ ہی چکی ہوں۔ خبر لے آؤں جا کر۔

کن میں وہاں گئی اور وہ ادھر آیا تو؟
ڈرائیور کو بھیج دوں؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں —— یہ سایہ سا کیسا بڑھ
ہا ہے ادھر؟ سلیم ہی تو نہیں ہے؟

---

(۳۶)

دعوت

رعنا ٹکٹکی باندھے آتے ہوئے سایہ کو دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ بالکل قریب آ گیا۔ اس کا خیال صحیح نکلا، یہ سلیم ہی تھا۔ رعنا گرم جوشی کے ساتھ آگے بڑھی۔

"آئیے سلیم صاحب! بہت دیر کر دی آپ نے —— کچھ خبر بھی ہے کیا وقت ہو گیا ہے؟"

سلیم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کچھ ایسی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی، میں تو ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا تھا لیکن گاڑی شاید وقت سے پہلے چھوٹ گئی۔ دوسری ٹرین آدھ گھنٹہ بعد آئی۔ بس والوں نے ہڑتال کر رکھی ہے ورنہ بس پر ہی آ جاتا۔"

رعنا نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"آپ ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچ گئے، لیکن گاڑی وقت سے پہلے
ُوٹ گئی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

سلیم نے جواب دیا- "یا اسٹیشن کی گھڑی غلط تھی یا میری؟ ___ بہرحال
ق صرف ایک منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا-

رعنا سلیم کو، اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کھانے کا بندوبست
نے چلی گئی- ذرا دیر کے بعد واپس آئی اور اسے لے کر ڈائننگ ہال میں
ئی- یہاں میز پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے- دونوں نے
وشی کے ساتھ کھانا کھایا، باتیں بھی ہوتی رہیں ادھر اُدھر کی لیکن سنجیدگی
ے ساتھ- آج کی رعنا وہ رعنا نہ تھی جو بات بات پر سلیم کو بنایا کرتی تھی- بلکہ
رعنا تھی جو ایک شریف میزبان کی طرح، ایک معزز مہمان کی پذیرائی کر رہی
ی- اس تغیر پر سلیم کو حیرت تھی لیکن دل ہی دل میں وہ خوش بھی تھا کہ چلو اچھا
وا- مفت کے دردِ سر سے نجات ملی-

کھانے کے بعد، دونو پھر ڈرائنگ روم میں آگئے- چائے کا دَور
چلنے لگا- اور پھر باتیں شروع ہو گئیں- رعنا نے شکایت آمیز لہجہ میں
ہا، بڑے سنگ دل ہیں آپ، میں ہرگز ایسا نہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کو
لانے میں آپ کو لطف آسکتا ہے-

سلیم نے حیرت سے رعنا کی طرف دیکھا اور پوچھا-

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

رعنا- میں غلط تو نہیں کہتی-

سلیم۔ لیکن میرے بارے میں آپ نے ایسی بات کہی ہے جس سے میں خود اب ناواقف ہی تھا

رعنا۔ اپنا وہ خط یاد کیجئے۔

سلیم۔ کون سا خط؟

رعنا۔ جو آپ نے ماتھران میں لکھا تھا، زبیدہ کے نام اس کا گھر چھوڑتے وقت،

سلیم۔ ہاں یاد ہے لیکن اس میں کوئی بات تو نہ تھی۔

رعنا۔ کیسے نہیں تھی، میرے دل سے پوچھئے۔ میرے بارے میں آپ نے بظاہر سیدھے سادے الفاظ لکھے تھے لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا، ان سیدھے سادے الفاظ میں کتنا گہرا طنز تھا۔ میں تو اس غلط فہمی میں تھی، آپ مجھے معاف کر چکے ہیں لیکن خط کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ بدستور خفا ہیں۔ آپ تو خط لکھ کر چلے گئے لیکن جانتے ہیں مجھ پہ کیا گذری۔

سلیم۔ آپ ہی بتائیں گی تو معلوم ہوگا، کیا گذری آپ پہ؟

رعنا۔ میں رات بھر روتی رہی۔

سلیم۔ کیوں؟

رعنا۔ اپنی بدقسمتی پہ؟

سلیم۔ لیکن مس رعنا، یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے، نہ آپ بدقسمت ہیں نہ خطاوار، نہ میں نے طنز کیا تھا، نہ خفا تھا، آپ کی خوش قسمتی پہ

تو ایک دنیا رشک کرتی ہے اور آپ ہیں کہ اپنے کو بد قسمت سمجھے جا رہی ہیں۔ حد ہو گئی ہے انکسار اور خاکساری کی۔

رعنا۔ اچھا تو اب آپ مجھے بنائیں گے؟ ــــ بہت بہتر بنا لیجیے۔

سلیم۔ مس رعنا، ایسا نہ کہیے۔ میں ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں آپ کی عزت ہے۔

رعنا۔ جی معاف کیجیے۔ اپنے دل میں عزت تو بس زبیدہ ہی کی رکھیے میں اس قابل نہیں ہوں۔

دفعتہً آواز آئی۔

"تم تو اس قابل ہو کہ تم سے محبت کی جائے، اری بے وقوف محبت اس سے کی جاتی ہے جس کی عزت ہو دل میں۔ سلیم صاحب کے دل میں اگر تمہاری عزت نہیں تو محبت بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ نجمہ تھی۔

نجمہ کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر آنے دیکھ کر رعنا تو بہت زیادہ سٹ پٹا گئی اور سلیم کے چہرہ سے بھی ظاہر تھا کہ بہت پریشان ہیں۔

رعنا نے پوچھا۔ "تم تو چلی گئی تھیں تنویر کے پاس۔ پھر کیسے آگئیں؟"

وہ بولی۔ "چلو کون گیا تھا؟ تنویر کس آدمی کا نام ہے۔ میں جانتی نہیں۔"

رعنا ہنسنے لگی، تنویر کو بھی نہیں جانتیں؟ کہیں کچھ دیر اپنے آپ کو

نہ فراموش کر دینا ——— سچ کہو، تنویر کی طبیعت کیسی ہے؟ اسقدر جلد کیسے لوٹ آئیں؟"

نجمہ نے ایک پیالی میں اپنے لئے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"شرارت سمجھ لو، وہ فون جعلی تھا۔ میری ایک سہیلی نے کیا تھا میں نے اسے سکھا پڑھا دیا تھا۔ ورنہ تنویر خدا کے فضل سے اچھے ہیں اور دو ایک روز میں بمبئی آجائیں گے۔ ابھی ٹرنک کال کر کے آرہی ہوں۔

رعنا نے ذرا بگڑتے ہوئے تیور سے پوچھا "لیکن سوانگ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟ مفت میں مجھے پریشان کیا اور خود بھی پریشان ہوئیں؟"

نجمہ بولی۔ "نہ تم پریشان ہوئیں نہ میں، تم نے لطف اٹھایا میں نے کیونکہ میں نے سوچا، سلیم صاحب آرہے ہیں، ذرا موقع دوں تم دونوں کو مل کر بیٹھنے کا، کیوں کباب کی ہڈی بن کر موجود رہوں۔ اس لئے بہانہ کر کے چلی گئی ——— کہئے سلیم صاحب، رعنا نے اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھا یا آپ نے؟

یہ اتنا برجستہ سوال تھا کہ سلیم کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کوئی شخص چوری کرتا ہوا پکڑا لیا جائے نجمہ اس کیفیت سے لطف لے رہی تھی۔ لیکن رعنا نے اسے ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اپنے بیڈ روم میں لے جا کر بستر پہ دھکیلا۔ زور سے دونوں گالوں کو کھینچا اور یہ کہتی ہوئی پھر ڈرائنگ روم میں واپس آگئی۔ "اگر اب کے یہاں سے قدم نکالا تو خیریت نہیں ہے تمہاری۔"

واپس آکر رعنا نے سلیم سے کہا۔ "بڑی شیطان چھوکری ہے نجمہ بھی، بہت نادم ہوں کہ یہ پھر دخل در معقولات کرنے پہنچ گئی، لیکن کروں کیا بے انتہا مخلص اور وفادار ہے، کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔

اب سلیم نجمہ کے وار سے سنبھل چکا تھا۔ اس نے کہا "کوئی بات نہیں مس رعنا۔ میں تو خود ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

اتنے میں نجمہ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھولو، اس کمرہ میں بھوت ہیں، مجھے مارے ڈالتے ہیں۔"

سلیم نے مسکراتے ہوئے رعنا سے استدعا کی، بلا لیجئے، اس طرح نہ وہ چین سے بیٹھیں گی نہ بیٹھنے دیں گی۔"

رعنا نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور کہا۔ آؤ، مرو آکر !"

نجمہ آکر بیٹھ گئی، کہنے لگی میں سوگئی تھی، میں نے خواب دیکھا۔ ایک بہت بڑا بھوت آیا ہے اور میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ آخر تم مجھے بند کیوں کر آئی تھیں، کتنی مشکل سے شور مچایا ہے میں نے ؟"

سلیم نے پوچھا "شور مچانے میں بھی مشکل پیش آتی ہے آپ کو؟"

وہ بڑی معصومیت کے ساتھ گویا ہوئی۔ "ڈر کے مارے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی !"

رعنا اور سلیم دونوں ہنسنے لگے، لیکن نجمہ پر ایسی سنجیدگی اور معصومیت طاری تھی کہ گویا اس نے جو کچھ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے۔ واقعی بھوت اس کا گلا گھونٹ رہے تھے اور دہشت کے مارے اُسکی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

یہ دلچسپ صحبت رات کے گیارہ بجے تک قائم رہی، پھر سلیم نے
اجازت چاہی اور رخصت ہو گیا، چلتے وقت نجمہ نے کہا۔ "کل ناشتہ آپ
صرف میرے ساتھ کریں گے، یہیں، اسی گھر میں"!

سلیم نے جواب دیا، "بسر و چشم حاضر ہونا، لیکن مس نجمہ میں ناز
کرتا ہی نہیں"

رعنا نے ایک چٹکی لی اور آہستہ سے کہا۔ "کیوں ری بے غیرت جھینپ
یا نہیں؟"

نجمہ مسکرانے لگی۔ سلیم چلا گیا۔

---

(۳۷)

لڑائی

جس وقت سلیم رعنا کے ہاں کھانا کھا رہا تھا، اس وقت قاسم سیٹھ زبیدہ کے سامنے شعلہ اور بھبوکا بنے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا بے انتہا غصہ میں ہیں۔ زبیدہ چپ چاپ بیٹھی تھی، کچھ سہمی ہوئی، کچھ خشمگیں، قاسم سیٹھ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مس زبیدہ جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن سلیم کو معاف کردوں یہ نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا۔ وہ بدمعاش ہے، لفنگا ہے، غنڈا ہے میں اسے سزا دوں گا، اور ہاں زبیدہ، وہ چور بھی ہے، چوٹیا کہیں کا حرامزادہ، نمک حرام۔"

زبیدہ چونک پڑی، اس نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں پوچھا۔ "وہ چور بھی ہے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سیٹھ صاحب؟"

وہ تن کر بولے۔ "ہاں مس زبیدہ، میں غلط نہیں کہتا، وہ اول درجہ کا جعلیا، فریبی اور چوٹیا ہے۔"

زبیدہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "ہوگا، ہمیں کیا ——— لیکن یہ عجیب کی بات ہے، اس جیسے آدمی کو چوری کا موقعہ کہاں مل سکتا ہے؟ ——— کہاں گیا تھا وہ چوری کرنے، بات ایسی کیجئے جو سمجھ میں آجائے، مان لے آدمی،

"قاسم سیٹھ نے دلیل بھی پیش کر دی۔ وہ بیچارا برق ہی تو کہتا تھا۔ اس نے جو کہانی ہمیں دی تھی، وہ بھی چوری کی تھی۔"

زبیدہ۔ برق جھوٹا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ نہیں وہ سچا ہے۔

زبیدہ۔ لعنت بھیجئے اس قصہ پر ——— برق سچا سہی۔ سلیم جھوٹا سہی، لیکن کیا ہم کوتوال شہر ہیں کہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔

قاسم سیٹھ۔ تم نہ ہوگی۔ میں تو ہوں، میں تو دیکھ لینا جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر رہوں گا۔ دو چار ہزار روپے خرچ ہو جائیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں۔

زبیدہ۔ آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ارادہ کیا ہے آپ کا؟

قاسم سیٹھ۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

زبیدہ۔ پھر بھی بتائیے تو سہی۔

قاسم سیٹھ۔ اب د اور مودی ٹون پر مقدمہ دائر ہوگا۔ ہاں بڑا مزہ آئے گا۔ خدا کی قسم بندھے بندھے پھریں گے یہ سیٹھ ہرمزجی، یہ مسٹر دھنا، یہ مس رعنا،

زبیدہ۔ رعنا کیوں؟ اس غریب کی کیا خطا ہے؟

قاسم سیٹھ۔ غریب! ۔۔۔۔! ۔۔۔؟ وہ غریب ہے، بڑی چلتی ہوئی ہے۔
اسے غریب نہ کہو، وہ تو ہمیں خرید لے،

زبیدہ۔ اچھا اس سے بھی خفا ہو گئے آپ؟

قاسم سیٹھ۔ وہ بھی دشمنوں سے ملی ہوئی ہے۔ دشمن کا دوست دشمن ہی ہوتا ہے۔

زبیدہ۔ ہاں اس کے رنگ ڈھنگ تو کچھ مجھے بھی پسند نہیں اور سلیم صاحب کو جس طرح چپکے چپکے اس نے ہرمزجی کے ہاں پہنچایا، اس کا بھی مجھے صدمہ ہے، اسے یہ نہ کرنا چاہیے تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تاک میں تھی کہ سلیم صاحب آپ کی نوکری چھوڑیں، میرے گھر سے جائیں اور وہ انہیں لے اڑے۔ خیر یہ دنیا ہے، یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ ہاں بھئی، یہ دنیا ہے، کل جگ نہیں، کرجگ ہے یہ، اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے ۔۔۔۔۔ ہاتھی سے گنا کھانا آسان نہیں ایک ایک سے سمجھ لوں گا خدا کی قسم۔

زبیدہ۔ بس میں آپ کی اسی بات سے چڑتی ہوں، کیا آپ خدائی فوجدار ہیں جو ایک ایک سے سمجھتے پھریں گے؟ جو جیسا کریگا، ویسا بھرے گا۔ خدا کا کام اپنے ہاتھ میں کیوں لیں؟ بدلہ اسی کو لینا چاہیے ہمیں نہیں،

قاسم سیٹھ۔ یہ تمہارا خیال ہے۔

زبیدہ۔ ہاں، لیکن غلط تو نہیں؟

قاسم سیٹھ۔ بالکل غلط، ـــــ ذرا معاملہ عدالت تک آنے دو، پھر دیکھنا کیسا تماشہ نظر کے سامنے آتا ہے۔

زبیدہ۔ عدالت؟

قاسم سیٹھ۔ ہاں دادر مووی ٹون کے پروپرائٹر اور ڈائریکٹر ہرمزجی اور دہنا صاحب پر مقدمہ چلے گا۔

زبیدہ۔ کس الزام میں مقدمہ چلے گا؟

قاسم سیٹھ۔ چوری کا مال خریدنا جرم ہے، تو چوری کی کہانی خریدنا، اس سے نفع اٹھانا اور اصل مصنف کو نقصان پہنچانا بھی جرم ہے۔

زبیدہ۔ وہ تو ہے، لیکن کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہرمزجی کی فلم چوری کی کہانی سے بنائی گئی ہے۔

قاسم سیٹھ۔ ہاں، یہ میرا مطلب نہیں، دعوےٰ ہے، اور اسے عدالت میں ثابت کر دوں گا۔

زبیدہ۔ بڑی عجیب بات ہے۔

قاسم سیٹھ۔ بہت عجیب، مزہ آتا، اگر ہرمزجی وغیرہ کے ساتھ سلیم صاحب بھی عدالت کے کٹہرہ میں مجرم بن کر نظر آتے۔

زبیدہ۔ تو کیا انہیں چھوڑ دیا جائیگا؟ ان پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا؟

قاسم سیٹھ۔ (قہقہہ لگاکر) بڑی بھولی ہو خدا کی قسم ـــــ اری خدا کی بندی کہیں مردے بھی عدالت کے کٹہرے میں لائے جاتے ہیں؟ کہیں ان پر بھی مقدمہ چلتا ہے؟

زبیدہ۔ اوہ، ـــــ سلیم صاحب تو اس وقت تک قتل ہو چکے ہوں گے؟

قاسم سیٹھ۔ ہاں، اور کیا، اس کی لاش چیل کوّے کھا چکے ہوں گے اور اس کی روح جہنم میں سلگ رہی ہوگی۔

زبیدہ۔ سیٹھ صاحب! باز آجائیے اس ارادہ سے، میرا کہنا مانیئے۔

قاسم سیٹھ۔ واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

شبِ فرقت سے مراد ہے زندگی۔ یہ زندگی یا سلیم کو ملے گی یا مجھے، ہم دونوں ایک وقت میں زندہ نہیں رہ سکتے۔

زبیدہ۔ پھر کہتی ہوں یہ لفظ زبان پر نہ لائیے۔ یہ ارادہ بدل دیجئے۔

قاسم سیٹھ۔ آخر تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ تم نے خان بہادر اشتیاق علی خاں کو ٹھکرا دیا، تم نے نواب طاہر علی بیگ کو منہ نہ لگایا۔ تم نے میری آرزوؤں اور تمناؤں کی پذیرائی کبھی نہ کی، لیکن سلیم ـــــ؟ کیا تم اسے چاہتی ہو؟

زبیدہ۔ (بگڑ کر بلند آواز سے) سیٹھ صاحب اپنی زبان بند رکھیئے۔ میں ایسی بیہودہ باتیں نہیں سن سکتی۔

قاسم سیٹھ۔ قاسم سیٹھ کی زبان بند رکھنے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ جواب دو زبیدہ، کیا تم اسے چاہتی ہو؟

زبیدہ۔ ایسی مہمل باتوں کا جواب دینا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔

قاسم سیٹھ۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ تم سلیم کو چاہتی

ہو تو اس تعلق خاطر اور اس قلبی محبت کے باوجود جو مجھے تم سے ہے
میں تمہیں بھی اس کے پاس پہنچا دوں گا۔ تمہیں بھی زندہ نہ رہنے
دوں گا۔ سمجھیں؟

زبیدہ۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیے،

قاسم سیٹھ۔ تم میری توہین کر رہی ہو۔

زبیدہ۔ آپ بھی بڑی دیر سے میری توہین کر رہے ہیں۔ میرے صبر و ضبط
کا زیادہ امتحان نہ لیجئے۔ جائیے۔ چلے جائیے یہاں سے ـــ اور
ہاں آپ بھی ایک بات کان کھول کر سن لیجئے۔

قاسم سیٹھ۔ (جانے کے لئے اٹھتے ہوئے) کہو کیا چاہتی ہو؟

زبیدہ۔ اگر سلیم کا بال بھی بیکا ہوا تو آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔

قاسم سیٹھ۔ کیا تم مجھے قتل کر دو گی ـــ اگر یہ ارادہ ہے تو ابھی قتل کر دو
تمہارے ہاتھ سے قتل ہونا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔

زبیدہ۔ میں اپنے ہاتھ کسی کے قتل سے ناپاک کرنا نہیں چاہتی، لیکن آپ
کو ضرور مطلع کر دوں گی۔ عدالت میں جا کر گواہی دونگی کہ آپ نے
سلیم کو قتل کر دیا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ معاملہ اتنا بڑھ چکا ہے، اس کا مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا ـــ
یہ بات ہے، خیر دیکھا جائے گا۔ جاؤ ابھی اطلاع دیدو پولیس کو
ذرا دیکھوں تو وہ تمہاری پولیس کون ہے جو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگائے

زبیدہ۔ دیکھ لیجئے گا۔ وہ وقت بھی شاید جلد آجائے گا۔

قاسم سیٹھ۔ (مصالحت آمیز لہجہ میں) نرسنگ ہوم میں جب تک میں بیمار پڑا رہا، دنیا میں تم سے زیادہ اپنا ہمدرد کسی کو نہ پایا اور اب؟ ـــ اور اب تم میرے خون کی پیاسی ہو؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں زبیدہ؟

زبیدہ۔ میرا ہمدردانہ سلوک ایک انسان کے ساتھ تھا۔ میرا یہ رویہ ایک دشمنِ انسانیت کے ساتھ ہے۔

قاسم سیٹھ۔ (اثر انگیز لہجہ میں) نہیں زبیدہ تم میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ دنیا کی عورتوں کو میں نے ٹھکرایا، پامال کیا، کہیں کا نہ رکھا، لیکن تم ہی ایک ایسی عورت ہو جس سے میں مرعوب ہوں جس کے سامنے میری زبان بند ہو جاتی ہے، جس کی خاطر میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں، الماس، رشیدہ، شکنتلا، اور نہ جانے دنیائے فلم کی کتنی حسین دمہ جبیں عورتیں ہیں جو میری نگاہِ التفات کی جویا رہتی ہیں، اور [illegible] نعمت کبھی پاتی ہیں کبھی نہیں پاتیں۔ پاتی ہیں تو فخر و ناز سے پھولی نہیں سما[illegible] نہیں پاتیں تو زندگی سے بیزار ہو جاتی ہیں، لیکن ـــ لیکن میں صرف تمہاری نگاہِ التفات کی آس میں زندہ ہوں۔ تم مایوس نہ کرو۔ ورنہ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں، دولت مند ہوں۔ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہوں، یہ حق مجھ سے نہ چھینو، مجھے زندہ رہنے دو۔ میری زندگی صرف تمہاری نگاہِ التفات پر منحصر ہے۔ مجھے مایوس کر دوگی تو میں زندگی سے اپنا تعلق منقطع کر دوں گا۔ اچھا زبیدہ اب میں جانا چاہتا ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گا۔

جی چاہتا ہے تم سے باتیں کردں ، تمہاری باتیں سنوں ، لیکن تم اس وقت غصہ میں ہو ۔ مسلسل میرے دل پر زخم لگا رہی ہو ، اب اسوقت تمہاری زبان سے میں کچھ سننا نہیں چاہتا ۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے ۔ میں چاہتا ہوں تم تنہائی میں سوچو ، غور کرو ، پھر اس کے بعد بتاؤ ، میرے لئے کیا حکم ہے ؟

کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں
زندہ رہوں یا مر جاؤں ؟

زبیدہ نے جواب نہیں دیا ۔ قاسم سیٹھ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے قدم رکھتے ہوئے واپس چلے گئے ، جیسے کوئی جواری آخری داؤ لگا کر جا رہا ہو

(۳۸)

بھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

سلیم کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات کو اپنی قیام گاہ پہ پہنچا۔ ہرمز جی اور مہتا دروازے پر انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ سلیم نے جلدی سے دروازہ کھولا، یہ لوگ اندر آئے، مسٹر مہتا نے کہا، سلیم صاحب ہم آپ کو مبارکباد دینے آئے ہیں۔ آپ کی کہانی بہت پسند کی گئی۔ آپ کے نغموں نے لوگوں کو بہت متاثر کیا، ہمارا خیال تھا، یہ فلم زیادہ سے زیادہ چھ لاکھ میں بکے گی۔ لیکن پندرہ لاکھ میں فروخت ہو گئے، اس کے حقوق، یہ بڑی کامیابی ہے۔ ہمیں اس کامیابی پر فخر ہے۔

ہرمز جی نے سوچا، ساری باتیں مہتا صاحب کیسے ڈال رہے ہیں وہ کہا میں بول پڑے۔ سلیم صاحب واقعی ہمیں فخر ہے، اس کامیابی پر نہیں، فلم پر نہیں، آپ پر فخر ہے۔ آپ بڑے بھاگوان ثابت ہوئے ہمارے لئے۔

ہماری کوئی فلم اتنے داموں پر نہیں گئی تھی۔ اب ہم آپ سے ایک عہد لینا چاہتے ہیں۔"

سلیم نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ "فرمایئے، کیسا عہد لینا چاہتے ہیں آپ؟"

ہرمز جی نے ایک اداکار کی طرح کہا، "ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دیجئے گا ہمارا پیمانِ وفا زندگی بھر کا ہونا چاہیے۔"

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن زندگی خود بڑی بے اعتبار چیز ہے۔ اسے کونسی پائیداری اور استواری حاصل ہے"

ہرمز جی لاجواب ہو گئے۔ بے بسی سے مسٹر مہتا کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے فرمایا۔ "یہ بات تو آپ نے بالکل ٹھیک کہی، سلیم صاحب، لیکن ہمارے اطمینان کے لئے یہ بہت ہے کہ ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھی اور رفیق رہیں گے"۔

سلیم نے جواب دیا۔ "مجھے اس عہد میں کیا تامّل ہو سکتا ہے؟ آپ نے جس خلوص کے ساتھ میری قدر افزائی کی ہے اس کا میں ممنون ہوں!"

ہرمز جی کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے بیساختہ جیب میں ہاتھ ڈالا چیک بک نکالی اور سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب نئی کہانی کی تیاریاں شروع کر دیجئے اور اس کا معاوضہ پیشگی لے لیجئے۔ چیک بک حاضر ہے دستخط میں کر دونگا۔ رقم آپ لکھ لیجئے۔"

سلیم نے چیک بک واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے؟ تعمیل

ار میں مجھے کوئی عذر نہیں، آج ہی سے نئی اسٹوری کا کام شروع کر دونگا۔
پے کا کیا ہے، جو چاہیے گا اور جب چاہیے گا دے دیجیے گا، نہ میں بھاگا جاتا
ں نہ آپ!"

ہرمز جی اس جواب سے خوش تو بہت ہو گئے۔ لیکن مطمئن نہیں ہوئے
وں نے کہا۔ "یہ آپ کی عنایت ہے لیکن کاروبار اور لین دین میں معاملہ کی
ائی بہتر ہوتی ہے۔ چیک آپ کو ابھی لینا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے چیک پر رقم لکھی، اور سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے
یہ ۲۵ ہزار کا چیک ہے، ۲۰ ہزار آپ کی نئی کہانی کے اور پانچ ہزار
ری طرف سے ایک حقیر نذرانہ سمجھ کر قبول فرما لیجیے۔"

مسز دھنا نے تائید کی، "سلیم صاحب لے لیجیے۔ ورنہ سیٹھ صاحب
صدمہ ہوگا۔"

سلیم نے چیک جیب میں رکھ لیا، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی
یں، پھر یہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد سلیم سونے کی تیاریاں
نے لگا، بستر ٹھیک کر کے بجلی بجھانا چاہتا تھا کہ دستک کی آواز آئی۔
اس وقت بہت تھکا ہوا تھا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، اس
وقت کی دستک سے طبیعت بھنا گئی۔ لیکن اخلاق کو کیسے ہاتھ سے جانے
یا دروازہ کھولا تو زبیدہ سامنے کھڑی تھی۔

زبیدہ کو دیکھ کر سلیم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے کانپتی ہوئی
از میں کہا۔ "آپ اس وقت؟ آیئے، تشریف لائیے!"

زبیدہ اندر آگئی۔

سلیم کا دل زور زور دھڑک رہا تھا، وہ حیران تھا کہ زبیدہ ا[یک] ہاں کیوں آئی؟ اس نے پتہ کیسے معلوم کیا؟ اور اتنے ناوقت آنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اور اتنی گھبرائی ہوئی اور پریشان کیوں نظر آرہی ہے؟ — لیکن ان میں سے ایک بات بھی پوچھنے کی ہمت نہ پڑی، گم سم بیٹھا رہا، کبھی اسے دیکھنے لگتا، کبھی آنکھیں نیچی کر لیتا۔

زبیدہ نے کہا۔ "کہیے سلیم صاحب، مزاج تو اچھا ہے؟"

وہ اپنے دل میں بہت جزبز ہوا، بڑا غصہ آیا اپنے اوپر، جو سوال خود اسے کرنا چاہیئے تھا، وہ زبیدہ کر رہی ہے لیکن جواب بہرحال دینا تھا۔ کہنے لگا۔ "خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

زبیدہ نے ایک دلفریب تبسم کے ساتھ کہا۔ "کوئی مرے یا جیے، آپ کو کیا؟"

یہ ایسی بات زبیدہ نے کہہ دی کہ سلیم بھرلا جواب ہوگیا۔ بھلا گفتگو کی گاڑی ایسے نپے تلے فقروں کے سامنے کیسے چل سکتی تھی۔ پھر اسے خاموش ہو جانا پڑا۔

زبیدہ نے کہا۔ "شاید میرے گھر کا راستہ بالکل ہی بھول چکے ہیں آپ؟"

سلیم کو موقعہ مل گیا، اس نے جواب دیا۔ یہ بات تو نہیں، میرا بس چلے تو ہر وقت وہیں موجود رہوں لیکن حالات ہی کچھ ایسے پیش آگئے۔ کہ

...ی مرضی کے خلاف چلا آنا پڑا۔"

زبیدہ بولی "میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی، شاید بحث میں ...پ سے جیت بھی نہیں سکتی، کہاں آپ جیسا ادیب وانشا پرداز، ناول نگار ...ر شاعر، کہاں مجھ جیسی جاہل عورت۔"

سلیم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "مس زبیدہ آپ مجھے جو چاہیں ...زا دے لیں۔ جتنا چاہیں ذلیل کرلیں۔ لیکن خدارا ایسی باتیں نہ کیجیے جو ...رے دل کو زخمی کر دیں!

زبیدہ مسکرائی، "بہت اچھا، آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی، آپ کو ...یار ہے کہ دوسروں کا دل زخمی کریں چرکے لگائیں، لیکن میں اپنے اس ...ق سے دستبردار ہوئی جاتی ہوں، آپ کی خاطر مجھے عزیز ہے!

سلیم کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "میرے لیے اس سے بڑھ کر ...ی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، آفتاب ...ے ذرہ کی کٹیا میں قدم رکھا۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آپ ...ں تشریف لا سکتی ہیں۔ آپ کو دیکھتا ہوں اور اپنے گھر پر نظر ...تا ہوں ع

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

زبیدہ پھر بیچ میں بول پڑی، "جب اشعار ہی میں بات کرنا ٹھہری ...الب کا ایک اور شعر بھی شاید اس وقت بہت موزوں اور باموقع ...ے گا۔ وہ بھی پڑھ دیجیے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا "

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی، سلیم ششدر اور حیران اس کی طر
دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ہمت کر کے اس نے کہا۔

" اگر آپ مجھے بلا بھیجتیں تو سر کے بل حاضر ہوتا۔ میں بڑی شر
محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے زحمت فرمائی —— یقیناً کوئی خاص با
ہو گی جو اتنے نا وقت آپ نے تکلیف فرمائی۔"

زبیدہ نے سنجیدہ اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ل
ہاں خاص ہی بات ہے۔ کچھ بہت ہی ضروری باتیں آپ سے کرنا ہی
آپ کو اپنے گھر بلانا مصلحت نہ تھا اور اس سے بہتر اور مناسب کو
وقت نہ تھا۔ لہٰذا خود چلی آئی۔ اب رسمی باتیں چھوڑ کر ہمیں کام کی باتیں
چاہییں، لیکن میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ پہلے ایک گلاس پانی پیوں گی۔
سلیم نے لپک کر گلاس اٹھایا اور گھڑے سے پانی انڈیلنے لگا۔

---

(۳۹)

رات کے سنّاٹے میں

پانی پینے کے بعد زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بڑے ملائم لہجہ میں کہا۔

"رات زیادہ آچکی ہے، اس موقع پر میرا اور آپ کا تنہا کمرے میں بیٹھنا ویسے بھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا، لہٰذا مختصر طور پر جو کچھ کہنا ہے وہ کہوں گی مگر پہلے مجھے ایک اطمینان دلائیے۔"

یہ کہہ کر زبیدہ سوالیہ نظروں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیم نے بڑی آمادگی اور مستعدی کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ مجھ سے کس طرح کا اطمینان چاہتی ہیں؟"

زبیدہ۔ یعنی یہ کہ آپ میری بات مان لیں گے؟

سلیم۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ شبہ ہے؟

زبیدہ۔ اچھا یہ بتایئے آپ غلط مطلب تو نہیں نکالیں گے میری باتوں کا

سلیم کیا ایسا ممکن ہے آپ کے نزدیک ؟

زبیدہ۔ (مسکراتے ہوئے) آپ تو آگے چلنے ہی نہیں دیتے مجھے ؟

سلیم۔ (سنجیدگی کے ساتھ) دیکھئے مس زبیدہ ! بات یہ ہے کہ دنیا میں صر
آپ ہی ایک ایسی ہستی ہیں جس کے ایک اشارہ پر میں جان دے
سکتا ہوں۔ جس کی خاطر میں کوہ کنی کر سکتا ہوں۔ جسے خوش رکھنے کے
لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر سکتا ہوں، آپ پوچھ سکتی ہ
کیوں ؟ میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا، اس سوال کا جواب
دینا ضروری بھی نہیں ہے۔ کہیئے، پھر دیکھئے، میں آپ کے ارشاد کی
تعمیل بدل و جان کرتا ہوں یا نہیں ؟

سلیم کے یہ الفاظ زبیدہ سن رہی تھی اور اس پہ ایک عجیب طرح کی کیفیت
طاری تھی۔ کبھی کان کی لویں تک سرخ ہو جاتیں، کبھی چہرہ کا رنگ بدل
جاتا، کبھی افسردگی اور اضمحلال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ کبھی سرخوشی اور مسرت
کے آثار جھلکنے لگتے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔
اور کشمکش بھی ایسی جس سے عہدہ برآ ہونا کچھ مشکل ہی نظر آتا ہے، بہر حال اس
کیفیت پر اس نے غالب آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میں آپ کو سچا
آدمی سمجھتی ہوں"۔

یہ بول سن کر سلیم کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز

ں جواب دیا۔

"تو پھر فرمائیے، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ مجھے دکھ صرف اس بات کا
ہے کہ آپ کو یہاں تک تشریف لانا پڑا۔ کاش مجھے یاد فرما لیا ہوتا، میں
حاضر ہو جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی ضروری کام ہے جس
کے لئے آپ آئی ہیں اور کسی کام کے سلسلہ میں آپ کا مجھ تک آنا میرے
لئے تکلیف دہ ہے۔ بہرحال آپ آگئی ہیں تو کہئے۔

زبیدہ۔ مان لینے کا وعدہ کرتے ہیں نا آپ؟

سلیم۔ جی ہاں پختہ اور اٹل وعدہ۔

زبیدہ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بمبئی سے کچھ عرصہ کے لئے باہر چلے جائیں۔

سلیم۔ کچھ عرصہ کے لئے کیا۔ ہمیشہ کے لئے جا سکتا ہوں ——— کہاں بھیجنا
چاہتی ہیں آپ؟

زبیدہ۔ میں تو کہیں بھیجنا نہیں چاہتی، صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ بمبئی
سے چلے جائیں۔

سلیم۔ آپ یہ چاہتی ہیں کہ کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے چلا جاؤں، یا یہ مرضی
ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہ شہر چھوڑ دوں۔

زبیدہ۔ جو سمجھ لیجئے۔

سلیم۔ نہیں اس کی وضاحت ہونی چاہیئے۔ میں آپ کی مرضی پاکر
عارضی اور مستقل ہر طرح سے جانے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ تو بتا دیجئے
کہ آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟

زبیدہ۔ بالکل نہیں۔

سلیم۔ نفرت تو نہیں کرتیں ؟

زبیدہ۔ استغفراللہ ـــــ آپ جیسے آدمی سے نفرت بھی کی جاسکتی ہے ؟

سلیم۔ مجھے اس شہر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے یہاں کے مناظر، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کے لوگ کسی سے بھی کوئی خاص تعلق نہیں ہے پھر بھی جی چاہتا ہے اس شہر سے کبھی باہر نہ نکلوں، نکلوں تو مرکر۔

زبیدہ۔ آپ تو بہت جذباتی رنگ کی باتیں کرنے لگے۔

سلیم۔ جذباتی ہونا کوئی برائی تو نہیں ہے مس زبیدہ۔

زبیدہ۔ لیکن کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔

سلیم۔ میری جگہ اگر آپ ہوتیں تو شاید آپ بھی جذباتی ثابت ہوتیں بلکہ ہے مجھ سے کچھ زیادہ۔

زبیدہ۔ یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟

سلیم۔ اس لئے کہ آپ شریف آدمی ہیں۔ شرافت کا تقاضا اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

زبیدہ۔ کیا خوب!

سلیم۔ غور تو کیجئے، اس شہر سے میری جذباتی وابستگی کس درجہ کی ہے!

زبیدہ۔ میں نے تو اس پر اب تک نہیں سوچا ـــــ بتائیے ؟

سلیم۔ میں اس شہر میں غریب الوطن کی حیثیت سے وارد ہوا۔ دل حوصلوں سے معمور، جیب خالی۔ نہ کہیں آشیانہ، نہ کہیں نشیمن، نہ کوئی

دوست نہ کوئی ہوا خواہ، جہاں گیا، دھتکارا گیا جہاں پہنچا واپس کیا گیا۔ جس سے عرض و التجا کی اس نے صاف جواب دیا۔ جو ذرا سی پونجی تھی ختم ہوگئی۔ فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ بھوک سے نڈھال آپ کے در دولت پر پہنچا۔ آپ نے مجھے پناہ دی، میرے رہنے کا بندوبست کیا میرے روزگار کا انتظام کیا، میرے ساتھ شریفانہ اور مساویانہ برتاؤ روا رکھا۔ ان سب باتوں سے متاثر ہوکر میرا وہ دل جو کہیں نہیں جھکا تھا خود بخود سجدہ ریز ہوگیا۔ آپ کے سامنے آپ کو ایک بات یاد دلاؤں؟

زبیدہ۔ کون سی بات؟

سلیم۔ آپ کو یاد ہے۔ قاسم سیٹھ سے جو پہلی رقم مجھے ملی تھی، اس کا میں نے کیا کیا تھا؟

زبیدہ۔ ہاں ساری لائے تھے،

سلیم۔ اس ساری کا میں نے کیا کیا تھا؟

زبیدہ۔ وہ آپ نے تحفہ کے طور پر زبردستی مجھے دیدی تھی۔

سلیم۔ آپ لینا نہیں چاہتی تھیں لیکن میرا مغموم چہرہ دیکھ کر آپ کو ترس آگیا اور بادل ناخواستہ آپ نے اسے قبول کر لیا۔

زبیدہ۔ ہاں ایک حد تک یہ درست ہی ہے۔

سلیم۔ آپ جانتی ہیں اس واقعہ سے متاثر ہوکر میں نے کیا کیا تھا؟ کس واقعہ سے متاثر ہوکر؟

سلیم۔ یہ کہ آپ نے میرا ناچیز تحفہ قبول فرما لیا۔
زبیدہ۔ میں نہیں جانتی
سلیم۔ دوبارہ جو رقم مجھے دفتر سے ملی وہ میں نے خیرات کر دی۔ پوری کی پوری۔
زبیدہ۔ (آنکھیں نکال کر) پورے چھ سو روپے
سلیم۔ جی ہاں پورے چھ سو روپے،
زبیدہ۔ یہ آخر کیوں؟
سلیم۔ میں خوش تھا، میں خوش تھا کہ آپ نے میرا ناچیز تحفہ قبول کر لیا میں اپنے خدا کا شکر گذار تھا کہ اس نے آپ کے دل میں اتنی نرمی پیدا کر دی کہ اپنی مرضی کے خلاف آپ نے میری بات مان لی میں نے وہی کیا جو ایک شکر گذار بندے کو کرنا چاہیئے تھا۔
زبیدہ۔ بڑے عجیب آدمی ہیں آپ؟ حد کر دی آپ نے۔
سلیم۔ جو مسرت مجھے اس طرح حاصل ہوتی اس کی قیمت چھ سو کیا، چھ کروڑ بھی نہیں ہو سکتی۔
زبیدہ۔ (بے انتہا متاثر ہوتے ہوئے، ایک ٹھنڈی سانس لے کر) اچھا پھر؟
سلیم۔ پھر حالات ایسے پیش آئے کہ وہ گھر مجھ سے چھٹ گیا جو آپ کا مسکن تھا۔
زبیدہ۔ وہ گھر خود چھٹ گیا، یا آپ نے چھوڑ دیا اسے؟

سلیم۔ دونوں ہی باتیں ہوئیں۔

زبیدہ۔ دیکھئے اپنے سچے ہونے کو مشکوک نہ بنایئے۔ آپ ہی نے چھوڑا میرے منع کرنے کے باوجود چھوڑا۔ اس کی ذمہ داری صرف آپ پر ہے، مجھ پر ذرا بھی نہیں، جو سچی بات ہے وہ کہیے، جمائیاں آرہی ہیں، آپ چائے کا انتظام بھی تو نہیں رکھتے۔

سلیم نے جواب دیا

یہاں ایک ہوٹل رات بھر کھلا رہتا ہے، ابھی لایا!

---

(۴۰)

دباؤ

تھوڑی دیر میں سلیم چائے لے کر آگیا، وہ بہت خوش تھا کہ زبیدہ نے اس سے ایک فرمائش کی۔ وہ بہت خوش تھا کہ یہ فرمائش اس نے پوری کر دی۔

سلیم کی نیند تو زبیدہ کو دیکھتے ہی کافور ہو چکی تھی۔ لیکن زبیدہ کی آنکھیں نیند کے مارے بوجھل ہو رہی تھیں۔ چائے کی گرم گرم پیالی نے نیند کو بہت دور بھگا دیا تھا۔ اب سلیم کی باتوں سے اسے لطف آنے لگا۔ آخری گھونٹ پی کر اس نے کہا۔

"ہاں سلیم صاحب، تو میرے ہاں سے آپ خود اپنی مرضی، بلکہ خود رائی سے چلے آتے۔ اس کا مجھے صدمہ بھی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ رقیہ اور اسلم کو پڑھانے چند روز تک آئے امبرا جی آپ سے بات کرنے کو

ی نہ چاہا۔"

سلیم بول پڑا۔

اور اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ مجھ سے بہت خفا ہیں، آنے

ی میری ہمت نہیں پڑی۔

یدہ۔ وہی خود رائی، خود ہی ایک بات کرتے ہیں، خود ہی ایک رائے قائم

کرتے ہیں اور خود ہی اس کے مطابق عمل درآمد شروع کر دیتے ہیں۔

لیم۔ کیا میں غلط سمجھا تھا؟

یدہ۔ بالکل غلط۔

لیم خیر کچھ بھی ہو، اسے میری حماقت سمجھیے، حالات ایسے پیش آئے

کہ مجھ سے آپ کا گھر چھوٹ گیا ——— لیکن امید کا دامن نہیں

چھوٹا۔ میرے لیے یہ بہت تھا کہ میں اس شہر میں رہتا ہوں جو آپ

کا نشیمن۔ آپ کے گھر پر نہ آسکوں گا، آپ سے مل نہ سکوں گا۔ کبھی

کبھی آپ کو دیکھ لیا کروں گا، اسی طرح میرے حرماں نصیب دل کو

کچھ سکون مل جایا کریگا، لیکن آپ چاہتی ہیں کہ میں یہ شہر بھی چھوڑ دوں،

آپ مجھے یہ حکم کیوں نہیں دیتیں کہ زہر کھا لوں؟ پہلے حکم کے

مقابلہ میں اس حکم کی تعمیل میرے لیے بہت آسان ہوگی۔

یہ کہتے کہتے سلیم کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے

لے، زبیدہ اس کی کیفیت سے بہت متاثر ہوئی اور اگر بے حد ضبط

سے کام نہ لیتی تو شاید اس کی آنکھیں بھی چھلک جانے لگتیں۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر زبیدہ نے کہا۔

"کیا آپ جانتے ہیں، آپ کا یہاں سے چلا جانا میرے لئے باعثِ مسرت ہوگا ——— شاید آپ بھول گئے، ایک دن ماتھران میں، میں نے آپ کے سامنے اپنی مظلوم ہستی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

سلیم نے جواب دیا "جی ہاں، بہت اچھی طرح یاد ہے"۔

زبیدہ بولی، پھر بھی آپ اس طرح سوچتے ہیں، خود ہی غور کیجئے اس دنیا میں میرا کون ہے، کون ہے جسے سچائی اور خلوص کے ساتھ میں اپنا کہہ سکوں؟ اسلم اور رقیہ —— یہ دونوں ابھی بچے ہیں، سکینہ بوا از کار رفتہ، دوسرے لوگ خودغرض، آپ میں خودغرضی تو نہ تھی، ہوس کاری تو نہ تھی شیطنت اور درندگی تو نہ تھی، میں آپ کو عزیز رکھنے پر، اپنے سے قریب رکھنے پر مجبور تھی۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اور یہ بھی مجبوری ہے کہ آپ سے شہر چھوڑنے کو کہہ رہی ہوں۔

سلیم۔ مجبوری؟ ——— آپ کسی کے دباؤ سے مجبور ہو کر یہ حکم دے رہی ہیں؟

زبیدہ۔ جی ہاں، حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر آپ کو یہ مشورہ دینے آئی ہوں۔

سلیم۔ لیکن میں نے تو حالات کا دباؤ کبھی قبول نہیں کیا۔

زبیدہ۔ کر لینا چاہیئے۔

یدہ۔ کر لینا چاہیے۔

یم۔ ذرا صاف صاف کہیے، ——— دیکھئے، اگر آپ مجھے اپنی مرضی سے حکم دیں گی تو بمبئی کیا، دنیا چھوڑ دونگا۔ اگر دباؤ سے مجبور ہو کر مجھے ایسا مشورہ دیں گی تو میں اسے قبول نہیں کرونگا۔ بتایئے بات کیا ہے؟

یدہ۔ آپ کے مفاد کا تقاضا یہی ہے۔

یم۔ میرا مفاد تو یہ ہے کہ میں مر جاؤں، مگر اس دہلیز سے قدم باہر نہ نکالوں۔

یدہ۔ وہی جذباتی باتیں۔

یم۔ لیکن اسے کیا کیجئے گا کہ میری زندگی ہی جذبات سے عبارت ہے میں ہنستا ہوں تو جذبات سے متاثر ہو کر۔ روتا ہوں تو جذبات سے مجبور ہو کر، میرا اوڑھنا بچھونا، اٹھنا بیٹھنا، ہر کام جذبات کے اشارہ سے ہوتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے آپ کو جذبات کی گرفت سے آزاد کراؤں ؟ ——— بہر حال آپ یہ مشورہ مجھے کیوں دے رہی ہیں بتانا پڑے گا۔

یدہ۔ اس لئے کہ کچھ لوگ آپ کی جان کے گاہک ہیں۔ وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ آپ کو زندہ نہ رہنے دیں گے۔

یم۔ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں، وہ بزدل ہیں۔

یدہ۔ (حیرت سے سلیم کو دیکھتے ہوئے) اچھا بھلا وہ کون لوگ ہیں؟

سلیم۔ یہی قاسم سیٹھ اور ان کے چیلے چانٹے۔

زبیدہ۔ کیسے جانا آپ نے؟

سلیم۔ عقل سے۔

زبیدہ۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ عقل سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ بس میں تو یہی چاہتی تھی کہ ضد کے بجائے عقل سے کام لیجئے۔

سلیم۔ یعنی قاسم سیٹھ سے ڈر جاؤں؟ ـــــ مس زبیدہ میں بہت معمولی آدمی ہوں، لیکن بزدل نہیں، ہاں قاسم سیٹھ اگر میری جان لینا چاہتے ہیں تو شوق سے جو چاہیں کریں، لیکن انہیں اطمینان دلا دیجئے، ان کے پسٹول کی کوئی گولی میری پیٹھ پر نہیں سینے پر لگے گی۔

زبیدہ۔ افوہ ـــــ تو آخر ضرورت کیا ہے اس قدر بہادر بننے کی۔

سلیم۔ زندہ رہنے کا حق صرف اسے ملتا ہے جو بہادر ہو، بزدلوں کو موت سے پہلے کئی بار مرنا پڑتا ہے۔

زبیدہ۔ آپ تنہا ہیں۔ بے یار و مددگار ہیں، نہ کوئی دوست ہے نہ ساتھی اور سب سے بڑی آپ کی کمزوری یہ ہے کہ شریف بھی ہیں ـــــ لیکن وہ غنڈے ہیں، بدمعاش ہیں، بدمعاشوں اور غنڈوں کے دوست ہیں، پولیس سے ان کا یارانہ ہے، افسرانِ حکومت سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ دولت کے مالک ہیں اور اس دولت سے انصاف بھی خرید سکتے ہیں۔ بھلا ایسے لوگوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں آپ؟

سلیم۔ ایسے ہی لوگوں سے تو مقابلہ کرنے میں لطف آتا ہے۔

زبیدہ۔ لیکن مجھے آپ کی جان عزیز ہے۔ میری یہ تمنا ہے آپ زندہ رہیں۔ ضد کر کے میری تمنا کا گلا نہ گھونٹئے، سلیم صاحب!

پھر زبیدہ نے وہ سارا ماجرا حرف بحرف سنا دیا جو دادر موودی ٹاؤن میں گذرا تھا۔ جو بھارت فلمز کے دفتر میں پیش آیا تھا۔ وہ باتیں بھی دُہرا دیں جو اس سے اور "قاسم سیٹھ" سے دفتر میں ہوئی تھیں۔ پھر اس نے التجا آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"بتائیے اب کیا فیصلہ ہے آپ کا؟ —— میری التجائیں ٹھکرا دیں گے یا رد کر دیں گے اسے؟

سلیم خاموش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "اچھا ذرا مجھے غور کر لینے دیجئے۔ اس گفتگو کی روشنی میں تو میں آپ کیلئے بھی خطرہ دیکھ رہا ہوں —— مس زبیدہ مجھے تھوڑی سی مہلت دیجئے —— صرف چند روز کی، میں بہت جلد اپنا فیصلہ آپ کے گوش گذار کر دونگا۔"

زبیدہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھی بات، آج بدھ ہے، اگلے منگل کے دن میں پھر کسی وقت آؤں گی!"

اور سلیم کا جواب سنے بغیر وہ واپس چلی گئی۔

(۴۱)

ذہنی کشمکش

زبیدہ چلی گئی۔

زبیدہ چلی گئی، لیکن اپنے ساتھ سلیم کے ہوش و حواس کی پونجی بھی لیتی چلی گئی۔ جب وہ زبیدہ کے دروازے پر پہلے پہل پہنچا تھا تو اس کی جیب خالی تھی۔ لیکن وہ اپنا مالک تھا، اپنے ارادہ اور خیال کا مالک تھا۔ اور جب زبیدہ کا دروازہ اس کے لئے بند تھا اس کی جیب نوٹوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن وہ اپنا مالک نہ تھا، اپنے عزم و حوصلے پر اسے قدرت نہ تھی، نہ ارادہ اس کا تھا نہ خیال، وہ ایک بے بس انسان تھا جس کی ہر چیز لوٹی جا چکی تھی۔ جسے اپنے اوپر ذرا بھی اختیار نہ تھا۔ قاسم سیٹھ کے سامنے وہ پستول تان کے کھڑا ہو گیا لیکن زبیدہ کے ایک اشارہ پر اس نے بھرا ہوا پستول اس کے حوالے کر دیا۔ ہرمزجی، مہتا، رعنا، نجمہ یہ سب کیڑے مکوڑے تھے جو اس کے ارادہ اور فیصلہ کو بدلنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اس نے شرط لگائی تھی اسٹوڈیو میں

قدم نہیں رکھ سکتا، ہر مرزجی اور رعنا نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس نے کہا۔ میں کسی فلم کمپنی میں ملازمت نہیں کروں گا، رعنا نے پیچ و تاب کھایا، لیکن کچھ نہ کہہ سکی، اس کی حیثیت اور بساط اس کے سوا کیا تھی کہ مسخری تھی، لیکن کیا زبیدہ کی بات بھی ٹالی جا سکتی ہے؟ کیا اس کے فرمان سے بھی سرتابی کی جا سکتی ہے؟

"واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ وہ جو کہے گی کیا جائے گا!"

سلیم بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا، نیند کا کہیں دور و نزدیک پتہ نہیں تھا۔ بار بار اس کے دل میں ایک ہی خیال آ رہا تھا۔

زبیدہ مجھے بمبئی سے باہر بھیجنا چاہتی ہے، جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس حکم کی تعمیل کر دوں یا نہ کروں؟ زبیدہ کا ہر بول میرے لئے حکم ہے جس کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں، لیکن کیا جلاوطنی بھی؟

اگر زبیدہ نے بمبئی چھوڑنے کا مشورہ بطور خود دیا ہوتا، تو ایک لمحہ تامل کئے بغیر مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ قاسم سیٹھ کے دباؤ سے اس دھمکی سے مرعوب و متاثر ہو کر مجھے بھیج رہی ہے۔ کیا میں ڈر جاؤں۔ کیا قاسم سیٹھ کی غنڈہ گردی کے سامنے سر جھکا دوں؟

میں زبیدہ کی تعمیل حکم کرتے ہوئے بمبئی چھوڑ دوں، اور قاسم سیٹھ اپنی بے نشان مونچھوں پر تاؤ دے کر غرائے کہ میں نے سلیم کو بمبئی سے بھگا دیا ——— کیا یہ ننگ میں گوارا کر سکتا ہوں؟ کیا یہ بزدلی کی انتہا نہ ہوگی؟

لیکن اگر اپنی آن پر اڑا رہوں تو زبیدہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ اپنے

جی میں کیا کہے گی، ایک طرف یہ دعوے کہ اس کے اشارۂ چشم پہ اپنی جان تک قرباں کر سکتا ہوں، دوسری طرف یہ کیفیت کہ اس کی التجا اور درخواست کو بھی ٹھکرا دوں؟ دونوں باتوں میں سے ایک یقیناً غلط ہے، میں اس کے لئے کوئی قربانی نہیں کر سکتا، میں جھوٹا ہوں، فریب کار ہوں، خود فریب ہوں۔ میں اب تک اپنے دل کو بھی دھوکا دیتا رہا ہوں۔ زبیدہ کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔

اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر آن اور شان کا کیا سوال؟

زبیدہ کے فرمان کی تعمیل ہونی چاہیئے۔ خواہ دنیا والے مجھے حقیر اور ذلیل سمجھتے رہیں۔ زبیدہ کی نظر میں میری عزت قائم رہے۔ ساری دنیا اگر مجھے ذلیل سمجھتی ہے تو سمجھا کرے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں، میں دنیا کے لئے نہیں زبیدہ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں، زندگی کے معنی نہیں۔ اگر زبیدہ کے دل میں میری جگہ نہ ہو، اگر زبیدہ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ ہو پھر؟

پھر کیا ——— زبیدہ کے حکم کی تعمیل ہوگی، میں بمبئی چھوڑ دوں گا ——— بہت جلد، پہلی فرصت میں، بس اسی ہفتہ کے اندر!

(۴۲)
طلاق کا مطالبہ

نجمہ اب پونہ سے بمبئی مستقل طور پر آگئی تھی۔ رعنا نے اپنا وعدہ پورا یا۔ اسے اور اس کے شوہر تنویر کو دادر مودی ٹون میں معقول تنخواہ پر ازمت دلادی۔ دونوں میاں بیوی اطمینان و مسرت کی زندگی بسر کر رہے ے۔ بالی ہل پر ایک چھوٹا سا بنگلہ نجمہ نے بھی کرائے پر لے لیا تھا۔ اس قرب ے باعث کبھی رعنا اس کے ہاں چلی جاتی اور گھنٹوں بیٹھ کر واپس آتی۔ کبھی مہ (تنہا بھی اور تنویر کے ساتھ بھی) آجاتی۔ اور جب تک جی چاہتا کوئل کی رح کوکتی، اور بلبل کی طرح چہکتی رہتی۔ اس پر کوئی پابندی تو تھی ہیں، نہ کسی پابندی کو قبول کر سکتی تھی۔ رعنا ہو یا نہ ہو۔ مصروف ہو یا یکار۔ مجلس جمی ہو یا تنہائی، سیٹھوں اور ساہوکاروں سے کاروباری فتگو ہو رہی ہو یا ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے تبادلۂ خیال ہو رہا ہو۔ نجمہ اگر پہنچ

جائے تو ہر بات میں دخل دینا اور اسے دخل درمعقولات کی حد تک پہنچا دینا، اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے، اس پر نکتہ چینی کر سکے، اس کی کسی بات کی تردید کر سکے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ اسے ٹوکتا اور اپنی گت بنواتا؟

اس وقت بھی وہ رعنا کے گھر پہ بن بلائے مہمان کی حیثیت سے موجود تھی۔ آتے ہی اس نے گھر کے مالک کی طرح خانساماں کو طلب کیا اور حاکمانہ لب و لہجہ میں کہا۔

ناشتہ لاؤ۔

۱۲ بجے دوپہر کو ناشتہ کا لفظ سن کر خانساماں چونک پڑا، اس نے بے بسی کے ساتھ رعنا کی طرف دیکھا، رعنا نے نجمہ سے کہا۔

"ایسی ہی بھوکی ہو تو ذرا دیر اور صبر کرو، کھانا تیار ہوا جاتا ہے ابھی تھوڑی دیر میں"۔

نجمہ نے رعنا کی بات اس طرح سنی ان سنی کر دی۔ جیسے کوئی بڑا آدمی کسی نہایت حقیر آدمی کی بات پر توجہ نہیں کرتا اور خانساماں سے فرمایا۔

"تعمیل ہو"۔

رعنا مسکرانے لگی۔ خانساماں تعمیل حکم کے لئے چلا گیا۔

رعنا نے کہا۔

"کیوں نجمہ، کبھی ٹھکانے کی بات بھی کرو گی؟ نوکر تک ہنس پڑتے

ہیں تمہاری باتوں پر۔ یہ کوئی ناشتہ کا وقت ہے؟"

نجمہ نے تڑسے جواب دیا۔

"نہ ہوگا تمہارے لئے، ہمیں تو جب خیال آجائے، وہی ناشتہ کا وقت ہے!

رعنا۔ ضرور تنویر سے لڑائی ہوئی ہے،

نجمہ۔ ہاں ہوئی تو ہے پھر؟

رعنا۔ اور رات بھر بھوکی رہی ہو، کیوں؟

نجمہ یہ بھی ٹھیک ہے۔

رعنا۔ اچھا، ہم ابھی فون کر کے بلاتے ہیں تنویر کو، صلح کرا دیں گے۔ تم دونوں کی۔

نجمہ۔ (ہاتھ جوڑ کر) بہن، میری پیاری بہن، ایک بات مان لو میری۔

رعنا۔ (آمادگی کے ساتھ) جو کہو —— کیا بات ہے؟

نجمہ۔ (با چشم پرنم) مجھے طلاق دلوا دو تنویر سے،

رعنا۔ (متحیر ہو کر) تمہیں تنویر سے طلاق دلوا دوں؟ —— یہ کیا کہہ رہی ہو تم، کچھ دماغ چل گیا ہے؟

نجمہ۔ پوری بات تو سنی نہیں تم نے بیچ میں بول پڑیں، نہ ماننا لیکن سن تو لو۔

رعنا۔ تو مجھے کب انکار ہے تمہاری بات سننے اور ماننے سے — لیکن۔

نجمہ۔ لیکن ویکن سب بیکار ہے اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔

میرا تنویر کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا، مجھے اس ظالم سے چھٹکارا دلاؤ، ہاں مجھ پر احسان کرو۔ مجھے طلاق دلانے کے بعد خود اس سے شادی کر لو۔

اب تک رعنا بڑی توجہ اور ہمدردی کے ساتھ نجمہ کی باتیں سن رہی تھی، آخری جملہ پر قہقہہ لگایا اور اس کی چوٹی پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا،

اس طرح کی اداکاری کا جوہر دیکھ کر لوگ زبیدہ کو بھول جائیں گے اور رعنا کو بھی، غضب خدا کا، کیسا سوکھا منہ بنا کر اور آنکھوں میں جھوٹے آنسو بھر کر اپنی داستان سنائی ہے کہ میں بھی دھوکے میں آگئی، حالانکہ تیری رگ رگ اور نس نس سے واقف ہوں!

اتنے میں خانساماں ناشتہ لیکر حاضر ہوا، نجمہ نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا۔

"اُلٹے پاؤں واپس جاؤ، ہم ناشتہ نہیں کریں گے۔ کھانا کھائیں گے۔"

بیچارہ خانساماں اس شریر کی شرارتوں سے اکثر بہرہ اندوز ہوا کرتا تھا دل ہی دل میں بڑبڑاتا اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا، نجمہ نے پرس کھولی اور ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا، رعنا نے پوچھا "یہ کیا ہے"؟ نجمہ بولی۔

"بھئی میری وجہ سے تمہارا نقصان ہوا، بے چارہ خانساماں ناشتہ بنا کر لایا اور میں نے اسے استعمال بھی نہیں کیا۔ ہو تھڑدلی اور کم ظرف، بہت بھنّا رہی ہوگی دل ہی دل میں تو لے لو یہ روپیہ!"

رعنا نے کہا، "اگر واقعی ایسی ہی عالی ظرف ہو تو دس روپے تو دو کم از
س سے کیا ہوگا۔

نجمہ نے بڑی حاکمانہ شان سے پرس میں ہاتھ ڈالا۔ اور سو روپے کا
نوٹ رعنا کی طرف بڑھاتے ہوئے۔ "دس کیا سو لو۔" رعنا نے
لے لیا، گھنٹی بجائی، ملازم حاضر ہوا، اس سے کہا۔ "جاؤ خانساماں
دو، ذرا دیر میں خانساماں حاضر ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرہ بشرہ سے
ہو رہا تھا کہ نجمہ کی کسی متوقع شرارت پر جز بز ہے۔ رعنا نے سو روپیہ
اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ رعنا
ہا۔ "یہ انعام ہے، نجمہ نے دیا ہے، جاؤ، خوش خوش چلے جاؤ!"—
ماں کی باچھیں کھل گئیں، نجمہ کی شرارت سے جتنی کوفت ہوئی تھی سب
ہو گئی۔ ممنون نظروں سے اسے دیکھتا، سلام کرتا چلتا بنا۔

رعنا کی اس شرارت پر نجمہ جھینپ سی گئی۔ رعنا نے ایک دلآویز
کے ساتھ اپنی صراحی دار گردن کو جنبش دی، اور نجمہ کو چھیڑتے ہوئے
"دیکھا، اسے کہتے ہیں سو سنار کی ایک لوہار کی!"

نجمہ مسکرانے لگی اور اپنی خفت مٹانے کے لئے گویا ہوئی۔ "جی ہاں
نقصان کر دیا میرا آپ نے۔ میں دیوالیہ ہو جاؤں گی اب!" رعنا نے
اب دیا۔ "ہو مت، سو روپے کے غم میں پھٹکار برسنے لگی ہے منہ پر،
زیادہ بڑھی تو رو دو گی۔ کہو تو روپے اپنے پاس سے واپس کر دوں
نے سائل کی طرح ہاتھ بڑھایا اور بھکارن کی طرح ایک ہی

سائنس میں سبق دہرانے لگی۔

"اللہ کرے لڑکا ہو ——— سہاگ قائم رہے ——— ناؤ
والی ہو، لاؤ دے دو۔"

رعنا اس اداکاری پر ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی!

(۴

یم کا فیصلہ

رہ میں، نجمہ اور رعنا کے مشترک قہقہے گونج رہے تھے کہ دربان نے
اع دی،

لیم صاحب آئے ہیں، ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔

سنتے ہی دونوں کے قہقہے نامکمل رہ گئے۔ دونوں کے چہروں پر
طاری ہوگئی، بن بلائے اور پھر وہ بھی اس وقت سلیم کا آجانا ایک
تھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی سوال پیدا ہوا۔

لیم کیوں آیا ہے؟ ضرور کوئی خاص بات ہے!" نجمہ نے تیوری
دربان سے کہا۔

کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے، جا بلا لا۔"

دربان فوراً ہی سلیم کو اس کمرے تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ رعنا اور

نجمہ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا، نجمہ نے کہا،
"سلیم صاحب، کہاں راستہ بھول پڑے آج آپ؟"
سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا، اگر غلطی سے آپ کے گھر آ گیا ہو
معافی چاہتا ہوں، ورنہ یہ سوال تو مس رعنا کو کرنا چاہیئے تھا۔"
نجمہ جھینپ گئی، رعنا نے اسے چڑایا۔ "کیوں چپ ہو گئیں
بولو کچھ۔"
نجمہ ہار جانے کے باوجود، ہار ماننے والوں میں نہ تھی۔ کہنے لگی
ذرا انتظار کرو۔ سلیم صاحب کو چلا جانے دو؟"
سلیم نے پوچھا "میرے چلے جانے کا انتظار کیوں ہے؟"
نجمہ نے جواب دیا۔ "شرمیلی لڑکی ہے، پتہ کی باتیں سن کر چھ
کی طرح لجا جاتی ہے۔
رعنا واقعی شرما گئی، نجمہ نے اسی کا فقرہ دہرایا۔ "کیوں بی ر
کیوں ہو گئیں۔ اب بولو کچھ۔
رعنا ہار چکی تھی، لیکن اس نے ہار مانی نہیں، کہنے لگی "بولوں
بولوں گی، ذرا انتظار کرو۔"
سلیم نے دریافت کیا "انتظار کس بات کا ہے؟ کہیئے جو کچھ کہنا
رعنا نے کہا۔ "نہیں۔ ذرا تنویر آ لیں۔ ان کے سامنے اس بد
چھوکری کے عقدے کھولوں گی۔"
سب ہنسنے لگے!

ہنسی کا طوفان جب تھما، تو رعنا نے کہا۔ "سلیم صاحب میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے غریب خانہ تک زحمت کی، مجھے ناز ہے اپنی خوش بختی پہ"!

اس خوش بختی پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں!

رعنا۔ شکریہ!

سلیم۔ مس رعنا! میں ایک خاص ضرورت سے حاضر ہوا ہوں۔

رعنا۔ تو تکلف کیوں کر رہے ہیں آپ؟ فرمایئے، میرے لئے اس سے بڑھ کر مسرت کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کا کوئی کام کر سکوں؟

سلیم۔ میں آپ کی سفارش چاہتا ہوں —— ایک خاص معاملہ میں۔

رعنا۔ مجھے بتایئے نہیں —— آپ حکم دیجئے میں تعمیل کر دوں گی!

جمہ۔ یوں کیوں نہیں کہتیں کہ سلیم صاحب کی اس فرمائش پہ "جان نذر دینی بھول گئیں اضطراب میں!

رعنا۔ ہاں یہی سہی —— فرمایئے سلیم صاحب کیا بات ہے؟

سلیم۔ یہ ۲۵ ہزار کا چیک ہے جو نئی اسٹوری کے لئے سیٹھ ہرمز جی نے مجھے عطا فرمایا تھا —— یہ انہیں واپس کر دیجئے!

رعنا۔ (تیوری چڑھا کر) کیوں واپس کر دوں؟

سلیم۔ اس لئے کہ میں کام نہیں کر سکوں گا؟

رعنا۔ یہ کیا بات ہوئی —— اگر آپ کی نظر میں رقم کم ہے تو ——

سلیم۔ نہیں رقم کم تو نہیں زیادہ ہی ہے،

رعنا۔ پھر کیوں واپس کر رہے ہیں آپ؟

سلیم۔ اس لئے کہ میں اب کام نہیں کرنا چاہتا۔

رعنا۔ یہی تو پوچھتی ہوں کیوں؟

نجمہ۔ میں سمجھ گئی۔ قاسم سیٹھ نے بھڑکایا ہوگا۔ سبز باغ دکھائے ہونگے، زبیدہ نے سفارش کی ہوگی، یہ بھولے بھالے سادہ لوح تو ہٹی ہیں، آگئے دام ہمرنگِ زمین میں!

سلیم۔ آپ ہمیشہ بدگمانی سے کام لیتی ہیں۔ خاص طور پر مس زبیدہ کے بارے میں یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔

نجمہ۔ اگر میں نے غلط کہا ہے تو اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔

سلیم۔ ہاں آپ نے غلط کہا ہے، اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے الفاظ واپس لے لئے۔

رعنا۔ خیر زبیدہ کا ذکر چھوڑیئے، یہ بتایئے ایسا عجیب دغریب فیصلہ کیوں کیا ہے آپ نے؟ ——— معاف کیجئے گا، بدگمانی تو مجھے بھی ہو رہی ہے کہ قاسم سیٹھ نے آپ کو ورغلایا ہے۔ آپ کی کامیاب تصویر دیکھ کر رال بھر آئی منہ میں، اپنی پچھلی ذلت فراموش کرکے آپ کی خوشامد میں لگ گئے، خوب جانتی ہوں، وہ بندۂ زر ہیں، لیکن آپ کو میں ایسا نہیں سمجھتی، آپ تو بہت با اصول، شریف، وضعدار اور پابندِ عہد انسان ہیں۔ ہر مزجی کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ آپ کا نام سن کر ہلیوں ان کا خون بڑھ جاتا ہے۔ جب آپ کی باتیں ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کسی عاشقِ صادق کے سامنے اس کے محبوب

کا ذکر ہو رہا ہے۔ ذرا سوچیئے تو سہی، یہ سن کر کہ آپ اب کام نہیں کرنا چاہتے، سیٹھ صاحب کو کتنا غم ہوگا؟ کتنا صدمہ پہنچے گا بے چارے کو، کیا آپ یہ گوارہ کریں گے؟

سلیم۔ نہیں —— اسی لئے تو آپ کو سفارشی بنانا چاہتا ہوں

رعنا۔ نہیں سلیم صاحب، ایسا نہ کیجئے، اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کیجئے

سلیم اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے،

رعنا۔ یعنی اب آپ داور مودی ٹون کو کوئی کہانی نہیں دیں گے؟

سلیم۔ داور مودی ٹون کیا، کسی کو بھی نہیں،

رعنا۔ تو کیا آپ بھارت فلمز میں نہیں جا رہے ہیں؟

سلیم۔ جی نہیں، قطعاً نہیں، میں قاسم سیٹھ سے نفرت کرتا ہوں، ان کی کمپنی کے احاطہ میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔

نجمہ۔ پھر آخر کیا ماجرا ہے؟ —— یہ تو ایسی کہانی ہے جس کا سر پاؤں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

رعنا۔ میری خود عقل حیران ہے۔

سلیم۔ بات یہ ہے کہ میں بمبئی چھوڑ رہا ہوں۔ جا رہا ہوں یہاں سے —— شاید ہمیشہ کے لئے۔

رعنا۔ آپ بمبئی سے جا رہے ہیں؟

سلیم۔ جی ہاں مس رعنا،

رعنا۔ لیکن آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہوگی، کوئی سبب تو ہوگا؟

سلیم۔ جی ہاں، بغیر سبب کے تو کوئی بات بھی نہیں ہوتی اس دنیا میں۔

رعنا۔ تو کیا ہے وہ سبب بتایئے؟

سلیم۔ میں اپنے ذاتی معاملات پر بحث نہیں کرنا چاہتا، بس یوں سمجھ لیجئے کچھ ذاتی مجبوریاں ہیں۔

رعنا۔ اچھا یہاں سے چلے جائیں گے آپ، مان لیا ــــــ لیکن کہاں جائیں گے؟

سلیم۔ یہ تو ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔

رعنا۔ یعنی آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہاں جائیں گے؟

سلیم۔ فی الحال تو واقعی یہی صورت ہے۔

رعنا۔ بہت خوب ــــــ اچھا اب آپ کا شغل کیا ہوگا؟

سلیم۔ اس سلسلہ میں بھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر سکا۔ کیا کروں گا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں؟

رعنا۔ آخر اتنے بد دل اور مایوس کیوں ہو رہے ہیں آپ؟

سلیم۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بات صرف یہ ہے کہ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں، اپنی قابلیت جانتا ہوں، اپنی اہلیت جانتا ہوں ــــــ میں اگر کچھ کر سکتا تھا تو بس اسی فلمی لائن میں اور اسے چھوڑنے پر مجبور ہوں ــــــ لیکن میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں۔

رعنا۔ (بے انتہا مضطرب اور پریشان ہو کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آپ کو بمبئی چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہو۔

اور میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ آپ کسی دباؤ میں آسکتے ہیں۔

بہر حال واقعہ یہی ہے۔

تو آپ خود ہی ہرمز جی سے کیوں نہیں مل لیتے؟

وہ میری مجبوری نہ سمجھ سکیں گے، مجھے خود غرض خیال کریں گے۔ مجھے ان سے ملتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔

شرم تو عورتوں کو آتی ہے۔

جی نہیں، شرم کا تعلق عورت مرد دونوں سے ہے۔

بھئی نجمہ تم نہ بولو بیچ میں —— سلیم صاحب آپ نے تو عجیب مخمصہ میں ڈال دیا ہے مجھے۔

واقعی مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔

یہ نہ کہیئے، آپ کے لئے میں ہر ایثار کر سکتی ہوں، لیکن سلیم صاحب یہ بہت برا ہوا۔

مجھے بھی اس کا احساس ہے۔

کیا کہیں گے ہرمز جی بے چارے اور مسٹر مہتا اپنے جی میں؟ کتنے خوش ہیں یہ دونوں؟ کس ذوق و شوق سے تیاریاں کر رہے ہیں آپ کی نئی کہانی کو فلمانے کی، پانی کی طرح اس کی پیشگی پبلسٹی پر روپیہ صرف کر رہے ہیں لیکن جب آپ کا پیام لے کر جاؤں گی تو کیا گذرے گی ان کے دل پر؟

خود تمہارے دل پر کیا گذرے گی یہ بھی تو بتا دو؟

رعنا۔ (بگڑتے ہوئے تیور سے) نجمہ یا تو چپ بیٹھو۔ ورنہ چلی جا
یہاں سے۔

نجمہ۔ (سنجیدگی سے) جاؤں گی تو نہیں چپ ہوئی جاتی ہوں۔ تم
اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھو!

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی، سلیم، رعنا اور نجمہ سب
خاموش اور گم صم بیٹھے تھے، سب کے چہروں پر ایک خامو
کا تاثر طاری تھا۔ حد یہ ہے کہ نجمہ تک فکر و تشویش کے سم
میں غرق نظر آ رہی تھی۔

بڑی دیر اسی طرح گذر گئی، پھر رعنا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا
"آپ اپنے شاندار مستقبل پر لات مار رہے ہیں، سلیم صاحب
شہرت، جو وقعت جو مقام لوگ برسوں ٹھوکریں کھانے کے بعد حاص
کرتے ہیں، وہ آپ نے چند ماہ میں حاصل کر لیا۔ جس درجہ تک پہنچنے
لیے لوگ عمریں صرف کر دیتے ہیں وہ آپ نے ایک کہانی لکھ کر حاص
کر لیا۔ فلمی اخبارات میں آپ پر اور آپ کے فن پر شاندار مضامین
ہو رہے ہیں۔ فلم انڈسٹری آپ سے شاندار توقعات وابستہ کئے
ہے۔ مستقبل کا ہندوستان آپ کی فن کاری کو خراج تحسین ادا کر رہا
لیکن آپ؟ —— آپ ان نعمتوں کو ٹھکرا رہے ہیں،

نجمہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہاں بھئی دماغ خراب ہوتے
دیر نہیں لگتی۔ خدا دشمن کو بھی اس مرض سے محفوظ رکھے!"

کوئی اور وقت ہوتا تو نجمہ کے اس فقرے پر کمرہ قہقہوں سے ج جاتا۔ لیکن اس وقت کسی نے بھی نوٹس نہ لیا اس بلیغ فقرے پر، پھر معلوم ہوا جیسے کمرہ معطر ہو گیا، سب نے ایک ساتھ نظر اٹھائی۔

زبیدہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

---

(۴۴)

سسکیاں ہچکیاں

زبیدہ کو دیکھ کر سب پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے نجمہ سے مخاطب ہوئی۔ "خدا کا شکر ہے درشن تو ہوئے تمہارے۔"

نجمہ نے جواب دیا۔ "شکر تو ہمیں کرنا چاہیے، روٹھی رانی نے قدم رنجہ فرمایا ہمارے غریب خانہ پر —— سچ کئی دفعہ پروگرام بنایا کہ چلیں زبیدہ سے مل کر آئیں، مگر یہ رعنا۔"

رعنا نے تیکھی چتون سے اسے دیکھا اور بولی، "بس بس میرا نام نہ لینا بیچ میں، تم جانو اور یہ جانیں۔"

زبیدہ نے اسے گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ "بڑی چمک گئی ہو۔ کاہے کو منہ لگاؤ گی ہمیں —— بے مروت کہیں کی کبھی بھول کر

بی خبر نہ لی کہ جیتی ہوں یا مر گئی ہوں، یا چاہ کا وہ دعویٰ تھا کہ جیسے ان سے
بڑھ کر ہمارا کوئی دوست نہیں!

رعنا کچھ جھینپ سی گئی، کہنے لگی۔ "تم تو قاسم سیٹھ پر صدقے قربان ہو
ہو رہی تھیں، سکینہ بوا سے پوچھو، کئی مرتبہ گئی لیکن جب گئی یہی معلوم ہوا۔
ڈرائنگ روم میں جلوہ پاشی ہو رہی ہے۔

زبیدہ۔ اور وہاں اگر چلی آتیں تو پاؤں کی مہندی چھوٹ جاتی، کیوں؟

رعنا۔ مہندی تو ہم لگاتے ہی نہیں، ——— بات یہ ہے کہ کچھ نفرت ہو گئی ہے مجھے اس شخص سے۔

زبیدہ۔ خیریت تو ہے کیوں؟

رعنا۔ بس ہو گئی، بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی صورت دیکھتے ہی نفرت بیٹھ جاتی ہے دل میں، کچھ ایسے ہوتے ہیں جن پر نظر پڑی اور دل کھنچا ان کی طرف۔

نجمہ۔ جیسے سلیم صاحب۔

رعنا۔ پھر تم بولیں؟ ——— قاسم سیٹھ سے میل ملت تو پرانی ہے لیکن دل کبھی نہیں ملا اور اس کی صحبت میں رہتے رہتے تم بھی بالکل ویسی ہی ہو گئیں۔

زبیدہ۔ یعنی قابلِ نفرت؟

رعنا۔ اچھا بتاؤ بھلا، اس دن اتنے سوکھے منہ سے مبارک باد دے کر کیوں چلی آئی تھیں تم؟

زبیدہ۔ پھر کیا کرتی؟ کیا قربان ہو جاتی تم پر؟
رعنا۔ قاسم سیٹھ تو بہت خفا نظر آ رہے تھے۔
زبیدہ۔ ہاں، —— لیکن خفا بھی تو تم ہی نے کیا تھا۔
رعنا۔ میری جوتی کو کیا پڑی تھی کہ اس بن مانس کو خفا کرتی؟
نجمہ۔ خدا کی قسم طبیعت خوش کر دی۔ واقعی بن مانس لگتا ہے قاسم سیٹھ کا بچہ —— لیکن ہاں، اینٹھے کس بات پر ہیں وہ ہم لوگوں سے؟
زبیدہ۔ ان کا خیال ہے، انہیں زک دینے کے لئے تم نے سلیم صاحب کو وادر مودی ٹون میں ملازم رکھایا ہے۔
رعنا۔ اچھا یہی سہی پھر —— کیا سلیم صاحب ان کے زرخرید ہیں؟ کیا سلیم صاحب دودھ پیتے بچے ہیں کہ جو چاہے ہاتھ میں الٹی اور منہ میں چاکلیٹ دے کر۔ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جاتے؟

زبیدہ ہنسنے لگی، رعنا نے از اوّل تا آخر سارا ماجرا سنایا، زبیدہ نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا، مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں —— قاسم سیٹھ سے نفرت کر دیا محبت مجھے کیا۔ مجھے تو شکوہ یہ ہے کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں تو قاسم سیٹھ کی بیماری میں نہ آسکنے پر مجبور تھی۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا —— معلوم ہو گئی حقیقت آپ کی بھی، جسے ہم دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے، وہ بھی دغا باز نکلا،

نجمہ۔ کیا لڑنے آئی ہو آج؟
زبیدہ۔ ہاں —— قطع تعلق کا اعلان کرنے۔ اب رعنا سے ہماری لڑائی

ہے ، کبھی نہیں بولوں گی اس سے ۔ نہ اس کے دروازے پر قدم رکھوں گی ۔ نہ اسے اجازت ہے میرے گھر آنے کی ۔

کہہ ۔ (رعنا کی طرف دیکھتے ہوئے) واہ ! بی رعنا آنسو بہانے لگیں ۔ دیکھنا زبیدہ ذرا ان کی طرف ،

زبیدہ نے نظر اٹھائی تو واقعی رعنا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے ، اور جیسے ہی زبیدہ نے اس کی طرف دیکھا ، ٹپ ٹپ گرنے لگے ۔ زبیدہ نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا ، اب تو طوفان کا تھمنا مشکل ہو گیا ، سسکیاں ، ہچکیاں !

---

(۴۵)
صُلح

یہ ہچکیاں اور سسکیاں اتنی بڑی سفارش ثابت ہوئیں کہ خود بخود صلح ہو گئی۔ وہ جو ایک غبار سا پیدا ہو گیا تھا، دونوں کے دل میں، رعنا کے آنسوؤں نے اسے دھو دیا۔ اب دونوں کے دل پھر آئینہ کی طرح صاف شفاف تھے، پھر گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

بات یہ تھی کہ زبیدہ اور رعنا میں اتنے گہرے روابط تھے کہ اس طرح کی معمولی غلط فہمیاں انہیں شکستہ نہیں کر سکتی تھیں۔ دونوں کے ملاپ سے نجمہ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، اس نے اس تقریب میں ایک تجویز پیش کر دی آج شب کو دعوت ہے تم دونوں کی ہمارے گھر پر ــــــ منظور؟

رعنا نے انکار میں گردن ہلائی، زبیدہ نے زبان سے کہا۔" بالکل نامنظور۔" نجمہ پر اداس سی پڑ گئی، "یہ کیوں؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری دعوت کر سکوں؟ رعنا کو تو خوب جی بھر کے رلا چکیں، کیا اب میری باری ہے؟ اب مجھے رلاؤ گی؟" زبیدہ نے محبت بھرے انداز میں اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔" اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ ایسی معمولی معمولی باتوں پر اپنے موتی کے سے آب دار آنسو ضائع کروگی؟" نجمہ نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔" تو پھر ہاں کہہ دو۔"

زبیدہ نے کہا۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں —— اور کتنی بار کہوں؟"

نجمہ خوش ہو گئی، اس نے جواب دیا۔" بس ایک بار —— لیکن اسی انداز اور اسی ادا سے۔

رعنا اور زبیدہ ہنسنے لگیں۔ سلیم کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا۔

نجمہ نے کہا۔" آج بہت بڑا معجزہ ظاہر ہوا ہے، گر جاؤ سجدہ میں، —— دیکھو سلیم صاحب مسکرا رہے ہیں، ہائے میرے پاس صرف سو روپے کا نوٹ تھا۔ وہ رعنا نے چھین لیا ورنہ اسی وقت نچھاور کر دیتی اس جاں نواز تبسّم پر!"

زبیدہ۔ دیکھو یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں، سلیم صاحب کو نہ ستاؤ۔ آخر تم ان کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو، واہ، یہ بھی کوئی بات ہوئی پھر میں خفا ہو جاؤں گی تم سے۔

نجمہ۔ اچھا بھئی غلطی ہوئی۔ چپ ہو جاتے ہیں۔ سلیم کو بھی کیسے کیسے

لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔ کاش کبھی ہمارے لئے یوں کسی سے لڑی ہوتیں۔

زبیدہ۔ پہلے دیسی بن تو جاؤ۔

نجمہ۔ یعنی سلیم بن جاؤں؟

زبیدہ۔ سلیم صاحب تو ہزار دفعہ مر کر جنم لو تو نہیں بن سکتیں، ویسی ہی بن جاؤ۔

نجمہ۔ سن رہی ہو رعنا اپنے رقیب روسیاہ کی باتیں، سلیم گئے ہاتھ سے، اوہ اس رات والی دعوت بیکار گئی بالکل، مجھے ہمدردی ہے تم سے لیکن افسوس کوئی مدد نہیں کر سکتی، بھلا شیر سے اسکا شکار چھیننے کی ہمت کہاں سے لاؤں؟ نا بابا، باز آئی میں تمہاری حمایت سے، خود ہی نبٹ لو زبیدہ بیگم سے۔

رعنا۔ ہاں نبٹ لیں گے، تم چپ رہو،

نجمہ۔ ورنہ کیا کرو گی؟

رعنا۔ موت آجائے گی تمہاری میرے ہاتھ سے،

نجمہ۔ (ہنستے ہوئے سہم کر) نہیں میں مرنا نہیں چاہتی، —— ابھی تو میں جوان ہوں —— چپ ہوئی جاتی ہوں۔

زبیدہ۔ (ہنستے ہوئے) نجمہ کبھی تو آدمی بن جایا کرو خدا کے لئے۔

نجمہ سب مجھی کو کہتے ہیں، نہ جانے زمانہ کیوں میرے خلاف ہے؟ گھر میں جاؤ تو تنویر صاحب میرے انتظار میں لڑنے کے لئے چشم براہ، یہاں آؤ تو بی رعنا تیر و خنجر لئے جان لینے کو موجود۔ تم سے

کبھی بھولے بسرے ملاقات ہو جائے تو تم آنکھوں آنکھوں اور باتوں باتوں میں قتل کرنے کو تیار، یا اللہ ؎

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اے شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

زبیدہ اور رعنا کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔

---

(۴۶)

کھانے کی میز پہ

زبیدہ کے آنے کے بعد مجلس کچھ اسطرح جمی کہ کسی کو کھانے کا ہوش ہی نہ رہا، حالانکہ خانساماں کئی مرتبہ اپنی جھلک دکھا کر اور گویا یہ اعلان کر کے چلا گیا کہ کھانا تیار ہے۔ آخر نجمہ نے کہا۔ "بھئی کس جرم کی سزا دے رہی ہو، دو بجنے کو آئے، مگر کھانا ——" رعنا نے گھنٹی بجائی، ملازم حاضر ہوا اسے حکم دیا کھانا لگاؤ، زبیدہ نے کہا۔ "اچھا بھئی ہم تو چلے"، رعنا نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ "واہ بغیر کھانا کھائے نہیں جا سکتیں تم۔" نجمہ نے پوچھا، میرے بارے میں کیا فیصلہ ہے سرکار کا۔ جاؤں یا بیٹھوں؟ یعنی دو روٹیاں ملیں گی یا فقیر کا پیٹ خالی رہے گا؟ رعنا نے جواب دیا۔ "تمہارا پیٹ جہنم ہے۔ خدا کے لئے دفان ہو جاؤ۔ کسی طرح سے ورنہ ہم سب بھوکے رہ جائیں گے۔" نجمہ نے پوچھا۔ "ہم سے کیا مراد

ے؟ کیا سلیم صاحب بھی ایک لقمہ کھاکر ہماری عزت افزائی کریں گے؟"
ں اس سے کہ سلیم کچھ کہے، زبیدہ بول اٹھی، کیوں نہیں، وہ بھی ہمارے
ہ کھائیں گے۔ کیوں سلیم صاحب؟" سلیم نے پہلو بدلتے ہوئے
"جیسا آپ کہیئے"۔ نجمہ نے کہا، "اس طرح اگر زہر بھی دے دو، تو وہ
کھالیں گے۔ انکار کر سکتے ہیں؟

پھر سب ہنسنے لگے،

اتنے میں اطلاع ملی کھانا لگا دیا گیا۔ سب لوگ کھانے کی میز پر
پہنچے، کافی دیر ہو چکی تھی، لہٰذا سب ٹوٹ پڑے۔ البتہ سلیم صاحب
ے تکلف کے ساتھ لقمے اٹھا رہے تھے۔ زبیدہ نے یہ کیفیت تاڑی
ر کہا۔

"سلیم صاحب، آپ تو کھا ہی نہیں رہے ہیں، کھائیے"۔

نجمہ بولی۔ "خدا کے لیئے تم مت کہو ان سے کچھ!

زبیدہ نے دریافت کیا، "کیوں جناب، میں کیوں نہ بولوں، میری
زبان بندی پر یہ اصرار کیوں ہے آپ کو؟

نجمہ نے کہا۔ "تمہارے حکم کی تعمیل پر تو یہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اب تم
نے کہا ہے تو دیکھ لینا، اتنا کھائیں گے کہ ڈاکٹر بلانا پڑیگا—— لیکن میں چوک گئی،
سے اچھا ڈاکٹر کہاں ملے گا، کھائیے خوب ڈٹ کر کھائیے سلیم صاحب مسیحا موجود
ہے آپ کی بالیں پر، امرے تو زندۂ جاوید ہو جائیں گے، زندہ رہے تو امر بن جائینگے"۔

پھر کمرہ قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا۔

نجمہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
لیکن زبیدہ، کتنا اچھا ہوتا، اگر پیٹ کا علاج کرنے کے بجائے تم
سلیم کے دماغ کا علاج کرتیں؟ کچھ اور بھی سنا تم نے؟"
زبیدہ منتظر نگاہوں سے نجمہ کی طرف دیکھنے لگی، نجمہ نے کہا۔
"جانتی ہو سلیم صاحب اس وقت یہاں کیوں رونق افروز ہیں؟"
زبیدہ۔ میں کیا جانوں، ملنے آئے ہوں گے رعنا سے،
نجمہ۔ جی ملنے نہیں رخصت ہونے تشریف لائے ہیں، کچھ بسلسلہ
کی خبر بھی ہے؟
زبیدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، لیکن نجمہ اور رعنا اسے محسوس
نہ کر سکیں۔ زبیدہ نے پوچھا۔
رخصت ہونے کیوں؟
نجمہ۔ کہتے ہیں، میں اب بمبئی چھوڑ رہا ہوں، ہرمز جی نے ۲۵ ہزار کا
چیک دیا تھا، نئی کہانی کے لئے، وہ رعنا کو دے رہے تھے کہ
انہیں واپس کر دیں جاکر، میں نے اور رعنا نے بہت اصرار کیا۔ خدا
کے لئے ہرمز جی کا پیٹ اور ہمارا دل نہ توڑیئے، لیکن یہ بھلا کس
کی سنتے ہیں؟ ان کا ایک ہی جواب تھا، میں اب یہاں نہیں رہ
سکتا نہ جانے قاسم سیٹھ کی دہشت ہے یا مالیخولیا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کہ ماجرا کیا ہے۔ تم ہی سمجھاؤ شاید سمجھ جائیں۔
رعنا۔ بھلا غور تو کرو زبیدہ اتنی بڑی رقم واپس کر دینا کہاں کی عقلمندی

ہے۔

ہم نے تو کسی باہوش آدمی کو اس طرح اپنے حال اور مستقبل پر
فٹ بال کی طرح لات مارتے نہیں دیکھا۔

اور لطف یہ کہ یہ بھی نہیں بتاتے کہاں جائیں گے، کیا کریں گے؛

واہ تمہارے سوال کے جواب میں کہہ تو رہے تھے بڑی شان سے،
"میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں!" مزدوری کریں گے۔

ملک کا اتنا بڑا ادیب اور آرٹسٹ مزدوری کرے گا، واقعی یہ تو
پاگل پنے کی باتیں ہیں۔

وہ تو ہیں ہی ہیں۔

سلیم صاحب کی ایک، کہانی نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔
یہ بہت کچھ بن چکے ہیں اور بہت کچھ بن سکتے ہیں لیکن اس جنون
کا کیا علاج کہ اس پر چلے ہیں ہم تو تباہ ہوں گے، ہم تو مٹیں گے
ہم تو خود کشی کریں گے

میرا بس چلے تو انہیں پاگل خانہ بھیج دوں۔ لیکن کیا کروں ــــــ
بے بس ہوں۔

بے بس یوں ہو کہ سلیم صاحب کو پاگل خانے نہیں بھیج سکتیں۔

ہاں اور کیا؛

لیکن خود تو جا سکتی ہو، کیوں نہیں چلی جاتیں؛

اگر ان کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو واقعی چلی جاؤنگی، اس کے سوا کوئی

چارہ ہی نہیں ہے۔ اچھا بھلا آدمی اپنے آپ کو اس طرح غارت کر دے میں کس آنکھ سے یہ منظر دیکھ سکتی ہوں بھلا؟

زبیدہ۔ ہاں آنکھیں تو واقعی تمہاری چھوٹی ہیں، بس یہی ایک عیب ہے تم میں۔

نجمہ۔ میں سمجھ گئی تم بھی کچھ نہیں کر سکتیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) لائیے سلیم صاحب، وہ چیک مجھے دے دیجئے واپس کر دونگی جا کر ہرمز جی کو ابھی!

سلیم نے جیب میں ہاتھ ڈالا، چیک نکالا اور نجمہ کی طرف بڑھا دیا۔ نجمہ اسے غور سے دیکھنے لگی، پھر بولی۔

"ہائے ۲۵ ہزار ـــــــ اتنی بڑی رقم یہ پگلا واپس کر رہا ہے یااللہ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور"

رعنا کو ہنسی آگئی، زبیدہ نے چیک نجمہ سے لے کر ایک مرتبہ دیکھا پھر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسے رکھ لیجئے خواہ مخواہ واپس کئے دے رہے ہیں!"

سلیم نے ایک مؤدب اور اطاعت گذار شاگرد کی طرح استاد سے پوچھا۔

"تو کیا واقعی رکھ لوں اسے؟"

زبیدہ نے جواب دیا۔

"ہاں اور کیا؟ ـــــــ اتنی بڑی رقم خواہ مخواہ واپس کیجئے گا!"

- لیکن میں تو بمبئی چھوڑ رہا ہوں۔ کل مجھے چلا جانا ہے یہاں سے۔

- کل کون دن ہے؟

- منگل۔

- لیکن کیا ضرور ہے کہ اس منگل کو جائیے۔ دوسرے، تیسرے چوتھے، پانچویں کسی منگل کو چلے جائیے گا، جس کام کا آپ وعدہ کر چکے ہیں اسے تو نبٹاتے جائیے، عہد شکنی تو اچھی نہیں ہوتی۔

- عہد شکنی نہ ہو، یہی تو سوچ کر میں کل جا رہا ہوں۔

- تو کیا آپ نے کسی سے عہد کیا تھا کہ منگل کو بمبئی چھوڑ دیں گے۔

- کیا تھا تو بھی پہلے وہ عہد پورا کیجئے جس پر آپ کی نہیں دوسروں کی زندگی کا انحصار ہے ——— پہلے اپنی کہانی مکمل کر دیجئے، پھر سفر کا پروگرام بنائیے اگر وہ ایسا ہی ضروری ہے۔

- جی ہاں ضروری تو بہت ہے۔

- ہونے دیجئے۔

سلیم نے چیک جیب میں رکھ لیا۔ رعنا نے پوچھا۔

"تو پھر یہ کہانی آپ مکمل کریں گے اب؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

نجمہ نے سوال کیا، "اب پھر تو آپ پر دورہ نہیں پڑیگا؟"

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکرانے لگا۔

(۴۷)

التفات

تھوڑی دیر کے بعد سلیم نے رخصت ہونا چاہا۔

نجمہ نے اعتراض کیا۔ "آئے کتنی دیر ہوئی ہے جو ابھی سے جا رہے ہیں؟ بیٹھئے، ! دیکھو رعنا، یہ جا رہے ہیں!"

رعنا نے نجمہ سے کہا، "تمہیں کیا۔ جا رہے ہیں تو جانے دو — سلیم صاحب! واقعی جا رہے ہیں آپ؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "جی ہاں، اب مجھے جانا چاہیئے۔ دیر بھی کافی ہو گئی ہے اور کام بھی کئی انجام دینے ہیں۔ انشاء اللہ پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔"

رعنا مسکراتی ہوئی بولی۔ "شکریہ، بہتر ہے تشریف لے جائیے۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ کہانی لکھیں گے آپ؟ بغیر اسے مکمل کئے بمبئی

قدم باہر نہیں نکالیں گے؟"

سلیم۔ جی ہاں، یہ تو طے ہو چکا۔

نجمہ۔ خوب سوچ لیجئے اچھی طرح ——— ایسا نہ ہو یہاں سے جانے کے بعد پھر رائے بدل جائے، بھائی آپ سے تو ڈر لگتا ہے۔

سلیم۔ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔

زبیدہ۔ اور ہوگا بھی پھر تم بیچ میں بولنے والی کون؟ ——— رعنا، ذرا کسی آدمی کو بلانا ——— سلیم صاحب اطمینان سے اپنا کام کیجئے یہ نجمہ تو اسی طرح ہر معاملہ میں تقریر کیا کرتی ہے۔ (رعنا کے ملازم سے جو ابھی حاضر ہوا تھا) جاؤ ہمارے ڈرائیور کو بلا لاؤ ——— سلیم صاحب آپ کی نئی کہانی کا عنوان کیا ہے؟

سلیم۔ عنوان کا فیصلہ عموماً آخر میں کیا کرتا ہوں۔ ویسے خیال یہ ہے کہ شاید "عشق" ہو۔

رعنا۔ عشق؟

نجمہ۔ تم سے نہیں ——— منہ دھو رکھو۔

زبیدہ۔ خدا کے لئے یہ بک بک بند کر دو ——— سلیم صاحب عنوان تو بہت اچھا ہے۔

سلیم۔ تو پھر یہی رکھ لوں گا۔

رعنا۔ "مجھے کچھ شبہ ہے، کہانی زیادہ اچھی نہیں ہوگی"۔

زبیدہ۔ یہ شبہ کیوں ہے آپ کو؟

نجمہ۔ بیچارے سلیم صاحب عشق کرنا کیا جانیں؟ بیچارے بھولے بھا
سیدھے سادے سے آدمی ٹھہرے، کہاں یہ، کہاں عشق!
زبیدہ۔ تمہارے نزدیک ایک افسانہ نگار ہر کہانی خود اپنے اوپر لکھ
ہے؟
نجمہ۔ اور کیا۔ بغیر اس کے کہیں اسٹوری میں جان پیدا ہو سکتی ہے
زبیدہ۔ آخر چاہتی کیا ہو؟
نجمہ۔ میری خواہش ہے کہ کہانی لکھنے سے پہلے، اور اگر لکھنا شروع
کر چکے ہیں تو اسے ختم کرنے سے پہلے سلیم صاحب عشق کرنا سیکھ
زبیدہ۔ تو سکھا کیوں نہیں دیتیں؟
نجمہ۔ زہے قسمت ——— دل و جان سے تیار ہوں، پوچھو یہ
شاگرد بننے پر تیار ہیں؟
رعنا۔ بتایئے سلیم صاحب، تیار ہیں آپ نجمہ کے شاگرد بننے پر۔ ا
درس محبت لینے پر؟
سلیم۔ (نہایت سنجیدگی سے) جی نہیں،
نجمہ۔ اب بتاؤ، دیکھ لیا تم نے؟ اچھا تو پھر کس کے شاگرد بننا چاہتے
ہیں؟ کیا رعنا کو یہ عزت دے سکتے ہیں آپ؟
سلیم۔ جی نہیں،
نجمہ۔ بس اب زبیدہ ہی باقی رہ گئی ہیں، چلو بھائی، اٹھاؤ سونٹا
تمہارا یہ شاگرد بڑا ڈھیٹ ہے ٹھیک کر دو اسے!

زبیدہ ہنسنے لگی، اتنے میں ڈرائیور سامنے آکر کھڑا ہوگیا، زبیدہ نے ڈرائیور سے کہا۔ "جاؤ سلیم صاحب کو ان کے گھر پہنچا آؤ جاکر!"

سلیم ڈرائیور کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ نجمہ نے پکار کے کہا "دیکھئے آج رات کو غریب خانہ پر تشریف لانا نہ بھولئے گا، دعوت ہے!" زبیدہ بولی: "اپنا قیمتی وقت ہرگز نہ ضائع کیجئے گا، اس کے ہاں آکر!"

سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بالاخانہ سے نیچے اتر چکا تھا۔

---

(۴۸)

چوٹیں

نجمہ نے روٹھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے" زبی
نے محبّت بھری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا "کیوں سرکار
کیا خطا ہوئی ہے کنیز سے ؟" نجمہ نے کہا "تم نے سلیم صاحب کو منع کرد
دیکھ لینا، اب وہ ہرگز نہیں آئیں گے" ؟ زبیدہ نے پوچھا۔ "کیوں نہیں
آئیں گے ؟" نجمہ بولی تم نے منع جو کر دیا ہے !" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے
دریافت کیا۔ "کیا وہ میرے غلام ہیں ؟" نجمہ نے کہا۔ "غلام نہیں تو اور کیا ہیں
——— اپنی اپنی قسمت ہے بھائی، رعنا سر تاج بنانے پر تیار ہیں لیکن وہ
حضرت نظر بھر کر دیکھتے بھی نہیں، تم غلاموں کا سا برتاؤ کرتی ہو،
مگر وہ ہیں کہ شادی مرگ میں مبتلا ہوئے جا رہے ہیں ——— واہ ری
دنیا واہ رے زمانے !

رعنا بگڑ گئی، "دیکھو نجمہ آخری بار تمہیں منع کر رہی ہوں، اب کبھی میرا نام نہ لینا اس بیچ میں"! نجمہ نے پوچھا۔ "اور اگر اس حکم کی تعمیل نہ کروں تو سزا کیا ہو گی"؟ رعنا نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "پھر ہمارے تمہارے تعلقات منقطع ہو جائیں گے"۔ نجمہ بولی۔ "وہ کہیں ایک ہاتھ سے تالی بجی نہ ہو۔" رعنا نے اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لینا"۔ زبیدہ بیچ میں بول پڑی۔ "تم دونو تو ہر وقت لڑا کرتی ہو، کیا تلے اوپر کے بھائی بہن اس طرح لڑتے ہوں گے ——— یہ تو بتاؤ دعوت واقعی کر رہی ہو؟

نجمہ۔ اور کیا تم مذاق سمجھ رہی تھیں؟

زبیدہ۔ کون کون مدعو ہے؟

نجمہ۔ بس صرف تم، ——— رعنا اور سلیم صاحب جو نہیں آئیں گے۔

رعنا۔ میں بھی نہیں آؤں گی۔

نجمہ۔ دیکھ لوں گی کیسے نہیں آتی ہو۔

زبیدہ۔ پھر شروع ہو گئی لڑائی، بات تو سنو،

نجمہ۔ کہو ——— تمہاری بات بھی سن لیں،

زبیدہ۔ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ یہ دعوت نتیجہ خیز بن جائے۔

نجمہ۔ وہ کس طرح؟

زبیدہ۔ ہرمز جی کو بھی بلا لو۔

رعنا۔ ہرمز جی بیچارے نے کیا خطا کی ہے؟ ان کی شامت کیوں بلا رہی ہو؟

زبیدہ۔ مصلحت ہے اس میں، ہرمز جی کو بھی بلالو، کہا مانو۔

نجمہ۔ اچھا پھر۔

زبیدہ۔ اور قاسم سیٹھ کو بھی،

نجمہ۔ فائدہ؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟

زبیدہ۔ قاسم سیٹھ کا خیال ہے کہ ہرمز جی نے انہیں زک دینے کے لئے سلیم کی خدمات حاصل کی ہیں، اسی لئے وہ بہت زیادہ خفا ہیں۔

رعنا۔ ان کی خفگی کی پرواہ کسے ہے؟

زبیدہ۔ ہمیں —— ہمیں ہے ان کی خفگی کی پرواہ —— میں چاہتی ہوں دونوں میں صلح ہو جائے، کیا یہ کوئی بری بات ہے؟

نجمہ۔ ٹھیک ہے، اس تجویز پر میں صاد کرتی ہوں، لیکن قاسم سیٹھ آجائیں گے؟

زبیدہ۔ کیوں نہیں آئیں گے؟

نجمہ۔ بس تو تم لینے آنا انہیں۔

زبیدہ۔ یوں نہیں۔ تم مجھے فون کرنا عین وقت پر، میں انکار کر دوں گی، پھر تم مجھے لینے آجانا، قاسم سیٹھ وہیں میرے ہاں بیٹھے ہوں گے فوراً انہیں بھی مدعو کر لینا، میں بھی اصرار کروں گی بس چلے آئیں گے۔

نجمہ۔ تم کہو گی تو کچے دھاگے میں بندھے چلے آئیں گے۔

زبیدہ۔ اور رعنا ہرمز جی اور مسٹر مہتا کو لے آئے گی۔

رعنا۔ میں نہیں جاتی ہرمز جی ٹرمز جی کو لینے، میں کیوں جاؤں؟

زبیدہ۔ اس لئے کہ میں کہتی ہوں

رعنا۔ ہم تو تمہاری ہر بات لیں، تم بھی کبھی ہمارا کہا مانتی ہو۔

زبیدہ۔ ہمیشہ ـــــ کہہ کے دیکھ لو، اشارہ کرو، گردن ابھی لڑھکتی نظر آئے گی تمہارے قدموں پر ـــــ بھئی یہ ٹھیک رہا نجمہ۔

نجمہ۔ مجھے تو خوف ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے ـــــ لیکن یہ رعنا دغا نہ دے جائیں کہیں عین وقت پر؟

زبیدہ۔ ایسا قیامت تک نہیں ہو سکتا، تم رعنا کو اتنا نہیں جانتیں جتنا میں جانتی ہوں، وہ میری صرف سہیلی ہی نہیں، بہن بھی ہے، دیکھا نہیں تھا تم نے، میں ذرا خفا ہو گئی تھی تو موتی کی لڑیاں گرنے لگیں تھیں۔ اس کی آنکھوں سے؟ ـــــ وہ بھلا میری حکم عدولی کر سکتی ہے؟

نجمہ۔ اب تو مجھے یقین آ گیا، رعنا کو جانا ہی پڑے گا ـــــ کیوں رعنا جاؤ گی نا؟

رعنا۔ تم کیوں پوچھتی ہو؟ ہم جانیں اور زبیدہ جانے!

زبیدہ۔ اچھا ہمیں بتاؤ ـــــ جاؤ گی نا؟

رعنا۔ ہاں چلی جاؤنگی۔

زبیدہ نے اسے گھسیٹ کر سینہ سے لگا لیا اور فاتحانہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "دیکھا؟"

نجمہ نے کہا۔ "ہاں دیکھ لیا بھئی نہ جانے تم سے کیوں اتنی کور دبتی ہے بی رعنا کی، ہم سے تو یہ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتی ہیں، حالانکہ

ہم ان کے دمساز ہیں۔ غم خوار ہیں، محرمِ راز ہیں، تم ان کی رقیب روسیاہ ہو، حریف ہو، مدِّ مقابل ہو، واقعی اصل چیز قسمت ہے!"

رعنا نے ایک زور کی چٹکی نجمہ کے لیتے ہوئے کہا،" پھر کوواس شروع کر دی تم نے؟"

نجمہ نے بڑی سادگی سے زبیدہ کی طرف دیکھا اور کہا،" دیکھ رہی ہو اس ظالم کو؟ ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

لیکن صیاد کی مرضی ہوا کرے ہیں تو گھٹ کر مرنے کو تیار نہیں ہوں، وہی کہوں گی جو زبان پر آئے گا، نہ ہم کسی سے ڈریں، نہ کسی کی پرواہ کریں۔ کوئی بڑا ہے تو اپنے گھر خوش، ہم چھوٹے ہیں تو اپنے گھر خوش۔

زبیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔" اچھا اب تم دونوں اطمینان سے لڑو میں جاتی ہوں، لیکن ایسا نہ ہو تم دونوں میں یہاں لڑائی ہوتی رہے اور وہاں باورچی دال روٹی پکا کر رکھ دے!"

نجمہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔" ٹھیک کہتی ہو، چلو مجھے ڈراپ کرتی چلی جانا۔"

---

(۴۹)

عالمِ تصوّر

زبیدہ چلی گئی۔

نجمہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

رعنا کمرہ میں تنہا بیٹھی تھی، وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی، شاید کچھ سوچ رہی تھی ــــ کوئی اہم اور خاص بات۔

پھر ٹہلتے ٹہلتے وہ اپنی مطالعہ کی الماری کے پاس گئی، تین چار کتابیں نکالیں اور صوفے پر آکر بیٹھ گئی اور ان کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ لیکن جلد ہی اس مشغلہ سے طبیعت اکتا گئی ــــ کتابیں الماری میں پہنچ گئیں۔

پھر ریڈیو کی طرف متوجہ ہوئی، کئی ملکی اور غیر ملکی اسٹیشنوں پر سوئی گھماتی رہی۔ کہیں گانا ہو رہا تھا، کہیں ڈراما۔ کہیں کہانی سنائی جا رہی تھی کہیں رقص کا نغمہ بلند تھا ــــ لیکن رعنا کا جی کسی میں بھی نہ لگا، نہ کوئی گانا پسند

آیا، نہ نغمہ نہ رقص، ڈرامہ نہ کہانی، ـــــ ریڈیو بند کر دیا گیا۔

پھر اس نے فلمی اور غیر فلمی رسالے اٹھا لیے، ان کے ورق الٹتی پلٹتی رہی۔ تصویریں دیکھتی رہی۔ افسانے پڑھنے کی کوشش کرتی رہی دنیائے فلم کی خبروں کا معائنہ کرتی رہی، مختلف ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی داستانِ معاشقہ پر نظر ڈالتی رہی۔ فلمی سیٹھوں اور ساہوکاروں، ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں، نئی مگر بدنصیب ایکٹرسوں اور منجھے ہوئے فلمی فنکاروں کے بارے میں سنسنی خیز اور شرمناک خبریں دیکھتی رہی، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس کا دامن اپنی طرف نہ کھینچ سکی، بہت جلد طبیعت بھر گئی۔ وہ سارے رسالے بنڈل بنا کر ایک طرف پھینک دیئے۔

پھر وہ ٹہلنے لگی ـــــ بڑی دیر گذر گئی اسی طرح، گھڑی پر نظر ڈالی تو شام کے سات بج رہے تھے، آٹھ بجے نجمہ کے ہاں پہنچنا تھا، اور وہاں جانے سے پہلے ہرمز جی اور مسٹر مہتا کو ساتھ چلنے پر آمادہ کرنا تھا۔ اب وقت ہی کتنا رہ گیا تھا؟ جلدی جلدی کپڑے بدلے، آرائش اور سنگار سے فراغت کی، پھر ملازم سے کہا۔

ڈرائیور سے کہو کار نکال لے، ہمیں باہر جانا ہے!

پھر آئینہ کے سامنے آ کر اپنے چہرۂ زیبا پر ایک نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ چہرہ جو ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ جو بغیر سنگار اور آرائش کے بھی پھول کی طرح شاداب اور تر و تازہ نظر آتا تھا، اس وقت آرائش اور سنگار کے باوجود ـــــ اگر پھول کی طرح تھا بھی تو مرجھایا ہوا، کملایا ہوا، نہ

ادابی تھی نہ رعنائی۔ نہ مسرت کی چمک تھی نہ انبساط کی جھلک، نہ تبسم عشوہ وغمزہ!

اپنی اس تبدیلی پر وہ خود حیران رہ گئی۔

اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ آخر یہ تبدیلی کیوں ہے؟ میرا یہ حال یوں ہو رہا ہے؟ ——

پھر وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ آئی، شاید اس نے اپنی آنکھوں ں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لیئے تھے اور اپنی اس کمزوری کو خود اپنے سے چھپانا چاہتی تھی، اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں اور بغیر کسی ارادہ ے دوبارہ آئینہ کے سامنے جاکر کھڑی ہو گئی۔

اب آنسو نہیں تھے!

لیکن آنسوؤں کا نشان موجود تھا، آنکھیں کچھ سرخ سی ہو رہی تھیں۔ وہ پھر جھجک کر آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی!

اتنے میں ملازم سامنے آکر کھڑا ہو گیا، رعنا نے اس کی طرف دیکھا ور پوچھا۔

”کیا ہے؟“

وہ بولا۔

”ڈرائیور بڑی دیر ہوئی کار نکال چکا ہے!— اگر نہ جانا ہو تو گیرج میں رکھ دے، کیونکہ گھٹا اُمڈ رہی ہے۔ شاید پانی زور سے برسے گا؟“

رعنا نے کہا۔

"چلو ہم آتے ہیں، بڑا ضروری کام ہے، جانا بہت ضروری ہے۔"

ملازم چلا گیا ——— رعنا غسل خانے میں گئی، جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارے، واپس آکر تولیہ سے رگڑ رگڑ کر خوب اچھی طرح چہرہ صاف کیا وہ بھی سُرخ ہوگیا، اب اس کا اور آنکھوں کا رنگ ایک ہوگیا تھا۔ وہ پھر آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ مرجھایا ہوا پھول پانی میں ڈال دیا جائے تو کنول کی طرح کھل نہیں جائے گا، مرجھایا ہی رہتا ہے۔ ان پیہم کوششوں کے باوجود چہرہ پر افسردگی غالب تھی، رونق کا کہیں نام ونشاں نہ تھا۔

گھڑی سے ٹک کی آواز آئی، ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

اس نے جلدی جلدی مرزا جی اور مسز مہتا کو فون کرکے نجمہ کے ہاں ٹھیک وقت پر پہنچنے کی تاکید کی۔ پھر جلدی جلدی نیچے اتری، ڈرائیور سے کہنے لگی۔

"تمہیں ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہم خود ڈرائیو کریں گے۔"

گھرر کی آواز آئی اور رعنا موٹر سمیت بنگلہ کی حدود سے باہر جاچکی تھی جیسے روس کا اسپٹنک یا امریکہ کا میزائل۔

---

(۵۰)

چکّر

نہ جانے اس وقت رعنا کا کیا حال ہو رہا تھا، کچھ عجیب سی کیفیت طاری ی اس پر، وہ موٹر بہت کم چلاتی تھی، اور جب چلاتی تھی تو نہایت سلامت دی کے ساتھ، لیکن آج عالم ہی دوسرا تھا۔ پتنگ کی طرح کار کو اڑائے لئے ی جا رہی تھی۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ راستہ اندھیرے کی وجہ سے خطرناک ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ہوا سے باتیں کرتی رواں تھی جیسے اسے نہ کسی حادثے کی پرواہ تھی نہ اپنی سلامتی کی فکر —— ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا لیکن دل کہیں اور تھا۔ دماغ نہ جانے کہاں کہاں کی خبریں لا رہا تھا۔

اتنے میں ہاسم آگیا —— وہ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں بھی تیزی سے کار دوڑاتی رہی، یہاں تک کہ گل منزل کے سامنے اس نے بریک لگایا۔ ایک زوردار جھٹکا کے ساتھ کار رک گئی۔ وہ کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

دستک دی اور دروازہ کھلا۔ سلیم اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

مس رعنا آپ؟ آیئے تشریف لایئے!

رعنا اندر چلی آئی۔ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں اب تک سرخ تھیں۔ اس حالت میں اسے دیکھ کر سلیم گھبرا گیا۔ اس نے پریشان لب و لہجہ میں دریافت کیا۔

مس رعنا خیریت تو ہے؟

اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

خدا کا شکر ہے، سب خیریت ہے کہیئے آپ کا مزاج تو اچھا ہے

رعنا شوخ تھی، چنچل تھی، حاضر جواب تھی، فقرے خوب چست کرتی تھی جس پر متوجہ ہو جائے، اسے بناتے بناتے زچ کر دیتی تھی۔ خود سلیم ایک عرصہ تک تختۂ مشق بن چکا تھا۔ اس لئے اس کی ان اداؤں اور حرکات سے خوب واقف تھا۔ لیکن آج کی رعنا بالکل مختلف تھی، آج کا رنگ ہی کچھ اور تھا ـــــ نہیں یہ وہ رعنا نہیں تھی۔ جس سے وہ ماتھران اور بمبئی میں ملتا رہا تھا۔ یہ بالکل کوئی نئی رعنا تھی، اس کے الفاظ، اس کے لب و لہجہ اس کے انداز و اطوار ہر چیز میں گھبراہٹ تھی، اضطراب تھا۔ اگرچہ وہ اپنی اس کوشش پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ کوشش بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ سلیم نے بہت ذہن لڑایا لیکن خاک نہ سمجھ آیا۔ معاملہ کیا ہے؟ بات کیا ہے؟

رعنا نے کہا۔ "کیا وقت ہو گیا سلیم صاحب ـــــ؟"

سلیم نے دیکھا، گھڑی رعنا کی نازک کلائی پر بھی موجود تھی۔ پھر بھی سوال کیا جا رہا ہے، اس نے اپنی حیرت پر غالب آتے ہوئے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور جواب دیا۔

"ٹھیک نو بجے ہیں"۔

رعنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ نو بج گئے ہیں؟ بہت دیر ہوگئی، اس وقت تو ہمیں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ نجمہ کے ہاں!"

سلیم نے جواب دیا۔ "جی ہاں، اگر نو بجے کا وقت مقرر تھا تو واقعی اب تک پہنچ جانا چاہیئے تھا لیکن کچھ ایسی دیر بھی نہیں ہوئی، موٹر پر زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا راستہ ہے!"

رعنا اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے کہا۔ "ایک کام سے وادر گئی تھی۔ وہیں سے آ رہی ہوں، راستہ میں ماہم پڑا تو سوچا آپ کو بھی ساتھ لیتی چلوں۔ بچاری نجمہ نے کس چاؤ سے دعوت دی ہے آج ہم لوگوں کو!"

"چلئے، پھر اٹھئے ورنہ اور دیر ہو جائیگی"۔

سلیم نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن میں تو نہیں جا سکوں گا وہاں!"

رعنا کی تیوریاں چڑھ گئیں، آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ ہونٹ کانپنے لگے، بدن لرزنے لگا۔ اس نے مرتعش آواز میں پوچھا۔

"کیوں؟ — کیوں نہیں جا سکیں گے آپ؟"

سلیم نے رعنا کے جاہ وجلال سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔
"ہر شخص کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں مس رعنا!"

رعنا۔ مانتی ہوں ہر شخص کی مجبوریاں ہوتی ہیں —— لیکن اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے سلیم صاحب،

سلیم۔ جی ہاں ضرور ہے، اور میں نے ہرگز کسی بداخلاقی کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔

رعنا۔ کیا کسی مخلصانہ دعوت کا رد کرنا بداخلاقی نہیں ہے؟

سلیم۔ ضرور ہے لیکن میں نے وہ دعوت قبول کب کی تھی؟

رعنا۔ میں سمجھ گئی۔

سلیم۔ اگر نامناسب نہ ہو تو بتا دیجئے کیا سمجھ گئی ہیں آپ؟

رعنا۔ آپ نجمہ کی دعوت میں اس لئے نہیں جاتے کہ زبیدہ نے منع کر دیا

سلیم۔ ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔

رعنا۔ لیکن اس نے تو مذاق میں منع کیا تھا۔

سلیم۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ مس زبیدہ نے کبھی مجھ سے مذاق کیا ہو۔

رعنا۔ (کچھ سوچتے ہوئے)............ آپ، اس لئے نہیں جا رہے ہیں —— نجمہ کا خیال ٹھیک ہی تھا۔

سلیم۔ نجمہ کا خیال؟

رعنا۔ ہاں اس کا خیال ہے آپ زبیدہ سے محبت کرتے ہیں —؟

سلیم نے گردن جھکا لی، اس کا رنگِ رخ بدل گیا۔ اس نے کوئی جواب

ں دیا، رعنا نے پوچھا،

"کیا واقعی آپ زبیدہ سے محبّت کرتے ہیں ——"

سلیم نے بہت شائستہ انداز میں کہا۔

"ان سے کون محبّت نہیں کرتا"

"آپ بھی تو کرتی ہیں۔"

نا۔ ہاں میں اس سے محبّت کرتی ہوں لیکن وہ بھی تو مجھ پہ جان دیتی ہے،

کیا آپ کو یقین ہے کہ زبیدہ آپ کو چاہتی ہے؟

لیم۔ میں نے کبھی یہ بات سوچی ہی نہیں مس رعنا۔

نا۔ یہ کیسی محبت ہے آپ کی؟ آدمی جس سے محبّت کرتا ہے اس سے

محبّت چاہتا بھی ہے۔

لیم۔ وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہیں، میری یہ عادت نہیں،

نا۔ آپ صرف محبّت کرتے ہیں اور اس پر قناعت کر لیتے ہیں، یہ نہیں

چاہتے کہ وہ بھی چاہے جسے آپ چاہتے ہیں؟

لیم۔ چاہتے اور نہ چاہتے سے کیا ہوتا ہے؟ میں نے یہ کب چاہا تھا کہ

مس زبیدہ سے محبّت کروں، لیکن بقول آپ کے کرنے لگا۔ میں

کب نہیں چاہتا کہ مس زبیدہ مجھ سے محبّت کریں، لیکن آپ بھی مانتی

ہیں اور نجمہ صاحبہ بھی کہ وہ نہیں کرتیں مجھ سے محبّت نہ کبھی کرسکیں

گی —— ہوتا وہ ہے جو قدرت چاہتی ہے، انسان کا چاہا ہوتا کب ہے،

رعنا کو چکر سا آ گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے وہ تیورا کر گر پڑے گی۔ وہ جلدی

سے کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے کہا، "سلیم صاحب مجھے ایک گلاس پانی پلا دیجئے"
سلیم نے فوراً ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیش کر دیا، پانی پی کر طبیعت
کو ذرا سکون ہوا، لیکن جی اب تک قابو میں نہ تھا، اس نے کہا۔

"سلیم صاحب ایک تکلیف اور دوں گی آپ کو، میری کار خراب ہو
گئی ہے۔ ٹیکسی لا دیجئے، پھر ڈرائیور آکر یہ کار لے جائیگا۔"

سلیم ٹیکسی لینے چلا گیا۔ رعنا نے رومال آنکھ پر نہ رکھ لیا ہوتا، تو اس
کی خوبصورت ساری آنسوؤں سے تر ہو گئی ہوتی!

(۵۱)

دام

جس وقت رعنا سلیم سے گفتگو میں مصروف تھی اور اسے نجمہ کے ہاں
نے کی کوشش کر رہی تھی۔ قاسم سیٹھ زبیدہ کے ہاں براجمان تھے
ے اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آج وہ بہت
ں تھے۔ باچھیں خود بخود کھلی جا رہی تھیں، بات بیچھے کرتے، مسکراتے
تھے، نہ تکبّر، نہ نخوت، نہ غرور، نہ رعونت، زبیدہ اس تبدیلی پر متعجب
ن اس نے زیادہ نوٹس نہ لیا۔ خیال کیا، ممکن ہے ایک آدھ جام
چڑھا گئے ہوں گے، اگرچہ بظاہر مدہوشی کے کچھ آثار نہیں تھے۔
یٹھ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

جانتی ہو زبیدہ آج میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟

زبیدہ نے تبسّم کا جواب تبسّم سے دیتے ہوئے کہا۔

"کسی کے دل کا حال کیونکر جان سکتی ہوں"

قاسم سیٹھ۔ بتا دوں؟

زبیدہ۔ ضرور بتائیے

قاسم سیٹھ۔ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ یعنی میں کیس
آدمی ہوں؟

زبیدہ۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسا ہونا چاہیے تھا۔

قاسم سیٹھ۔ کیا ہونا چاہیے تھا مجھے؟

زبیدہ۔ جیسے آپ ہیں

قاسم سیٹھ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، تم ہمیشہ مجھے چٹکیو
میں اڑاتی ہو۔ نہ سنجیدگی سے بات سنتی ہو، نہ جواب دیتی ہو۔ اس طرح کب
تک کام چلے گا؟

زبیدہ۔ اب تک تو چل ہی رہا ہے،

قاسم سیٹھ۔ لیکن اب نہیں چل سکے گا۔ ہمیں ایک فیصلہ کر لینا چاہیے۔

زبیدہ۔ کس قسم کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔

قاسم سیٹھ۔ اپنی زندگی کا، اپنے مستقبل کا۔

زبیدہ۔ یہ تو آپ نے عجیب بات کہہ دی ——— آپ کی زندگی ایک
دولتمند کی زندگی ہے اور ایک دولتمند جو کچھ چاہ سکتا ہے وہ
سب آپ کو میسّر ہے، رہا مستقبل؟ تو نہ میں کوئی جوتشی ہوں نہ غیب دان
مگر اتنا کہہ سکتی ہوں کہ نہایت روشن اور تابناک ہے، پھر آپ اپنے

مستقبل اور زندگی کے بارے میں فکر مند کیوں ہیں؟

قاسم سیٹھ۔ تم بھی مجھے اسی نظر سے دیکھتی ہو جس نظر سے دوسرے دیکھتے ہیں؟

زبیدہ۔ پھر کس نظر سے دیکھوں؟

قاسم سیٹھ۔ جس نظر سے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔

زبیدہ۔ آج آپ بڑی فلسفیانہ باتیں کر رہے ہیں، میں ٹھہری جاہل ناخواندہ، کندہ ناتراش۔ بھلا آپ کی یہ اونچی باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں میری؟

قاسم سیٹھ۔ کوشش کرو ــــــ تم میرے اندر کوئی کمی نہیں محسوس کرتیں؟

زبیدہ۔ نہیں تو ــــــ آپ میں بھلا کیا خامی اور کوتاہی ہو سکتی ہے۔

قاسم سیٹھ۔ ہے اور جب تک وہ کمی پوری نہ ہو جائے میری زندگی نامکمل ہے، ناقص ہے بلکہ زیادہ صاف الفاظ میں ناقابلِ برداشت ہے۔

زبیدہ۔ ہوگی ــــــ زیادہ سوچا نہ کیجئے۔

قاسم سیٹھ۔ زبیدہ مجھ سے پوچھو، وہ کمی کیا ہے جو میں اپنے محسوس کرتا ہوں، نہیں پوچھوگی تو میرا دل پھٹ جائیگا۔

زبیدہ۔ اچھا تو بتایئے۔

قاسم سیٹھ۔ جب تک تم میری نہ بن جاؤ میری زندگی کا خلا پورا نہیں ہو سکتا۔

زبیدہ۔ بس اتنی سی بات؟

قاسم سیٹھ۔ تمہارے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے، میرے نزدیک یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔

زبیدہ۔ بجا ارشاد ہوا ——— شکریہ اس عزت افزائی کا۔

قاسم سیٹھ۔ میرا مذاق نہ اڑاؤ، میرے دل کے آبلے میں ٹھیس نہ لگاؤ۔

زبیدہ۔ مجھے اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں، آدمی بنئے، کام کی باتیں کیجئے ——— وہی رٹے ہوئے الفاظ، وہی پٹے ہوئے جملے یہ چیزیں اسکرین پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپس کی بات چیت میں ہمیں سنجیدہ اور شائستہ رہنا چاہیئے۔

قاسم سیٹھ۔ شاید تم سمجھ رہی ہو میں جھوٹا ہوں، غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔ الفاظ کے دام میں تمہیں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

زبیدہ۔ نہیں ایسا تو نہیں ہے۔

قاسم سیٹھ۔ پھر کیا ہے؟

زبیدہ۔ آپ جس چیز کا نام لے رہے ہیں۔ مجھے اس سے کچھ وحشت سی ہوتی ہے نہ جانے کیوں؟

قاسم سیٹھ۔ محبت سے وحشت ہوتی ہے؟

زبیدہ۔ جی ہاں محبت سے۔

قاسم سیٹھ۔ آخر کیوں؟

زبیدہ۔ ابکائی آنے لگتی ہے ان باتوں سے ——— سچ،

م سیٹھ۔ عجب بات سن رہا ہوں تمہارے منہ سے ـــــ محبت کے نام
سے ابکائی آنے لگتی ہے تمہیں؟

بیدہ۔ جی ہاں، یہی بات ہے۔

م سیٹھ۔ خدا کے لئے بتا دو کیوں ہوتا ہے ایسا؟

بیدہ۔ آپ کو خود سمجھ لینا چاہیئے۔

م سیٹھ۔ مجھے اپنی ناسمجھی کا اعتراف ہے۔

بیدہ۔ حلوائی کتنی اچھی مٹھائی بناتا ہے، قطار لگ جاتی ہے دوکان
پر خریداروں کی، لیکن وہ ترچھی نظر سے بھی نہیں دیکھتا اپنی مٹھائی
کی طرف، بڑے بڑے باورچی اور رکاب دار، کیسے لذیذ کھانے
پکاتے ہیں انہیں مزا دوسروں کو کھلانے میں آتا ہے۔ خود کھانے میں
نہیں آتا

م سیٹھ۔ یہ کہاں کی داستان لے بیٹھیں تم؟ حلوائی اور رکابدار کو تمہاری ابکائی
سے کیا تعلق؟

بیدہ۔ بڑا گہرا تعلق ہے، میں بھی تو حلوائی اور رکابدار کی طرح دوسروں کو خوش کرنے
کیلئے، دوسروں کے دل میں گداز پیدا کرنے کیلئے، دوسروں کے دل کی دھڑکن
تیز کرنے کیلئے سٹیج پر محبت کا سوانگ رچاتی ہوں، ایک ایسے آدمی کو
جس سے مجھے کوئی تعلق نہیں، کوئی لگاؤ نہیں، کسی طرح ربط وضبط نہیں،
اپنی زندگی کا ہیرو بنا لیتی ہوں، اس سے محبّت کرتی ہوں اور یہ نقل
اتنی کامیابی سے کرتی ہوں کہ لوگوں کو اصل کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

میری زبان پر صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے محبت، میرے کانوں میں صرف ایک ہی لفظ پڑتا ہے محبت ۔۔۔ یہ لفظ اتنی کثرت سے میری زبان پر آچکا ہے اور میرے کانوں میں پڑ چکا ہے کہ اب اس سے نفرت ہو گئی ہے مجھے، اگر کوئی مجھ سے محبت کے بجائے نفرت کرے تو میں اس کی ممنون ہونگی، خود میرا یہ حال ہے کہ محبت کسی سے نہیں کر سکتی، نفرت جس سے کہیئے کرنے لگوں۔

قاسم سیٹھ ہنسی ضبط نہ کر سکے، فلک شگاف قہقہہ لگایا، ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔ پھر فرمایا۔

"سبحان اللہ کیا بات فرمائی ہے۔ کسی ماہر نفسیات کے پاس جاکر تمہارا علاج کرانا پڑیگا۔

زبیدہ نے بڑی آمادگی اور مستعدی سے کہا۔

"ضرور ضرور بڑے شوق سے چلوں گی۔

قاسم سیٹھ ابھی کوئی جواب نہ دے پائے تھے کہ کان میں ایک نغمۂ شیریں گونجا۔

"سیٹھ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

سیٹھ نے نظر اٹھائی تو نجمہ کھڑی مسکرا رہی تھی، کھڑے ہو گئے جوشِ مسرت میں، ارشاد فرمایا

"بھئی خوب آگئیں تم اس وقت، ذرا ان کی تو سنو، یہ کیا فرما رہی ہیں، مس زبیدہ"

زبیدہ نے ذرا سختی اور کسی حد تک اپنایت کے لب و لہجہ میں سیٹھ صاحب کو ٹوکا۔

"نہیں سیٹھ صاحب، ہماری آپ کی باتیں ہمیں آپ تک محدود رہنی چاہئیں، اور یہ شیطان کی خالہ جو ہے اسے تو میں کسی طرح بیچ میں نہیں لانا چاہتی، یہ تو لاؤڈ اسپیکر ہے ــــــ خدا کی پناہ!"

قاسم سیٹھ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا، نجمہ نے کہا۔

"مجھے کیا پڑی ہے کسی کے بیچ میں آنے کی، ـ نہ میرے پاس اتنا فاضل وقت ہے کہ دوسروں کی ٹوہ میں رہوں، میں تو اس وقت ایک خاص کام سے آئی ہوں۔"

قاسم سیٹھ۔ خاص کام مجھ سے؟

نجمہ۔ جی نہیں، زبیدہ بیگم سے۔

زبیدہ۔ خدا خیر کرے، کیا ہے آپ کا وہ خاص کام؟

نجمہ۔ کچھ یاد ہے کیا وعدہ کیا تھا تم نے؟

زبیدہ۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔

نجمہ۔ آج شام کا کھانا تمہیں میرے ساتھ کھانا تھا۔

زبیدہ۔ ہاں یاد آگیا، لیکن قاسم سیٹھ جو بیٹھے ہیں، انہیں چھوڑ کر کیسے چلی آتی؟

قاسم سیٹھ۔ واہ یہ کیا بات ہوئی، ہم بھی چلتے۔

نجمہ۔ تو پھر چلئے، نیکی اور پوچھ پوچھ۔

ضرور چلیں گے، چلو، لیکن کیا پکایا ہے؟

یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم،

قاسم سیٹھ ہنسنے لگے۔ "اچھی دعوت ہے، کیا کھلاؤ گی یہ نہیں معلوم لیکن اسرار ہو رہا ہے کہ ہمارے ساتھ چلو!

اتنے ہی زبیدہ تیار ہو گئی، اس نے کہا، "چلو نجمہ —— آئیے سیٹھ صاحب آج بھوک بہت لگی ہے! جو کچھ بھی ہوگا مزے کا معلوم ہوگا۔"

(۵۲)
آگ

قاسم سیٹھ خوش خوش زبیدہ کے ساتھ نجمہ کے گھر پہنچے، یہاں ہرمز جی اور مسٹر دہنا استقبال کے لئے موجود تھے، ان دونوں کو دیکھ کر سیٹھ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ لیکن بہت جلد اس کیفیت پر وہ غالب آ گئے، خوش اخلاقی کے ساتھ ہرمز جی اور دہنا صاحب سے ہاتھ ملایا اور ایک صوفے پر دراز ہو کر سگریٹ پر سگریٹ پینے لگے۔ زبیدہ نے نجمہ سے پوچھا،

"رعنا نہیں آئی اب تک؟" اس نے جواب دیا۔ "بس اسی کا انتظار ہے۔ قاسم سیٹھ بول پڑے۔ "نہیں بھائی انتظار کی سند نہیں۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔ جو دیر سے آئے گا خود بھگتے گا۔ ہم کیوں اپنی منزل کھوٹی کریں۔ دستر خوان بچھواؤ، زبیدہ نے نجمہ سے کہا، "تم کھانا نکلواؤ میں رعنا کو فون کرتی ہوں، ابھی آجائے گی ——!"

نجمہ کھانے کا انتظام کرنے چلی گئی، زبیدہ نجمہ کے بیڈ روم میں پہنچی اور رعنا کو فون کرنے لگی۔ معلوم ہوا وہ تو بڑی دیر کی باہر گئی ہوئی ہے۔ حیرت ہوئی کہ کہاں چلی گئی یہ سیلانی لڑکی؟ اتنے میں دیکھتی کیا ہے کہ بی رعنا تشریف لا رہی ہیں، لیکن چہرہ اترا ہوا، افسردگی اور اضمحلال کے آثار نمایاں،

زبیدہ نے بڑھ کر استقبال کیا اور بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم؟

وہ بولی۔

"ذرا کام تھا۔"

زبیدہ نے پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔

"خدا جانتا ہے تمہارے بغیر یہ محفل سونی سی لگ رہی تھی!" ـــــ

"رعنا مجھے تم سے اتنی محبت کیوں ہے بتاؤ؟"

رعنا کچھ شرمندہ سی ہو گئی، اس نے کہا۔

"صرف تمہی کو ہے؟ میں بھی تمہیں کتنا چاہتی ہوں؟"

زبیدہ۔ چل جھوٹی کہیں کی ـــــ یہ چاہیں گی، یہ! کوئی اور بھی نہیں، چاہتے ہم ہیں، محبت ہم کرتے ہیں، تو کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں؟

رعنا۔ اچھا، یہی سہی،

زبیدہ۔ خاطر اور لحاظ سے؟ ـــــ رعنا تم میری محبت کا امتحان لو۔

رعنا۔ (سوگوار تبسم کے ساتھ) اگر فیل ہو گئیں؟ مفت میں شرمندہ ہو گی، ہٹاؤ، امتحان کا نام نہ لو،

بیدہ۔ میں نجمہ کی طرح بانونی اور تمہاری طرح سیلانی نہیں ہوں، الفاظ کی قدر و قیمت سے واقف ہوں، وہی کہتی ہوں جو دل میں ہوتا ہے اور جو کچھ دل میں ہوتا ہے اس سے کم کہتی ہوں، سچ رعنا تمہیں بہت چاہتی ہوں، تمہیں خوش دیکھتی ہوں تو خود بخود میرا دل خوشی کا جھولا جھولنے لگتا ہے۔ تمہارا چہرہ افسردہ دیکھتی ہوں تو میرا دل اندر سے کوئی مسلنے لگتا ہے۔ اس وقت تمہیں افسردہ اور مضمحل دیکھ رہی ہوں، کسطرح دنیا کی ساری خوشیاں تمہارے قدموں پہ لاکر ڈال دوں؟—— بتاؤ بجھی بجھی سی، خاموش خاموش سی کیوں نظر آ رہی ہو؟

رعنا زبیدہ کی یہ باتیں سن رہی تھی اور دل ہی دل میں عجیب ناقابلِ بان کیفیتوں سے دوچار ہو رہی تھی، زبیدہ کے الفاظ کبھی شرمندہ ردیتے۔ کبھی ان باتوں سے خوش ہو جاتی، کبھی اضمحلال اور افسردگی ی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ اس وقت عجیب ذہنی کشمکش ں مبتلا تھی۔

وہ سلیم کے ہاں سے جب چلی تھی تو زبیدہ سے نفرت کرنے لگی تی، اسے اپنے راستہ کا پتھر سمجھنے لگی تھی، لیکن اس کی باتیں سن کر س کا رویہ دیکھ کر وہ اپنے اوپر ملامت کرنے لگی تھی اور خود ہی اپنے ل سے پوچھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

کیا اس زبیدہ سے میں نفرت کر سکتی ہوں جو مجھے صرف مغموم دیکھ ر بے چین ہوئی جا رہی ہے جو میرے دردِ دل سے ناواقف ہے۔ لیکن

اس کے مداوا کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔

اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں سلیم سے محبت کرتی ہوں؟۔۔۔ کیا پھر بھی اس کا رویہ یہی رہے گا۔۔۔؟ لیکن اسے یہ کیوں معلوم ہونے لگا؟ میں نجمہ کی باتوں کو بادِ ہوائی سمجھا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کی باتوں میں وزن محسوس کر رہی ہوں، اگر زبیدہ بھی سلیم کو چاہتی ہے تو کیا مجھے اس کے راستہ کا پتھر بننا چاہیئے؟ وہ میرے لئے ہر ایثار کر سکتی ہے، میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی؟

ہاں میں سلیم کو چاہتی ہوں، اس سے محبّت کرتی ہوں۔

لیکن سلیم مجھے نہیں چاہتا، زبیدہ کو چاہتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم زبیدہ بھی سلیم کو چاہتی ہے یا نہیں؟۔۔۔ لیکن اگر نجمہ کا خیال صحیح ہے اور وہ سلیم سے محبّت کرتی ہے تو کیا مجھے دو محبّت کرنے والوں کے درمیان حائل ہونا چاہیئے؟

کیا یہ محبّت ہو گی؟

کیا یہ خود غرضی نہیں ہو گی؟

نہیں ایک چیز ایسی ہے جس کا مقام محبّت سے بھی اونچا ہے وہ ہے انسانیت، انسانیت کا دامن مجھے ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

میں زبیدہ کا دل نہیں توڑ سکتی۔

سلیم کو کسی طرح بھی مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ زبیدہ کے بجائے مجھ سے محبت کرنے لگے۔ بھلا کہیں مارے باندھے بھی محبت کی جا سکتی ہے؟

نہیں ——— " محبّت کا سودا صرف رضامندی سے ہوتا ہے، اصرار، نمائش اور کنویسنگ سے نہیں ہوتا، سلیم مجھے نہیں چاہتا، چاہ بھی نہیں سکتا، میں اسے زبیدہ سے نہیں چھین سکتی، چھیننے کی کوشش بھی نہ کرنی چاہیئے۔

پھر ——— ؟ محبّت جسمانی قرب و اتصال کے بغیر کیا قائم نہیں رہ سکتی؟ ——— مجھے نہیں معلوم ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن میں یہ تجربہ ضرور کرونگی۔

زبیدہ حیرت سے دیکھ رہی تھی، آج رعنا کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ گم صم کیوں ہے، جو بجلی کی طرح چمکا کرتی تھی، آج اسے چپکی کیوں لگ گئی ہے؟ آخر وہ ضبط نہ کر سکی، اس نے کہا۔

"رعنا آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

رعنا مسکرائی۔

"جنوں" ———

زبیدہ نے کہا "معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"

اتنے میں نجمہ آگئی، اس نے آتے ہی حکم دیا۔ "چلو کھانا تیار ہے!"

سب لوگ کھانے کی میز پر پہنچ گئے، زبیدہ کو حیرت تھی، اتنے کم وقفہ میں اتنا اچھا اور متعدد قسم کا کھانا نجمہ کی بچی نے کیسے تیار کر لیا۔ اس کا جی چاہا نجمہ سے پوچھے، پھر یہ خیال کر کے خاموش ہو گئی کہ جھاڑ کا کانٹا بن کر پیچھے پڑ جائے گی اور دامن چھڑانا مشکل ہو جائیگا۔

کھانے کے دوران میں قاسم سیٹھ ہرمز جی اور مسٹر مہتا سے زیادہ مخاطب رہے، اس بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے دل میں ہرمز جی کے خلاف کوئی جذبہ ہے، نہ مسٹر مہتا کے خلاف۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت گاڑھی اور بہت پرانی دوستی ہے ان میں!

ہرمز جی اور مسٹر مہتا بھی بڑے اخلاق اور تپاک کا برتاؤ قاسم سیٹھ سے کر رہے تھے، نجمہ کا چہکنا بھی جاری تھا، زبیدہ بھی بیچ بیچ میں کوئی پُرلطف جملہ کہہ دیتی تھی —— ہاں ایک رعنا تھی جو خاموش تھی —— لیکن لوگ کھانے میں اور باتوں میں ایسے مصروف تھے کہ کسی نے نہ اس کے چہرے پر غور کیا، نہ اس کی خاموشی پر۔

کھانا ختم ہوا تو چائے کا، اور چائے کے ساتھ گپ کا دور شروع ہو گیا۔ اتنے میں فرامرز جی، دادر مووی ٹون کے مینیجر حیران و پریشان آتے نظر آئے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر ہرمز جی گھبرا گئے، انہوں نے کہا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

بغیر کسی تمہید کے فرامرز جی نے کہا۔ "اسٹوڈیو میں آگ لگ گئی، تمام قیمتی سامان دھڑا دھڑ جل رہا ہے، میرے خیال میں تمام تیار شدہ فلمیں بھی غارت ہو گئیں، سیٹھ صاحب جلدی چلئے۔"

یہ ایسی خبر تھی جس نے سب پر مردنی کی کیفیت طاری کر دی، سب سے پہلے ہرمز جی اٹھے، پھر مسٹر مہتا، پھر نجمہ، پھر رعنا، اور سب اپنی اپنی کاریں بیٹھ کر دادر مووی ٹون کی طرف روانہ ہو گئے، زبیدہ جب بڑھی تو قاسم سیٹھ نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ اور ہنستے ہوئے کہا۔
"دیکھا ہمارا کمال؟ —— ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، چلو اپنے گھر چلو!"
زبیدہ ہق دق سیٹھ صاحب کو دیکھنے لگی اور چپ چاپ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی!

(۵۲)

اٹل فیصلہ

قاسم سیٹھ پر اسی وقت سرخوشی کا عالم طاری تھا، وہ پیکرِ نشاط بنے جھومتے، بل کھاتے لہراتے، زبیدہ کا ہاتھ پکڑے موٹر میں آکر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور سے فرمایا۔

"دادر مووی ٹون ہوتے ہوئے مس زبیدہ کے گھر چلو!"

کار اسٹارٹ ہوئی اور ہوا سے باتیں کرتی دادر مووی ٹون کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسٹڈیو کے قریب پہنچے تو قیامت کا عالم نظر آیا، لال لال خوفناک اد بھیانک شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، دروازے، کواڑ دھنیاں، چٹاخ چٹاخ چل رہی تھیں، لوہے کے شہتیر انگارے کی طرح سرخ ہو کر پگھل رہے تھے، چھتیں گر رہی تھیں، اسٹڈیو میں کئی ہال تھے سب سے بڑے ہال کی چھت آن کی آن میں زمین پر آ رہی۔ فائر بریگیڈ والے

پوری کوشش کر رہے تھے کہ آگ پر قابو پالیں، لیکن وہ تھی کہ بھڑکتی ہی جا رہی تھی، ہر مزجی سامنے اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔

آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے

مسٹر مہتا پر نزع کا عالم طاری تھا، رعنا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ جیسے سارا خون کسی نے سونت لیا ہو، نجمہ کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا، یہ سب اسٹڈیو کے دروازے پر کھڑے بے بسی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اسٹڈیو راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ قاسم سیٹھ اس لرزہ خیز منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے زبیدہ کے گھر پہنچے اور آرام سے ایک صوفے پر دراز ہو گئے اور سگریٹ پر سگریٹ پینے لگے، زبیدہ بالکل خاموش تھی۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہو رہا تھا، کسی گہری فکر میں غرق ہے، قاسم سیٹھ نے کئی مرتبہ دردیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور سگریٹ کا کش لگانے اور اسے مسل کر پھینکنے اور دوسرا لگانے میں مصروف ہو گئے، جب کافی دیر اسی طرح گذر گئی تو خاموش نہ رہ سکے۔

"کیا سوچ رہی ہو مس زبیدہ؟"

زبیدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"سوچ رہی ہوں انسان بھی خدا کی کیسی عجیب مخلوق ہے!"

قاسم سیٹھ۔ واقعی بڑی عجیب مخلوق ہے۔

زبیدہ۔ جانور سے بھی زیادہ عجیب ——— جانور بھی آپس میں وہ سلوک نہیں کرتے جو انسان انسان سے کرتا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ چھوڑو، تم بھی کہاں کا قصہ لے بیٹھیں ——— ہرمزجی کو دیکھا تھا کیسے یتیم بنے کھڑے تھے؟

زبیدہ۔ ہاں دیکھا تھا ——— رو بھی رہے تھے۔

قاسم سیٹھ۔ رونا تو زندگی بھر کا ہے۔ روتے روتے آنسو خشک ہو جائیں گے مگر رونا نہیں تھمے گا۔

زبیدہ۔ ان کا سب کچھ غارت ہو گیا، بیچارے۔

قاسم سیٹھ۔ کیا کہا بےچارے ——— ہرمزجی بیچارہ ہے؟ اب چھٹی کا دودھ یاد آیا ہوگا دوست کو، جو کسی کا دل جلاتا ہے اسے خود بھی جلنا پڑتا ہے ——— چلے تھے تصویر بنانے، خود تصویرِ درد بن گئے۔ چلے تھے سلیم صاحب کی کہانی فلمانے خود داستانِ ماضی بن گئے۔ چلے تھے قاسم سیٹھ سے مقابلہ کرنے ایسے چت ہوئے کہ اب کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔ قاسم دوست کا دوست اور دشمن کا جانی دشمن ہے۔

زبیدہ۔ تو کیا یہ حرکت آپ کی ہے؟

قاسم سیٹھ۔ اور کس کی ہے؟ اور کس میں اتنی ہمت ہے کہ دوسروں کا گھر اس طرح پھونک کر تماشہ؟ اور ساتھ بیٹھ کر دعوت اڑائے۔

زبیدہ۔ جس بات کا میں یقین نہیں کرنا چاہتی آپ مجبور کر کے اس کا یقین دلا رہے ہیں۔

قاسم سیٹھ کیوں یقین نہیں کرنا چاہتی؟ زبیدہ، کان کھول کر سن لو، میں

نے ہرمزجی کو تباہ کر دیا، میں نے رعنا کی شہرت ختم کر دی، میں نے نجمہ کو بھوکا مارنے کا بندوبست کیا ہے، جو بھی میرے راستے میں آئیگا اسے یوں ہی تباہ ہونا پڑے گا۔ اب ایک سلیم صاحب رہ گئے ہیں۔ کل پرسوں تک ان کے بارے میں بھی سن لوگی کہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

زبیدہ۔ (برہمی کے عالم میں) سیٹھ صاحب!

قاسم سیٹھ۔ کہے جاؤ، سن رہا ہوں،

زبیدہ۔ آپ نہایت ذلیل آدمی ہیں، نہایت کمینے،

قاسم سیٹھ۔ (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) یہ کسے کہہ رہی ہو تم؟

زبیدہ۔ آپ کو، ——— میں اسے سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی آدمی اتنا نیچ ہو سکتا ہے۔

قاسم سیٹھ۔ ہاں میں نیچ ہوں بس؟

زبیدہ۔ آخر ہرمزجی نے آپ کا کیا بگاڑا تھا؟ رعنا کے آپ کیوں دشمن بن گئے۔ نجمہ سے کس قصور پر برہم ہیں؟

قاسم سیٹھ۔ یہ سب مجھے تباہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے سازش کر رہے تھے۔

زبیدہ۔ اور سلیم؟ ——— کیا وہ بھی آپ کو تباہ کرنے کی سازش کر رہا تھا؟

قاسم سیٹھ۔ اس کا نام نہ لو کم از کم تمہاری زبان سے میں اس کا نام سننا نہیں چاہتا۔ ورنہ تم سے بھی نفرت کرنے لگوں گا، اور یاد رکھو میری

نفرت بڑی خوفناک ہوتی ہے ـــــــ شیر کے پنجہ سے زیادہ خوفناک سانپ کے زہر سے زیادہ مہلک!

زبیدہ۔ کیا آپ مجھے اپنی کنیز سمجھتے ہیں، یا کیا میں آپ کی باندی ہوں؟ آپ کون ہوتے ہیں کسی کا نام لینے یا نہ لینے کے بارے میں مجھے حکم دینے والے؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، خود مختار ہوں، جو چاہوں کر سکتی ہوں، آپ میرے راستے میں آنیوالے کون؟ آپ میرے منہ پہ ہاتھ رکھنے والے کون؟

قاسم سیٹھ۔ زبیدہ، زبیدہ،

زبیدہ۔ میری شرافت اور مروت اور لحاظ سے زیادہ ناجائز فائدہ نہ اٹھایئے حد ہوتی ہے ہر بات کی، میں ہرگز اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ مجھ پہ حاکمانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

قاسم سیٹھ۔ آخر اس قدر برہم کیوں ہو؟ میں نے تمہاری تو کوئی خطا نہیں کی۔ میں نے تو دشمنوں کو زک دی ہے، ان کا گھر پھونکا ہے۔ ان کے خانۂ بے چراغ میں آگ لگائی ہے۔ تمہیں میرے دشمنوں سے ہمدردی کیوں ہے؟

زبیدہ۔ اس لئے کہ وہ میرے دشمن نہیں ہیں۔

قاسم سیٹھ۔ دوست ہیں تمہارے؟

زبیدہ۔ یقیناً

قاسم سیٹھ۔ تم میرے دشمنوں کو دوست رکھتی ہو؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟

زبیدہ۔ سچ بات۔

م سیٹھ۔ تم میری دوست نہیں، میرے دشمنوں کی دوست ہو؟

بیدہ۔ آپ جب اپنے دوست نہیں ہیں تو کوئی اور آپ کا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟

سم سیٹھ۔ زبیدہ! آج فیصلہ کا دن ہے۔

بیدہ۔ میرا بھی یہی خیال ہے —— آپ شاید غور کر رہے ہیں کہ کیا فیصلہ کریں، اور میں غور کر کے فیصلہ کر بھی چکی،

اسم سیٹھ۔ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟

زبیدہ۔ ہمارا نباہ نہیں ہو سکتا۔

اسم سیٹھ۔ یہ فیصلہ کیا ہے تم نے؟

بیدہ۔ جی ہاں، اور سن لیجئے کہ یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ اتنا ہی اٹل ہے جتنی موت۔

قاسم سیٹھ۔ شاید تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا—سن لو (بلند آواز سے) میں زندہ رہوں گا، میں تمہیں ٹھکرا دونگا۔ تمہیں بھی وہیں پہنچا دوں گا جہاں سلیم صاحب کو بھیج رہا ہوں۔

زبیدہ۔ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں، رستم و اسفندیار بھی کیا ایسے بہادر ہوں گے جیسے آپ ہیں۔ ایک عورت سے لڑنا، ایک عورت کو جبر و جور اور دہشت بلکہ غنڈہ گردی سے رام کرنے کی کوشش کرنا۔ واقعی آپ کا بہت بڑا اور بے حد قابلِ رشک کارنامہ ہے۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو ٭ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے، خدا آپ کے جاہ و جلال میں اضافہ کرے —— لیکن آب میری طبیعت بے کیف ہو رہی ہے، زیادہ دیر تک باتیں نہ کر سکوں گی۔ آپ کو اپنی فتحمندی کے باعث بڑی اچھی نیند آئے گی، جائیے گھوڑے بیچ کر سو جائیے!

زبیدہ جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی اور قاسم سیٹھ ہکا بکا کچھ دیر ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتے رہے۔ پھر نیچے اترے موٹر میں بیٹھے اور تشریف لے گئے۔

(۵۴)

تشکدہ

دادر کی آخری نکڑ پہ خداداد کالونی ہے، یہاں سے قریب ہی متعدد فلم
یوں کے اسٹڈیوز ہیں۔ انہی میں ہرمزجی کا دادر مووی ٹون بھی ہے۔ خداداد
نی کے آس پاس کے فلیٹوں میں اوسط درجہ کی آمدنی رکھنے والے فلمی
کار بود و باش رکھتے تھے۔ سیتا گنج کے ایک فلیٹ میں پرق صاحب بہنے
ے، وہ اطمینان سے بیٹھے شراب پی رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔
ں کانتا پر جو ایک ایکسٹرا گرل تھی کس طرح ڈورے ڈالیں؟ اتنے میں آس
ں کے لوگوں کی نقل و حرکت میں کچھ تیزی اور گھبراہٹ نظر آئی، ان کی چہ میگوئیوں
آواز کان میں پڑی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خاص معاملہ پر گھبراہٹ اور
یشانی کے عالم میں لوگ بات چیت کر رہے ہیں۔ پھر آگ کا لفظ سنائی دیا۔
ں سے اندازہ ہوا کہیں زوردار آگ لگی ہے۔ آدمی ذرا تجسس پسند تھے

جام کا آخری گھونٹ پیا اور باہر نکلے تو آسمان سرخ نظر آیا۔ معلوم ہوا قریب ہی کہیں زبردست آگ لگی ہے، یہ سوچ ہی رہے تھے کہ بھارت فلمز کا ایک منشی ہانپتا کانپتا نظر آیا۔ اس سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ اس نے کہا دادر مودی ٹون میں غضب کی آگ لگی ہے، دوست کا دوست، دوست اور دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے، بڑے خوش ہوئے، سائیکل پکڑی پیڈل پر زوردار پیر مارے اور کوئی پانچ منٹ میں موقع واردات پر پہنچ گئے آگ اب تک بھڑک رہی تھی، شعلے چیختے اور شور مچاتے بلند ہو رہے تھے لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا تھا، کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ والوں کو اپنا کام جاری رکھنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ پولیس کا گھیرا توڑ کر لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ سارے مجمع میں زور و شور سے یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اسٹوڈیو کے اندر کئی ایکٹر اور ایکٹرسیں موجود ہیں۔ یہ لوگ یا تو جل کر راکھ ہو چکے ہوں گے یا آگ ان کے دامن تک پہنچ چکی ہوگی اور اب بظاہر ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ کام صرف فائر بریگیڈ والے کر سکتے تھے، لیکن جب تک آگ پر بڑی حد تک قابو نہ پا لیا جاتا، اتنے لمبے چوڑے اسٹوڈیو کے آتشکدہ میں قدم رکھنا آسان تو نہ تھا۔

مجمع بڑھتا جاتا تھا، اور مجمع کے ساتھ ساتھ قیاس آرائیوں میں اضافہ ہو رہا تھا، اس سارے مجمع میں صرف ایک برقی صاحب ایسے تھے جن کی مسرت چھپائے نہیں چھپتی تھی، وہ قاسم سیٹھ سے زیادہ دادر مودی ٹون والوں سے خفا تھے جو سلیم خدا خدا کر کے بھارت فلمز سے نکلا اسے اللہ امین کر کے ہرمزجی

نے رکھ لیا اور آسمان پر پہنچا دیا اسے —— آج اس آگ میں اس کا مستقبل بھی تو جل رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک یہ ہولناک منظر دیکھنے کے بعد برنی صاحب سائیکل کا ہینڈل پکڑے، خراماں خراماں سینتا گنج کی طرف بڑھے، طبیعت پر فرحت و انبساط کا جوش تھا، سوچا، ایسی جلدی کیا ہے، ہوا کھاتے دس پندرہ منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے

ادھر سلیم کے پاس سے جب رعنا واپس گئی تو اس نے سوچا، اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ممکن ہے مس نجمہ آجائیں، یہ بھی بعید نہیں کہ ہرمز جی اور مسٹر جہنا تشریف لائیں، کس کس سے انکار کرونگا؟ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے کھسک جاؤں، یہ سوچ کر وہ اٹھا اور بس پر بیٹھ کر پریل روانہ ہو گیا۔ وہاں لکشمی ٹاکیز میں "دیوداس" کی پرانی کاپی دکھائی جا رہی ہے، سوچا اسے دیکھ لوں، ذرا جی بہل جائے گا۔ لیکن وہاں جا کر اندازہ ہوا کاپی بالکل گھسی ہوئی ہے۔ نہ کچھ سنائی دیتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے، تھوڑی دیر تک آئندہ کی امید میں ضبط کئے بیٹھا رہا، لیکن جب یقین ہو گیا، اس گھسی ہوئی اور از کار رفتہ فلم کا اگلا حصہ اور زیادہ ناقص ہے تو طبیعت جھنا گئی، اٹھا اور واپس چلا۔ بس اسٹینڈ پر قطار (کیو) لگی ہوئی تھی، کئی بسیں آئیں اور چلی گئیں۔ بڑی دیر کے بعد اس کا نمبر آیا، اور کافی کشاکش کے بعد بیٹھنے کی جگہ ملی، تھوڑی دیر میں بس دادر پہنچ گئی۔ لیکن یہاں ایک طرفہ ماجرا پیش آیا، انجن خراب ہو گیا، آخر کنڈکٹر نے اعلان کر دیا۔ حضرات دوسری بس ابھی آجائے گی، اس پہ

قسمت ازمائی کیجئے، یہ تو اب گیراج پہنچائی جائے گی۔ مسافر کمپنی کو گالیاں دیتے اور اس حسن انتظام کی داد دیتے اترے، اترتے وقت پہلے سے زیادہ کشاکش ہوئی، ہر شخص اس فکر میں تھا کہ پہلے میں اتروں تاکہ آنے والی بس میں میرا حق فائق ہو۔ سلیم سب سے آخر میں اترا اور اسٹینڈ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں ادھر سے برق صاحب وادر مودی ٹون سے آتے ہوئے گذرے، سلیم نے تو کوئی التفات نہیں کیا، لیکن برق صاحب بھلا خوشخبری سنانے کے لئے اسے کیسے منتخب نہ کرتے؟ لپک کر آئے ہاتھ پکڑ کر اسے قطار سے کھینچا اور فرمایا۔

"سلیم صاحب! کچھ بسنت کی خبر بھی ہے۔"

سلیم نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔"

برق نے کہا۔

"غضب ہو گیا۔"

سلیم نے جواب دیا۔ "ہو گیا ہوگا۔"

برق نے چمک کر کہا۔

"اف —— خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔"

سلیم نے کہا۔

"جی ہاں پنہاں ہو کر لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہو گئیں۔"

برق۔ حضورِ والا، میرا تو کلیجہ منہ کو آرہا ہے،
سلیم۔ پھر اپنے مقام پر واپس چلا جائے گا۔
برق۔ شاید آپ کا خیال ہے میں مذاق کر رہا ہوں۔
سلیم۔ مذاق کرنے کا مذاق ہی نہیں رکھتے آپ، یہ جانتا ہوں۔
برق۔ یا اللہ کس طرح سمجھاؤں آپ کو؟ ——— دے اور دل ان کو جو
نہ دے مجھ کو زباں اور، ——— اجی جناب سلیم صاحب دادر
مودی ٹون میں آگ لگ گئی ہے۔
سلیم۔ (سنجیدہ ہوکر) آگ لگ گئی؟
برق۔ جی ہاں،
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں نے آتش زدگی کا ایسا ہولناک حادثہ زندگی بھر میں نہیں دیکھا۔
اتنا بڑا اسٹڈیو آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر بن گیا۔
سلیم۔ یہ تو بڑی بُری خبر سنائی آپ نے
برق۔ لیکن آپ تو مذاق سمجھ رہے تھے۔
سلیم۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ کے پُربہار جملوں میں خزاں کے انگارے
سلگ رہے ہیں۔
برق۔ کچھ بھی نہ بچا، سب کچھ جل گیا، راکھ ہوگیا سب کچھ۔
سلیم۔ خدا رحم کرے بے چارے ہرمزجی پر۔
برق۔ ہاں اب تو یہی دعا کی جاسکتی ہے ان کے اور ان کے متعلقین کیلئے

سلیم۔ لیکن وہ باہمت آدمی ہیں جلد ہی نقصان کی تلافی کرلیں گے۔
برق۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ سلیم صاحب، جہنم سے آکر تلافی کریں گے۔
سلیم۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ
برق۔ ہاں میرا مطلب یہی ہے کہ وہ بھی گئے۔ سنا ہے، کہ بہت ایکٹر اور ایکٹرسیں جل گئیں۔
سلیم۔ نہیں ایسا نہیں ہوا ہوگا آج کوئی شوٹنگ تھی کیا؟
برق۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ آج وہاں کوئی پرلطف اجتماع تھا۔
سلیم۔ ہاں دعوت کی تھی مس نجمہ نے —— لیکن کیا اپنے گھر کی بجائے اسٹڈیو میں کی تھی؟
برق۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ دعوت کا حال تو مجھے معلوم بھی نہیں، یہ جانتا ہوں اندر کئی ستارے پھنسے ہوئے ہیں۔ فائر بریگیڈ والے انہیں نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مجمع اتنا زیادہ ہے کہ اندر جانے کی اب تک کوئی صورت نہیں نکل سکی —— میں وہیں سے آرہا ہوں۔
سلیم۔ کیا واقعی لوگ اندر پھنسے ہوئے ہیں؟
برق۔ ہاں بھئی ساری خلقت یہی کہہ رہی ہے۔
سلیم۔ یقیناً نجمہ نے دعوت وہیں کی ہوگی۔
برق۔ ممکن ہے —— کئی شاندار موٹریں تو میرے سامنے جلی ہیں۔ اور یقیناً وہ اونچے درجہ کے لوگوں ہی کی ہوسکتی ہیں، ہماشما کو ایسی موٹریں

کہاں نصیب؟

۔ کیا جلنے والی موٹروں میں کسی کا رنگ لال بھی تھا۔

۔ ضرور تھا، وہاں تو اس وقت ہر موٹر لال ہی نظر آرہی تھی آگ کے شعلوں میں۔

۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ مس زبیدہ بھی وہیں ہوں گی،

۔ تو پھر ان پر بھی فاتحہ پڑھ لیجئے، ہا، بے چاری کی ابھی عمر ہی کیا تھی؟

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

۔ (بے خودی کے عالم میں) وہ بھی تو مدعو تھیں اس دعوت میں۔

۔ جی ہاں ضرور ہوں گی، بھلا ان کے بغیر کوئی دعوت مکمل ہوسکتی ہے

افسوس دعوت میں بیٹھے بیٹھے خود لقمۂ اجل بن گئیں

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سلیم صاحب مجھے افسوس ہے، مس زبیدہ کا برتاؤ گو میرے ساتھ اچھا نہ تھا اور میں بھی ان کی بے رخی کے باعث انہیں کچھ زیادہ پسند نہ کرتا تھا لیکن یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ اس بے بسی کے ساتھ اس عالم ناپائیدار سے رختِ سفر باندھیں۔

سلیم نے ایک مرتبہ گھور کر برق کو دیکھا اور چیخ کر کہا۔

"خاموش!"

اور قبل اس کے کہ برق اس طرزِ عمل کو سمجھ سکے ایک زوردار چانٹا اس

کے گال پہ پڑا، بچپن میں اس نے بارہا، استادوں، رشتہ داروں، اور ساتھیوں کے بھرپور چانٹے کھائے تھے لیکن ایسا قیامت کا چانٹا، آج زندگی میں پہلی بار میسّر ہوا تھا، بے چارا بلبلا گیا، لیکن سلیم کے چہرہ پہ اس وقت ایسی کیفیت طاری تھی کہ وہ سہم گیا، اس نے کچھ نہ کہا۔ دم دبا کر آگے بڑھ گیا۔

---

(۵۵)

عشق — بے خطر آگ میں کود پڑا

زبیدہ تجمہ کی دعوت سے فارغ ہو کر، اور آگ کی خبر سن کر، اور دادر مودی ٹون کا ایک طائرانہ نظارہ کر کے واپس گھر آئی تو قاسم سلیجھ سے لڑائی ہو گئی۔ پھر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آئی، یہ سوچ کر لیٹ گئی کہ اسلم اور رقیہ حسب معمول اپنے وقت پر سو چکے ہوں گے سکینہ بوا کے بارے میں بھی اس نے یہی سوچا کہ نماز اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہوں گی

لیکن واقعہ یہ نہیں تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ کھانے کے بعد سکینہ نے اسلم اور رقیہ کو بستر پر لٹایا اور کہانی سنانے لگیں، ذرا دیر میں اسلم سو گیا لیکن رقیہ جاگتی رہی اور سنتی رہی پھر اسے گڑیا یاد آگئی جو آج ہی آئی تھی، وہ ہمک کر اٹھی، سکینہ بوا نے ٹوکا

بیٹی کہاں؟" وہ بولی۔ "گڑیا لادوں گی، اپنے ساتھ سلاؤں گی اسے" یہ کہہ کر وہ دھم سے بستر سے اتری، پاؤں رپٹا، پختہ فرش پر گر پڑی اور رونے لگی۔ گریۂ بے اختیار اور پھر رقیہ کا۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اسکے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

سکینہ بوا بیچاری گھبرا گئیں، بہت بہلایا، بہت پھسلایا، پیار کیا، دوسری گڑیا لادینے کا وعدہ کیا، اپنے بٹوہ سے دس کا نوٹ نکال کر دے دیا، لیکن رقیہ کے آنسو نہ تھمے۔ اس کا رونا نہ رکا، اسے جب بھی کوئی تکلیف ہوتی تو ساری دنیا سے بیزار و متنفر ہو کر صرف ایک ہی دامن میں سکون و آرام محسوس کرتی تھی اور وہ دامن تھا زبیدہ کا ——— چنانچہ آپا یعنی زبیدہ کا ترانہ اس کی زبان پر جاری ہو گیا، بس ایک ہی رٹ تھی۔

"میں تو آپا کے پاس جاؤں گی، جہاں وہ گئی ہیں مجھے بھی لے چلو۔"

آخر سکینہ بوا جب ہر تدبیر میں ناکام ہو گئیں تو نعیمہ کو جو ابھی چھوکری تھی، اور صرف اسی لیے ملازم تھی کہ اسلم اور رقیہ کے ساتھ کھیلا کرے، اسلم کے پاس بٹھایا اور خود رقیہ کو لے کر نجمہ کے ہاں جانے کے ارادہ سے باہر آئیں۔ یہاں نہ ڈرائیور تھا نہ موٹر، وہ تو زبیدہ کی اردلی میں تھا اب کیا کریں ——— کمپاؤنڈ سے باہر آئیں اور رقیہ کے ستم سہتی رہیں۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد ایک وکٹوریہ آئی، اسے روکا اور نجمہ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوئیں، وکٹوریہ کا گھوڑا لاکھ تازہ دم اور صبا رفتار ہو لیکن موٹر کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا، جلدی

پہنچیں، پھر بھی کافی دیر لگ گئی۔ یہاں آکر معلوم ہوا، داؤد موودی ٹون میں آگ لگ گئی ہے اور سب لوگ وہیں ہیں۔

یہ سن کر ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، اسی وکٹوریہ پر بیٹھ کر روتی اور ضد کرتی، رقیہ کو سنبھالتی وادر پہنچیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ سلیم صاحب برق کو چانٹا مار کے یہاں آئے تھے۔ اور تماشائیوں سے دریافتِ احوال کر رہے تھے، اتنے میں انہوں نے وکٹوریہ آتے دیکھی اور اس میں سکینہ کو اور اس کے ساتھ ساتھ رقیہ کو اترتے دیکھا لپک کر سکینہ کے پاس پہنچے، دریافت کیا۔

"آپ یہاں کیوں آئیں؟ —— یہ رقیہ آپ کے ساتھ کیوں ہے؟ —— مس زبیدہ کہاں ہیں؟"

سکینہ بوا کو اگرچہ پیدل نہیں چلنا پڑا تھا، لیکن رقیہ کو سنبھالتے سنبھالتے ان کا سانس پھول گیا، اختصار ہی میں عافیت نظر آئی۔ پہلے دو سوالوں کو نظر انداز کر کے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اسی کو تو ڈھونڈنے آئی ہوں بیٹے۔"

سلیم۔ کیا وہ گھر نہیں پہنچیں؟

سکینہ۔ نہیں —— نہیں پہنچی میرے بچے۔

سلیم۔ ممکن ہے اب پہنچ گئی ہوں۔

سکینہ۔ نجمہ کے ہاں معلوم ہوا، سب لوگ یہاں ہیں۔

سلیم۔ کیا وہ یہاں آئی تھیں؟

ہاں بیٹے سب لوگ یہیں آئے تھے ـــــ لیکن یہاں آئے تھے تو کیا ہوئے ؟ ـــــ کہاں گئے ؟ کہیں اندر تو نہیں رہ گئے ـــــ ؟ ہائے میری بچی !

یہ کہہ کر سکینہ بوا سینہ کوٹنے لگیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں، رقیہ پہلے ہی رو رہی تھی یہ دلگداز منظر دیکھ کر اور سکینہ کو روتا دیکھ کر اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری آپا کہاں ہیں بتاؤ ؟"

مجمع میں سے ایک آدمی قریب آیا، اس نے پوچھا۔

"بڑی بی کیوں روتی ہو، صبر کرو !"

سکینہ نے چیخ کر کہا۔

"صبر کر دوں ؟ ـــــ صبر کیوں کر دوں ؟"

وہ بولا۔

"خدا کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے، کمپاؤنڈ کے اندر کوئی جا نہیں سکتا، اندر جو لوگ ہیں وہ یا تو جل چکے ہوں گے یا جل رہے ہوں گے۔ اب ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ؟ بالکل نہیں !"

سکینہ نے روتے ہوتے کہا۔

"ایسا نہ کہو میرے بیٹے، میں مٹ جاؤں گی، یہ چھوٹا سا خاندان برباد ہو جائے گا، یہ بچی رو رو کر جان دے دے گی۔"

اس آدمی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن بڑی بی دیکھو تو شعلے کتنے اونچے ہیں، اتنی دیر سے بجھائے جا

رہے ہیں، لیکن کسی طرح قابو میں نہیں آتنے، فائر بریگیڈ والے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں بے چارے، لیکن کسی کو بچانے کے لئے جان بوجھ کر تو آگ میں نہیں کود سکتے!

سکینہ نے ایک آہ بھری اور بڑے دل دوز لہجے میں کہا۔

"تو کیا میری بچی اسی میں ہے؟"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"پھر اور کہاں جا سکتی ہیں؟"

سکینہ نے پوچھا

"تمہیں کیسے معلوم؟"

وہ جواب میں گویا ہوا،

کئی ایکٹر اور ایکٹریسیں اسٹڈیو کے اندر پھنسے ہیں، کون جانے زندہ ہیں یا جنت میں پہنچ گئے ——"

ایک آدمی جو پاس کھڑا ہوا تھا، بولا۔

"چیخیں تو آ رہی تھیں ابھی ذرا دیر پہلے تک۔"

سکینہ نے کلیجہ پر ہاتھ رکھ لیا اور پوچھا۔

"چیخیں؟ —— کیا ان میں میری شہزادی، میری جان، میری بچی کی چیخ بھی تھی؟"

اسی آدمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"ہم کیا جانیں؟ —— ماں، غم نہ کرو۔"

ایک اور قریب کھڑے ہوئے آدمی نے کہا۔

"ذرا آگ کے شعلے قابو میں آجائیں تو فائر بریگیڈ والے سارا اسٹڈیو کھنگال ڈالیں گے، جو کچھ گذری ہے معلوم ہو جائیگی۔"

سکینہ نے کہا، لیکن اس وقت تک تو سب کا کام تمام ہو چکا ہوگا۔ ہائے کوئی ایسا نہیں ہے جو اندر جا سکے، خبر لا سکے، میری بچی کو بچا سکے؟

وہ آدمی ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔

"ہاں، —— اس حالت میں کوئی نہیں جا سکتا،"

سکینہ نے رشوت پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں دس ہزار روپیہ دوں گی، پندرہ ہزار دوں گی، بیس ہزار دوں گی، ایک لاکھ ——

اس آدمی نے خلوص اور ہمدردی سے سکینہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" ایک لاکھ روپیہ بھی بے کار ہے - ایک کروڑ کی بھی کوئی قیمت نہیں۔"

ایک دوسرے آدمی نے کہا۔

اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جب کہ موت سامنے کھڑی ہو، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

سکینہ مایوس ہوگئی۔

ہاں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا! میری بچی کو کوئی نہیں بچا سکتا جسے پھولوں کی سیج پر آرام نہ ملتا تھا وہ دہکتے ہوئے انگاروں اور لپکتے ہوئے شعلوں کا لقمہ بن رہی ہے، کوئی اسے نہیں بچا سکتا۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔"

رقیہ کی سمجھ میں رفتہ رفتہ ساری بات آگئی، اس نے سکینہ سے کہا۔
"آپا آگ میں گھر گئی ہیں اور تم یہاں باتیں کر رہی ہو۔"
سکینہ نے کہا۔
"بیٹی تو پھر کیا کروں؟ تو میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں خود کود پڑتی آگ کے شعلوں میں۔"
رقیہ نے کہا۔
"نہیں، تم بوڑھی ہو، جل جاؤ گی، میں جاتی ہوں۔ آپا کو ڈھونڈ نکالوں گی، لے آؤں گی اپنے ساتھ۔"
اور قبل اس کے کہ سکینہ جواب دے رقیہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف لپکی، لیکن اس ننھی سی بچّی کی بساط ہی کیا تھی۔ کئی لوگوں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ پولیس والے بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ رقیہ کو قابو میں کرنے کے بعد سکینہ کی نظر جو اٹھی تو سلیم بھڑکتے ہوئے شعلوں کو نانگتا پھلانگتا اسٹڈیو کے احاطہ میں داخل ہو چکا تھا۔ لوگوں نے بہت غل مچایا، روکا، لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ سکینہ دم بخود کھڑی تھی۔ فائر بریگیڈ والے سب کام چھوڑ کر اسی طرف لپکے۔

کی طرح رقیہ کو سنبھالا اور وکٹوریہ میں بیٹھ کر اپنی دولت سرا پہنچیں، برآمدہ میں ڈرائیور یوسف خاں سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ سکینہ اور رقیہ کو اس وقت باہر سے آتا دیکھ کر چونکا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں سے آرہی ہو سکینہ بوا؟"

یوسف خاں کی آواز سن کر سکینہ بوا کی جان میں جان آئی۔ پوچھا۔

"میری بچی کہاں ہے زبیدہ؟"

یوسف خاں نے ایک زوردار کش لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو سو بھی چکیں!"

سکینہ کی ساری محنت ان الفاظ نے سوارت کر دی، جوشِ مسرت کے باعث آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئیں، پھر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

"شکر ہے تیرا اے پاک پروردگار بے نیاز میں تو سمجھتی تھی میری بچی آگ میں جھلس گئی ہے۔ تو نے مجھ بڑھیا کی سن لی۔ کس منہ سے تیرا شکر ادا کروں؟"

یوسف خاں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا جب وہ دعا سے فارغ ہوئیں تو اس نے پوچھا۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

سکینہ نے اپنی رام کہانی سنائی، یوسف غور سے سنتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم بھی عجیب ہو۔ دعوت نجمہ بیگم کے ہاں تھی اور پہنچ گئیں دادر مودی ٹون

(۵۶)

گھر پہ

کمپاؤنڈ میں پہنچنے کے بعد سلیم نے آواز دی۔

"زبیدہ میں آگیا۔ تم کہاں ہو، میں تمہیں بچاؤں گا، آواز دو بتاؤ کدھر ہو تم؟"

لیکن جواب میں زبیدہ کی آواز نہیں سنائی دی، ہاں بھڑکتے ہوئے شعلے گرمجوشی کے ساتھ اس تازہ وارد مسافر کے خیر مقدم کے لئے بڑھے اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سلیم آگ کی تپش اور دھوئیں کی گھٹن کا مقابلہ نہ کر سکا۔ عوام کے اکسانے اور پولیس کی شہ سے فائر بریگیڈ والے اس کے پیچھے دوڑے وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا، چند ہی قدم چل پایا تھا کہ آگ نے جھلس دیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ایمبولینس کار موجود ہی تھی فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس حادثہ نے سکینہ کے دل پہ بڑا گہرا اثر کیا۔ انہوں نے ایک قیمتی پونجی

سکینہ کو غصّہ آگیا۔

اے چل مردوے، کیا میں وہاں سینما دیکھنے گئی تھی؟ لو اور سنو ہم تو اس بڑھاپے میں در در کی خاک چھانتے پھریں اور یہ موا مسٹنڈا ہم پر اعتراض کر رہا ہے۔"

یوسف مسکرانے لگا،

"بوا تم سٹھیا گئی ہو۔ اوّل تو نجمہ بیگم کے ہاں جانے کی کیا ضرورت تھی اور گئی تھیں تو دادر موڈی ٹون کا سفر کیوں کیا تھا؟ اور وہاں بھی گئی تھیں تو یہ کیوں سوچا کہ ہماری بیگم صاحبہ وہاں گئی ہوں گی اور بیوقوفی سے یہ بھی سوچا تھا تو یہ خیال کیوں آیا کہ وہ اندر ہوں گی اور جل رہی ہوں گی؟"

اب تو سکینہ کا پارہ اور چڑھ گیا، یوسف کی باتوں سے وہ پہلے ہی کیا کم نالاں اور بیزار تھیں۔ ان باتوں نے تو اور زیادہ چراغ پا کر دیا۔

کہہ تو رہی ہوں کہ نجمہ کے ہاں جو نیری ساس (نجمہ کی ملازمہ) بیٹھی تھی اس نے بتایا تھا۔ سب لوگ وہیں ہیں جہاں آگ لگی ہے۔ وہ خود بھی گھبرائی ہوئی تھی اور رو رہی تھی۔ میں سمجھی دعوت وہیں ہو گی، ورنہ اس وقت وہاں ہونے کے کیا معنی؟ بھاگوں بھاگ پہنچی تو لوگوں کو بھی چہ می گوئیاں کرتے پایا کہ اندر لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ میں سمجھی میری بچی بھی، ان ہی لوگوں میں ہو گی۔"

یوسف نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

بڑی آئیں بچی والی۔ مفت میں ایک نیک آدمی بیچارے سلیم صاحب

کو آگ میں جھونک آئیں، نہ جانے خدا کو کیا جواب دوگی

سکینہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک دو ہتڑ یوسف کی پیٹھ پر لگا یا۔

"چپ حرام خور۔"

وہ ہنسنے لگا، کہنے لگا، "دیکھنے میں تو بڑھیا ہو، لیکن ہاتھوں میں وہ کس بل ہے کہ پیٹھ میں درد ہونے لگا۔"

سکینہ بوا یوسف کی اس تحسین سے خوش ہوئیں، مسکرائیں اور کہنے لگیں۔

"بڑا حرام زادہ ہے تو۔"

یوسف نے کہا۔

"میں تو تمہیں کو اپنی ماں سمجھتا ہوں، تم جانو ـــــ سچ ہی کہتی ہوگی!"

اب تو سکینہ بوا کو ہنسی آگئی۔ پوپلے منہ سے ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"کچھ شامت آئی ہے تیری چپ ہوگا یا نکالوں جوتی پاؤں سے۔"

یوسف پرے ہٹ گیا۔

"بابا جوتی نہ نکالو، چپ ہوا جاتا ہوں!"

اسی طوفانی تکلم میں رقیہ سو چکی تھی۔ سکینہ بوا تھک چکی تھیں، بیچاری میں اتنی سکت نہ تھی کہ اسے گود میں لئے لئے اوپر چڑھتیں، آخر یوسف کی خطا معاف کرنی پڑی اور اس سے مدد طلب کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ بڑے محبت بھرے لہجے میں ارشاد فرمایا۔

"بیٹے یوسف!"

یوسف سمجھ گیا، کوئی خدمت لینا چاہتی ہیں، اکڑ گیا۔

"مجھے نیند آرہی ہے نیند، تمباکو چاہیے ہوگی تمہیں، لیکن اب کوئی دکان کھولے بیٹھا ہوگا تمہارے انتظار میں؟"

مفاہمت آمیز لہجہ میں فرمایا۔

"نہیں بیٹے، تمباکو ادل تو ہے، نہ بھی ہوتی نواب آدھی رات کو کیا کرتی منگوا کر۔ ذرا اتنا کام کر یہ رقیہ سو گئی ہے۔"

یوسف نے جملہ پورا کر دیا۔

"اسے گود میں لے کر اوپر پہنچا آؤں؟"

سکینہ بوا نے تائید کی۔

"ہاں بیٹے، بس اتنا سا کام کر دے پھر آرام سے سو جا۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن بوا، میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے۔ ورنہ رقیہ کیا تمہیں بھی گود میں لے کر ایک منٹ میں اوپر پہنچا آتا۔"

پھر غصہ آگیا سکینہ بوا کو، وہ کوئی غیر مہذب گالی دینے ہی والی تھیں کہ یوسف نے رقیہ کو ان کی گود سے لیا اور ایک منٹ میں پہنچا کر واپس آگیا۔ وہ بیچاری ابھی مشکل سے چار سیڑھیاں چڑھنے پائی تھیں۔

---

(۵۷)

پردہ اُٹھ گیا

صبح زبیدہ کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ طبیعت کچھ بے کیف سی تھی۔ رات کو قاسم سیٹھ سے جو جنگ ہوئی تھی، وہ یاد آرہی تھی۔ ہر مزجی کی تباہی اور بربادی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ رعنا اور نجمہ کی پریشانی اور بے کلی یاد آرہی تھی، دادر موودی ٹون کے خوفناک اور ہولناک شعلے یاد آرہے تھے۔ قاسم سیٹھ کا فتحمندانہ تبسّم یاد آرہا تھا۔۔ اور قاسم سیٹھ کی وہ دھمکی یاد آرہی تھی جو انہوں نے اسے دی تھی اور سلیم یاد آرہا تھا جس کی جان لینے کا وہ تہیّہ کر چکے تھے، وہ سوچ رہی تھی اس درندے کے چنگل سے سلیم کو کیسے بچایا جائے؟ اتنے میں رقیہ آئی اس نے بہن کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مچلتے ہوئے کہا۔

"ارے تم تو یہاں ہو؟"

زبیدہ نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا
"تو میں آخر کہاں گئی تھی؟"
رقیہ بولی۔
"ہم تو تمہیں ڈھونڈنے نجمہ باجی کے وہاں گئے تھے۔ وہاں سے وادر گئے، جہاں آگ لگی تھی، یہ بڑے بڑے شعلے۔"
زبیدہ۔ ارے تو وہاں گئی تھی؟
رقیہ۔ ہاں آپا وہیں تو گئی تھی تلاش کرنے،
زبیدہ۔ کس کے ساتھ؟
رقیہ۔ سکینہ بوا کے ساتھ، وہاں جاکر وہ رونے لگیں، مجھے بھی رونا آگیا۔
زبیدہ۔ تم تو ہمیشہ کی رونکھی ہو۔
رقیہ۔ سکینہ بوا کہنے لگیں، رقیہ ساتھ نہ ہوتی تو میں آگ میں سے نکال لاتی اپنی بچی کو۔ پھر میں نے کہا، میں نکالے لاتی ہوں۔ مجھے پولیس والوں نے پکڑ لیا——— پھر کیا ہوا، پھر وہ ہمارے ماسٹر سلیم صاحب ہیں نا!
زبیدہ۔ ہاں ہیں، پھر کیا وہ آگ میں کود پڑے مجھے نکال لانے کیلئے؟
رقیہ۔ ہاں آپا، کسی سے بولے نہ چالے، چپ چاپ کھڑے میری اور سکینہ بوا کی باتیں سنتے رہے، پھر آگ میں گھس گئے، لوگ چیخ چیخ کر منع کرتے رہے مگر انہوں نے کسی کی نہیں سنی۔
زبیدہ۔ رقیہ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟

رقیہ۔ آپا میں جھوٹ نہیں کہتی، وہاں جا کر کہنے لگے، میں آ گیا زبیدہ،
تم کہاں ہو، آواز دو، بتاؤ میں تمہیں آگ کے شعلوں سے بچا لونگا۔

زبیدہ۔ (روتے ہوئے) رقیہ ——

رقیہ۔ ہاں آپا سچ —— پھر وہ گر پڑے۔

زبیدہ۔ وہ آگ میں گر پڑے؟

رقیہ۔ آپا تم مانتی ہی نہیں کسی طرح، کہہ تو رہی ہوں آگ میں گم پڑے۔

زبیدہ کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اس کا بدن سنسنانے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے یہ کمرہ گھوم رہا ہے، اس کمرہ کی ہر چیز گھوم رہی ہے۔ ساری دنیا گھوم رہی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے لرزتی اور کانپتی اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پھر کیا ہوا، کیا وہ مر گئے؟

رقیہ نے بتایا۔

"معلوم نہیں —— آگ بجھانے والے لوگ جلدی جلدی وہاں پہنچے اور ہاتھوں پر اٹھا لائے اور ایک بڑی سی گاڑی میں رکھ کہیں لے گئے۔ کہہ رہے تھے۔ ہسپتال لئے جا رہے ہیں۔"

زبیدہ کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ اس نے اکھڑے ہوئے الفاظ میں کہا۔

"رقیہ میں بے ہوش ہو رہی ہوں مجھے پانی پلاؤ جلدی سے۔"

رقیہ نے جواب دیا۔

"آپا میں ابھی پانی لاتی ہوں بیہوش نہ ہو جانا۔"

پھر وہ دوڑی دوڑی گئی۔ کسی نوکر یا ملازمہ سے کچھ کہے بغیر خود ہی گھڑے سے پانی انڈیلنے لگی۔ سکینہ بوا کو صفائی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں لیکن رقیہ کو باہر سے آنے اور گھڑے سے پانی انڈیلتے دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں، وہیں سے للکارا،

ہاں، ہاں، ہاں ——

لیکن رقیہ کیا سنتی تھی، اس نے پانی انڈیلا اور لے کر بھاگی یہ کہتی ہوئی۔

"آپا بیہوش ہوئی جا رہی ہیں۔"

---

(۵۸)

تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

سکینہ نے دعا نامکمل چھوڑی اور بھاگم بھاگ زبیدہ کے کمرہ میں پہنچی لیکن وہ بیہوش ہو چکی تھی، دانت بیٹھے ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سکینہ نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ گھر کے تمام نوکر چاکر دوڑ پڑے، یوسف نے ڈاکٹر جمشید اور ڈاکٹر مسانی کو فون کیا۔ چند ہی منٹ میں دونوں تشریف لے آئے۔ بڑی توجہ اور احتیاط سے معائنہ کیا اور کہا۔

"جان کا تو خطرہ نہیں ہے البتہ کوئی غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے حالت کافی تشویش انگیز ہے، دو تین روز تک بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کوئی ان سے ملنے نہ پائے، نہ یہ کسی سے بات چیت کریں اور ایسی تو کوئی بات نہ ہونے پائے جس سے غصہ آئے یا صدمہ پہنچے۔ شور و غل بالکل نہ ہو، تیمارداری کے لئے ان کے پاس جو آدمی بیٹھے وہ ایسا ہو جو دلخوش کن باتیں کرے، انہیں خوش رکھے۔

پھر ڈاکٹر مسانی نے انجکشن لگایا، ڈاکٹر جمشید نے ایک نسخہ لکھا، فیس لی اور رخصت ہو گئے۔

صبح کے اخبارات میں دادر موودی لوٹن کی آتش زدگی کا واقعہ تفصیل کے ساتھ شائع ہو چکا تھا، رعنا اور نجمہ نے سلیم کا واقعہ پڑھا تو زمین پاؤں تلے سے نکل گئی، دونوں سیدھی ہسپتال پہنچیں، وہاں ہرمز جی اور مسٹر نیتا موجود تھے۔ ہرمز جی نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور انہیں آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا، اندر جانے کی اجازت نہیں ڈاکٹروں کا سخت تاکیدی حکم ہے۔"

رعنا وہیں رک گئی، اس نے پوچھا۔

"لیکن یہ تو بتلایئے، حالت کیسی ہے؟ کیا بچ جائیں گے

ہرمز جی نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر امید تو دلاتے ہیں لیکن ابھی تک ہوش نہیں آیا اور جب تک ہوش نہ آجائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

رعنا کی آنکھوں میں آنسو کے موتی ٹپکنے لگے۔

"کیا بہت نازک حالت ہے؟"

ہرمز جی نے صفائی کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھئی وہ تو ہستی ہے، لوہے کا آدمی بھی آگ کے شعلوں میں چند منٹ کے اندر پگھل جائے گا۔ یہ تو گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی تھا۔ سارا بدن جھلس گیا۔"

رعنا کی آنکھیں اب تک آنسوؤں سے لبالب تھیں اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ کیا ہو گیا سیٹھ جی، کیا سلیم کی جان کسی طرح نہیں بچائی جا سکتی؟"

ہرمزجی نے متجسسانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ تامل کے بعد فرمایا۔

"شاید بچ تو سکتی ہے، لیکن اس کا فیصلہ چند گھنٹوں کے بعد ہو سکے گا۔"

نجمہ نے دریافت کیا۔

"آخر یہ پہنچ کس طرح گئے وہاں؟ عجیب انہونی سی بات ہے؟"

مسٹر مینا نے فرمایا۔

"ہاں مس نجمہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا، یہ کیا ماجرا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس بیہوشی کے عالم میں جب بڑبڑاتے ہیں تو کہتے ہیں، "زبیدہ میں تمہیں بچا لوں گا، تم کہاں ہو؟ آواز دو زبیدہ میں آگیا۔ دیکھو میں یہاں ہوں، تم بولتی کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتیں؟" اور پھر بیہوش ہو جاتے ہیں! آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ زبیدہ کا نام کیوں ان کی زبان پر آ رہا ہے؟ زبیدہ سے انہیں کیا تعلق۔ زبیدہ کو وہ کس سے بچانا چاہتے ہیں؟ ——— عجیب راز ہے؟"

نجمہ نے واپس جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔

"راز راز تو اپنے وقت پر حل ہوتا رہے گا۔ خدا ان کی جان بچا لے ——— اور رعنا چلیں۔"

رعنا مچل گئی، "میں تو نہیں جاتی، سلیم صاحب کو دیکھ لوں گی تب چلوں گی، سیٹھ صاحب، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک جھلک ان کو دیکھ لوں، پھر فوراً چلی جاؤنگی اس طرح دل کو قرار آ جائے گا۔"

سیٹھ صاحب نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر سے پوچھ لوں تو بتاؤں۔" یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر سے پوچھنے چلے گئے۔ ذرا دیر میں واپس آئے اور فرمایا۔

"چلو!"

رعنا اور اس کے پیچھے پیچھے نجمہ اور آگے آگے ہرمزجی، یہ لوگ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچے، نرس نے بڑھ کر وہیں روک دیا۔ "بس، ایک نظر ڈال لیئے اور چلے جائیے۔"

سب نے وہیں کھڑے کھڑے، بستر پر ایک نظر ڈالی، سلیم سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جان ہی نہیں ہے! رعنا کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی لیکن اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بند کر لیا۔ اور باہر چلی گئی، نجمہ فوراً پلٹی اور اسے سہارا دیتی ہوئی کار میں لا کر ڈال دیا۔ گھر آنے کے بعد بڑی دیر تک رعنا کی حالت ڈانواں ڈول رہی۔ ڈاکٹر بلایا گیا اس نے مسکن (SADATIVE) دوائیں دیں۔ تب جا کر دو تین گھنٹے کے بعد اس کی حالت سنبھلی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن کی مریض۔

دوسرے دن رعنا ذرا ٹھیک ہوئی، نجمہ اس کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ رعنا نے کہا،

نہ جانے کیا حالت ہے ان کی ؟

نجمہ نے جواب دیا۔ "میں نے ابھی فون کیا تھا، ہوش آگیا ہے۔"

رعنا خوش ہوگئی۔ "سچ نجمہ ؟"

نجمہ نے جواب دیا، ہاں رعنا، ڈاکٹر کہہ رہا تھا اب خطرہ ٹل گیا۔ اب وہ بچ جائیں گے !"

رعنا کا مغموم چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ "واقعی ؟ —— میری تسلی کے لئے تو نہیں کہہ رہی ہو ؟"

نجمہ بولی۔ "تیرے سر کی قسم، —— ڈاکٹر سے میں نے پوچھا تھا۔ اب بڑانے تو نہیں ؟ کہنے لگا، اب بھی جب نیند میں ہوتے ہیں تو بڑاتے ہیں۔ بس زبیدہ کے نام کی رٹ لگی ہے، جاگتے ہیں تو چپ ہو جاتے ہیں کسی سوال کا جواب نہیں دیتے۔ دیکھو رعنا میں نہ کہتی تھی سلیم کو زبیدہ سے محبت ہے۔

رعنا غور سے نجمہ کی باتیں سنتی رہی، پھر اس نے کہا۔

"ہاں تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں بھی گذشتہ کچھ دنوں سے یہی محسوس کر رہی تھی، خیر وہ تو زبیدہ سے محبت کریں یا کسی سے، خدا تندرست کر دے۔"

نجمہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "اے ہے، یہ باتیں تو ایک ماں کے منہ سے زیب دیتی ہیں۔"

رعنا مسکرا دی۔ "یہی سہی، —— میں ان کی صحت کی جویا ہوں محبت کی نہیں۔"

نجمہ نے چھیڑا۔ "ہاں اور کہہ بھی کیا سکتی ہو۔ مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے !"

رعنا۔ اچھا یہی سہی، پھر تمہیں کیا؟

نجمہ۔ تم بھی اب نفرت کرنے لگو اس بے مروّت سے۔

رعنا۔ واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

نجمہ۔ اوہو، یہ دم خم ہیں، وہ توجہ کریں یا نہ کریں تم محبت کئے جاؤ گی؟

رعنا۔ آخر تم جلتی کیوں ہو؟ اگر محبت کرتی بھی ہوں تو ایک غیر آدمی سے کرتی ہوں کچھ تنویر سے تو نہیں کرتی؟

نجمہ۔ چھوڑو تنویر کا ذکر، اس غریب سے جب میں محبت نہیں کرتی تو اور کون کریگا؟

رعنا۔ بس ختم وہ داستانِ عشق و محبّت، وہ قصۂ ہجر و وصال، وہ افسانۂ دیدار و فراق؟

نجمہ۔ ختم کیوں؟ تنویر بے وقوف تو اب تک محبت کئے جا رہا ہے۔ وہ اگر دیوانہ ہے تو میں کیوں دیوانی ہو جاؤں؟

رعنا۔ (ایک ٹھنڈی سانس بھر کر) سچ کہتی ہو نجمہ، محبت واقعی ایک قسم کی دیوانگی ہے۔

نجمہ۔ آگئیں پھر اپنے رنگ پر، یا پھر دورہ پڑا؟

رعنا۔ نہیں، جب میں کسی کی محبت نہیں چھپا سکتی تو میری محبت بھی کوئی نہیں چھپا سکتا، سلیم اگر زبیدہ سے محبّت کرتا ہے تو کرے میں نہ اسے روک سکتی ہوں، نہ روکوں گی۔ لیکن اگر میں اس سے محبت کرتی ہوں تو مجھے کوئی کیسے روک سکتا ہے؟

نجمہ۔ بغیر مطالبہ کے محبت تو بڑی بے ضرر ہوتی ہے، اس سے کون منع کر سکتا ہے؟ خیر کوئی بات نہیں، خدا اس بے لوث محبت کا اجر ضرور دیگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالی جناب زبیدہ بیگم صاحبہ مدظلہا تو اسے منہ بھی نہیں لگاتیں، پھر یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی؟ عیادت کے لیتے دو قدم ہسپتال تک نہ جا سکیں۔

رعنا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ممکن ہے گئی ہوں؟

نجمہ۔ نہیں گئیں، میں نے نرس سے پوچھا تھا۔

رعنا۔ پھر کیا بتایا اس نے؟

نجمہ۔ یہ کہ عالم بیخودی جب طاری ہوتا ہے تو سلیم صاحب کی زبان پر زبیدہ کا وظیفہ ہوتا ہے اور زبیدہ آج تک وہاں جھانکی بھی نہیں۔

رعنا۔ سچی محبت بے اثر نہیں ہوتی۔ زبیدہ کو محبت کرنی پڑیگی سلیم سے۔

نجمہ۔ اگر یہ بات ہے تو سلیم کو بھی تم سے محبت کرنی پڑے گی۔

رعنا۔ نہیں نجمہ، زبیدہ کا حق مجھ پر فائق ہے۔

نجمہ کچھ کہنے والی تھی کہ دیکھا سکینہ بوا ہانپتی کانپتی تشریف لا رہی ہیں۔ نجمہ نے رعنا سے سرگوشی کے طور پر کہا۔ "خدا خیر کرے تشریف آوری بے مقصد نہیں ہے۔

اتنے میں سکینہ قریب آگئی۔ رعنا نے کہا۔

"آؤ بوا ـــــ کہاں بھول پڑیں"

سکینہ نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کو نظر انداز کر کے رعنا کی پائنتیوں

بیٹھتے ہوئے کہا
"بیٹی تم سے یہ امید نہ تھی، زبیدہ کا یہ حال اور تم نے بات بھی نہ پوچھی۔"
رعنا نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ "زبیدہ کو کیا ہوا بوا؟"
نجمہ بولی۔ "وہ تو یہاں سے اچھی بھلی گئی تھیں قاسم سیٹھ کے ساتھ۔"
سکینہ کے چہرہ پر نفرت و حقارت کی کیفیت طاری ہوگئی، اس نے کہا۔ "میرے سامنے نام نہ لو اس کمینے کا ــــ یہ ــــ اسی کا کیا دھرا ہے۔"
رعنا اور نجمہ حیرت سے سکینہ کی طرف دیکھنے لگیں، پھر سکینہ بوا نے ازاول تا آخر ساری داستان، اپنے گھر سے نکلنے اور زبیدہ کے بیہوش ہونے تک کی ایک ہی سانس میں سنا ڈالی۔
نجمہ غور سے یہ روداد سنتی رہی، پھر مسکراتی ہوئی بولی ــــ "اچھا یہ بات ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی، رعنا ہم غلط فہمی میں تھے، چلو ذرا مل آئیں زبیدہ سے چل کر۔ لیکن ڈاکٹر صاحب وہاں بھی تلوار لئے موجود ہوں گے، ملنے کی اجازت نہیں ہے؟"
سکینہ نے کہا، تمہارے لئے ممانعت تھوڑے ہے، زبیدہ کی زبان پر تو رعنا کے نام کی رٹ لگی ہے، بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "رعنا نہیں آئی؟ جب ہی تو آئی ہوں کہ اس بے مروت کو لے چلوں۔"
رعنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو میں چلتی ہوں۔"
نجمہ بولی۔ "رعنا میں بھی!"

(۵۹)

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے!

سلیم اب اچھا ہے لیکن ابھی تک ہسپتال میں ہے۔ کافی کمزور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ایک ہفتہ کے بعد ڈسچارج کر دیں گے۔ زبیدہ بھی اب اچھی ہے، اختلاج اور وحشت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ چہرہ کی رونق واپس آگئی ہے، رعنا اور نجمہ کے علاوہ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں، قاسم سیٹھ نے ہندوستان پر محمود غزنوی کی طرح سترہ حملے زبیدہ کے گھر پر کئے لیکن اس کے بند دروازے کو نہ کھول سکے، ہر مرتبہ مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا

آج زبیدہ کی طبیعت زیادہ بشاش تھی، رعنا اور نجمہ اس وقت بھی ہمزاد کی طرح موجود تھیں، رعنا نے کہا۔ "زبیدہ آج تمہیں چلنا پڑے گا ہسپتال، سلیم صاحب کو دیکھ آؤ چل کر!"

Karachi

نجمہ بولی، آخر شرماتی کیوں ہو؟ ان سے سامنا کرتے، محبت کر
تو نہ شرمائیں، آنکھیں چار کرتے شرم آتی ہے لڑکی کو، ذرا تو سوچا ہوتا۔

کیسا حال ہے اس کا ترے پیچھے
ایسی سنگدل محبوبہ خدا دشمن کو بھی نہ دے

زبیدہ ہنسنے لگی، "بس اسی لئے تو نہیں جاتی، وہاں بھی تمہاری شرارت جاری رہے گی۔"

نجمہ نے اطمینان دلایا، قسم سے تو ہم کچھ نہیں بولیں گے، لیکن ضرور، دیکھ آؤ چل کر اپنے بیمار کو!"

رعنا نے کہا۔ کل جب میں گئی تو بڑی دیر تک آس بھری نظروں سے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے رہے کہ شاید تم آتی ہو۔ میں نے پوچھا کہ کا انتظار ہے، ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے "کسی کا نہیں"۔

زبیدہ کی آنکھیں نم ہوگئیں، اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "میں سر جاتی ہوں، لیکن یہ نجمہ یہیں رہے گی۔"

نجمہ نے یہ شرط مان لی۔

"منظور!"

زبیدہ نے کپڑے بدلے اور ہسپتال چلی گئی، سیدھی سلیم کے کمرے میں پہنچی۔ وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سچ ہے ـــــ آس ایک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے۔ زبیدہ اب تک نہیں آئی تھی لیکن آس نہ ٹوٹی تھی، ہر روز، ہر گھڑی،